BIHAR URDU ACADEMY

اگست، ستمبر، اکتوبر ۲۰۲۵ء

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

عزیزؔ عظیم آبادی

عزیزؔ عظیم آبادی کا اصل نام عزیز الحق تھا اور عرفیت عام ''عجا صاحب'' لیکن شاعری کی دنیا میں وہ اپنے قلمی نام و تخلص ہی سے متعارف ہیں۔ رباعی گوئی میں انہیں خاص ملکہ حاصل تھا، اسی مناسبت سے وہ ''خیامؔ بہاری'' اور ''خیام اردو'' کہلاتے ہیں۔ عزیزؔ عظیم آبادی، حضرت شادؔ کے ہم عصر شاعر فضل حق آزادؔ عظیم آبادی کے سب سے چھوٹے فرزند تھے۔ ان کی ولادت ۱۹۰۱ء میں محلّہ پیر بہوڑ پٹنہ میں ہوئی، جہاں حضرت آزادؔ کی اپنی ذاتی کوٹھی تھی۔ شاہ بیگہ سے آبائی سکونت کا تعلق رکھنے والے عزیز الحق ابھی گویا رضاعت ہی کی عمر میں تھے کہ ۱۹۰۴ء میں اُن کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ ان کی تعلیم اپنے والد کی نگرانی میں ہوئی۔ وہ حافظ قرآن اور حاجی حرمین تھے۔ انہوں نے ''ماہ تمام'' کے نام سے اپنے والد کی سوانح لکھی تھی، مگر اس کی اشاعت کا علم نہیں۔ حضرت عزیزؔ کی رباعیاں نیازؔ فتح پوری کے رسالہ ''نگار'' میں اہتمام سے شائع ہوتی تھیں۔ ''سیل آتش'' کے نام سے سوا پانچ سو رباعیوں پر مشتمل حضرت عزیزؔ کا مجموعہ، بہار اردو اکادمی کے اہتمام سے نومبر ۱۹۷۹ء میں چھپ چکا ہے۔ عزیزؔ عظیم آبادی کی وفات جمعرات ۱۴ ستمبر ۱۹۶۳ء کو صبح آٹھ بجے جہاں آباد میں ہوئی اور امتھوا میں سپرد خاک ہوئے۔ ''مرگ غمناک بود'' ان کی وفات کا مادہ تاریخ ہے جس سے ہجری سال ۱۳۸۳ برآمد ہوتا ہے۔

(تصویر ماہنامہ ''اشارہ'' پٹنہ، اگست ۱۹۶۲ء کے سرورق سے ماخوذ)

رباعیات عزیزؔ

آئینۂ دل میں وہ صفائی نہ رہی — وہ خوف خدا ، وہ پارسائی نہ رہی
سب وقت کی مصلحت کے بندے ہیں عزیزؔ — دنیا میں برائی کچھ برائی نہ رہی

☆☆☆

گلشن میں کلی کلی چٹک اُٹھتی ہے — بلبل مرے نغموں سے چہک اُٹھتی ہے
اللہ رے گرمیٔ سخن کی تاثیر — رہ رہ کے شمع بھی لہک اُٹھتی ہے

☆☆☆

اذہان میں آگئی ہے پستی کیسی — سنسان ہے علم و فن کی بستی کیسی
شہرت کا پرستار زمانہ ہے عزیزؔ — اس دور میں اب سخن پرستی کیسی

☆☆☆

ہے نقش بر آب زندگانی اے دوست — تاچند رباب خوش بیانی اے دوست
ہم سے سن لو افسانۂ جام و سبو — پھر کون کہے گا یہ کہانی اے دوست

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

مدیر
ابرار احمد خان
سکریٹری، بہار اردو اکادمی

معاون مدیر
انوار محمد عظیم آبادی

جلد : ۴۶ شمارہ : ۸،۹،۱۰
اگست، ستمبر، اکتوبر ۲۰۲۵ء

زرتعاون : پندرہ روپے
سالانہ : ایک سو پچاس روپے

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ : سکریٹری بہار اردو اکادمی، اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ۸۰۰۰۰۴ (بہار)

فیکس/فون: 0612-2678021 - 2301476
email : zabanoadabbua@gmail.com
buapat2014@gmail.com

کمپوزنگ : پروین اشرفی
تزئین : زیبا پروین

ترتیب

اداریہ	حرف آغاز	ابراراحمدخان	۳
شہرنامہ	شہرنامہ بہار	ڈاکٹر سید احمد قادری	۴
مقالات	پروفیسر اشرف جہاں کے عنوانیہ افسانے	ڈاکٹر محمد ارمان	۱۴
	شادؔ کی سوانح نگاری	ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی	۲۵
	حاذقِ فن حاذقؔ انصاری	عبدالرزاق رضوی	۳۳
	ابراہیم جلیس اور ان کے بھائی	ڈاکٹر محمد ثاقب انور	۳۹
	منٹو: ایک حقائق نویس فنکار	نزہت پروین نزہتؔ	۴۲
	چہرہ بہ چہرہ روبہ رو: ایک تجزیاتی مطالعہ	محمد اعظم	۴۶
	اردو کی تعمیر وترقی میں متھلا کا کردار	محمد معروف عالم	۴۹
شخصیات	سر سید احمد خاں: کٹھرے میں......؟	مشتاق احمد نوری	۵۴
	فراقؔ: انسانیت کے اعلیٰ مدارج پر فائز	حکیم رشاد الاسلام	۵۶
	آل احمد سرور کی شخصیت کے امتیازات	ڈاکٹر محمد محمود عالم	۶۰
	اودادیوی: ایک جانباز خاتون	محمد شوکت جمال / ڈاکٹر شوبھا مشرا	۶۳
افسانے	ایثار محبت	فخرالدین عارفی	۶۵
	پٹاری کا سانپ	محمد طارق	۷۱
	غم کے سائے میں خوشی	امتیاز غدر	۷۴
گاہے گاہے......	اسلوب	ریاض احمد	۷۸
	انکاریہ جملے میں امدادی فعل	ڈاکٹ سلام سندیلوی	۸۴

منظومات ۸۵ — ۹۷

کتابوں کی دنیا	نیرنگ تمنا	رضی احمد فیضی	مبصر: ڈاکٹر ارشاد احمد	۹۸
	آبنائے خیال	اکرام آزر	مبصر: اشفاق عادل	۹۹
	زندگی میں پہلی بار	نیاز احمد آسیؔ	مبصر: ڈاکٹر ریحان احمد قادری	۱۰۱
وفیات	آہ! شکیلؔ سہسرامی		ادارہ	۱۰۳
سلام و پیام	ڈاکٹر طاہرالدین، سیدہ حشمت آرا، سلمان شاہد، تحریم فاطمہ، محسن عاشق حسرت، ڈاکٹر ارشاد احمد			۱۰۸

بچوں کا زبان وادب

۱۱۳ — ۱۲۰

''زبان وادب'' میں شائع ہونے والی تحریروں میں ظاہر کی گئی مصنفین کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

اداریہ

حرف آغاز

سپاسِ فراواوں مالک افلاک وارضین کا ——— ''زبان وادب'' کی تازہ اشاعت، آپ کے ہمدست ہورہی ہے اور بلاتمہید بصد اعتذار یہ لکھنا ہمارا اخلاقی فرض ہے کہ بعض تکنیکی وجوہ اور اشاعتی تعویق سے تھوڑی سی رستگاری کی خاطر، آپ کے الطاف کریمانہ پر اعتماد رکھتے ہوئے اِسے مشترکہ شمارہ بنانا پڑا ہے۔ اس شمارے کی ابتدا ''شہرنامہ بہار'' سے ہورہی ہے جس میں حسب موضوع بیشتر اہم اور ضروری پہلو علمی وسنجیدہ انداز سے سمیٹے گئے ہیں۔ پس ازاں ''مقالات'' کا سلسلہ ''پروفیسر اشرف جہاں کے عنوانیہ افسانے'' سے قائم ہوا ہے جس میں اُن کی کچھ یادیں بھی ہیں، ان کی شخصیت کا تذکرہ بھی اور راست مطالعہ کے ساتھ ان کی تینوں ٹائٹل کہانیوں کا تدریسی وعملی تنقید کے انداز میں تفصیلی تجزیہ بھی، جو ان کے فکر وفن کی متنوع جہتیں مبرہن کردیتا ہے۔ بعدازیں مناسب تمہید اور ضروری حوالہ جات واقتباسات کے ساتھ کہیں ''شاؔد کی سوانح نگاری'' کے تعلق سے مطالعہ کا منطقی نتیجہ سامنے لایا گیا ہے، کہیں سوانحی اشارات اور برجستہ اقتباسات کے ساتھ حاذؔق انصاری کی شاعری کے متنوع خصائص بیان ہوئے ہیں اور کہیں ضمنی طور پر کئی نکات سمیٹتے ہوئے ابراہیم جلیس اور ان کے دو بھائیوں کا ذکر آیا ہے تو کہیں مختصر احوال زندگانی اور اقوال واقتباسات شامل کرتے ہوئے منٹو کو ایک حقائق نویس فنکار کے روپ میں دکھایا گیا ہے، کہیں جمیلہ ہاشمی کے تاریخی ناولٹ ''چہرہ بہ چہرہ'' کا جامع وبرجستہ تجزیاتی مطالعہ قلم بند ہوا ہے اور کہیں علاقائی ادب کے مطالعہ کی صورت میں قدما اور معاصر قلم کاروں کو یاد کرتے ہوئے ''اردو کی تعمیر وترقی میں متھلا کا کردار'' آئینہ کیا گیا ہے۔

بعدازیں ''شخصیات'' کے تحت جہاں ''سرسید احمد خاں: کٹہرے میں.....؟'' جیسے سوال کا علمی ومعروضی انداز سے معقول ومسکت جواب مہیا کرنے کی سعی ہوئی ہے اور خدمتگاروں کے راست بیانات اور اہل علم ودانش کے مصاحبہ ومکتوب سے غذا لیتے ہوئے فراؔق کو انسانیت اور سخنوری کے اعلیٰ مدارج پر فائز دکھایا گیا اور کئی پہلوؤں سے ''آل احمد سرور کی شخصیت کے امتیازات'' پر نظر ڈالی گئی ہے، وہیں مترجمہ مضمون ''اودادیوی: ایک جانباز خاتون'' میں وطن کے لئے قربانی دینے والے اس نسوانی تاریخی کردار کو یاد کیا گیا ہے۔

اس شمارے میں ''افسانے'' کے تحت رومانی کہانی ''ایثار محبت'' اگر جذبات کی عکاسی اور چونکا دینے والے کلائمکس کے ساتھ بری سوچ، طمع پسندی اور دُکھی دل کی آہ کے خاموش، مگر لرزہ خیز اثرات دکھا جاتی ہے تو دلچسپ منظر کشی اور عبرت خیز اختتام کے ساتھ ''پٹاری کا سانپ'' بھی یہ بتانے سے قاصر نہیں کہ دھوکہ دہی کی کمائی کہاں پہنچاتی ہے اور ایسی ذہنیت سے بنا سوچ کا قلعہ کیسے منٹوں میں سمار ہوجاتا ہے اور پھر نفسیاتی کہانی ''غم کے سائے میں خوشی'' بھی یہ بتاجاتی ہے کہ خودغرضی کی سوچ، دوست کی موت کا غم، کس طرح داماد کو نوکری ملنے کے امکان سے خوشی میں بدل دیتی ہے۔

ہمیں پوری امید ہے کہ مذکورہ مشمولات کے دوش بدوش ''گاہے گاہے باز خواں'' کا حصہ ''منظومات'' کے اوراق اور تبصرے کے صفحات بھی متوجہ کریں گے اور ''بچوں کا زبان وادب'' بھی اپنے مشمولات سے ان کی مسرت وبصیرت کے گلشن میں تازہ بہاریں لائے گا۔ زیادہ خدا حافظ، خدا ناصر

ابرار احمد خان

(ابرار احمد خان)

شہرنامہ

ڈاکٹر سید احمد قادری
7-New Karmganj, Gaya - 823001

شہرنامہ بہار

بہار کی زمانہ قدیم سے دور جدید تک ہمیشہ سیاسی، سماجی، علمی، ادبی، لسانی، معاشرتی، تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی تاریخ رہی ہے اور ہر دور میں اس کی اہمیت تسلیم کی گئی ہے۔ بہار کو مہاتما بدھ، مہابیر (جین) اور گرو گوبند سنگھ کا بھی صوبہ کہا جاتا ہے، اس لئے کہ یہ ان مذہبی شخصیات میں سے پہلے کی کرم بھومی ہے، تو باقی دونوں کی جنم بھومی ہے۔ منیر شریف، پٹنہ میں آرام فرما، حضرت یحییٰ منیری اور راج گیر، نالندہ کے صوفی حضرت مخدوم نے بھی بہار کو اپنے علوم و فیوض سے منور کیا ہے۔ تاریخی شہر گیا کے بھگوان وشنو پد کی کشش ہندو مذہب کے ماننے والوں کو کھینچتی ہے اور موکچھ کی پراپتی کے لئے ہر سال لاکھوں کی تعداد میں پتری کچھ کے موقع پر دنیا کے مختلف ممالک سے ہندو مذہب کے ماننے والے بطور خاص یہاں آتے ہیں۔ نالندہ، جس طرح پوری دنیا میں علم و عرفان کا مرکز رہا ہے، یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لحاظ سے بہار علم و ادب کے ساتھ ساتھ بودھ، جین، سکھ، مسلم اور ہندو مذاہب کے ماننے والوں کے لئے بے حد اہم اور مقدس مانا جاتا ہے۔

ریاست بہار میں اس وقت ۹ کمشنری، پٹنہ، مگدھ (گیا) سارن (چھپرہ)، ترہت (مظفر پور)، پورنیہ، بھاگلپور، دربھنگہ، کوسی (سہرسہ) مونگیر ہیں اور ان کمشنریوں میں ۳۸ اضلاع ہیں۔ جن کے نام ارریہ، ارول، اورنگ آباد، بانکا، بکسر، بھوجپور (آرہ) بیگوسرائے، جموئی، جہان آباد، دربھنگہ، روہتاس (سہسرام) سارن، سمستی پور، سپول، سہرسہ، سیوان، شیخ پورہ، شیوہر، سیتامڑھی، نالندہ (بہار شریف) کشن گنج، لکھی سرائے، مدھوبنی، مدھے پورہ، مشرقی چمپارن، مظفر پور، مونگیر، نوادہ، ویشالی (حاجی پور) پورنیہ، پٹنہ، کٹیہار، کھگڑیا، کیمور (بھبوا) گوپال گنج اور گیا ہیں۔ ان اضلاع میں ۱۰۱ سب ڈویژن اور ۵۳۴ بلاک ہیں۔

مندرجہ بالا اضلاع کے بیشتر شہر، گاؤں اور قصبہ کی شاندار اور سنہری تاریخ ہے۔ ماضی سے حال تک زعماو اکابرین نیز سیاسین کی خدمات سے ریاست بہار کے یہ تمام شہر گاؤں اور قصبے روشن ہیں۔ خاص بات یہ بھی ہے کہ ان اضلاع کے ماتحت کئی ایسے سب ڈویژن اور بلاک ہیں، جن کی علمی، ادبی، سماجی، معاشرتی، تعلیمی، تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی اہمیت آج بھی برقرار ہے اور ان پر بہار کے لوگ بجا طور پر فخر کرتے ہیں۔

تعلیم کے فروغ کے لئے بتدریج ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے کئی علاقے علم و عرفان کے اہم گہوارے بن گئے۔ بہار شریف، منیر شریف، راجگیر، حاجی پور، مونگیر اور پھلواری شریف وغیرہ ایک زمانے میں عالمی شہرت کے حامل رہے ہیں۔ خاص طور پر حضرت شرف الدین یحییٰ منیری، حضرت احمد چرم پوش، قاضی عبد الشکور، میر عطا اللہ زیبی اور شیخ عبد الغنی وغیرہ کی تعلیمات کا ملک و بیرون ملک میں کافی چرچا رہا، جن سے متاثر ہو کر دور دراز علاقوں سے طلبا حصول تعلیم

کے لئے بہار کے مختلف مدارس میں آنے لگے۔

مغلیہ دور حکومت میں بہار کے مسلمانوں کی تعلیمی، سماجی، ثقافتی اور معاشرتی حالات میں بتدریج ترقی ہوئی اور شیر شاہ سوری کے دور حکومت میں سہسرام اور شیر گھاٹی وغیرہ کے تعلیمی مراکز کو مولانا شمس الحق عرف ملاحقانی، ملاعبدالرحیم سوری وغیرہ جیسے عالموں کی وجہ کر کافی شہرت حاصل ہوئی۔ اس دور میں بھاگلپور کا ملا چک مدرسہ، شاہ کبیر گنج کی خانقاہ، پٹنہ سیٹی کا مدرسہ، سیف مدرسہ دانا پور نے بھی درس وتدریس کے سلسلے میں اپنی نمایاں پہچان بنائی ہے۔ جن سے متاثر ہو کر مشہور مصنف ابوالفضل نے اپنی تصنیف ''آئین اکبری'' میں ان مدارس اور یہاں کی تعلیمات کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان مدارس میں ریاضی، اخلاقیات، زراعت، ادویات، منطق وفلسفہ، معاشیات، قواعد اور فن انتظام، علم طبعی وتاریخ وغیرہ کی تعلیمات نیز طریقہ تعلیم کی بھی تعریف کی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ ان مدارس کی تعلیمات سے بہت سارے غیر مسلموں نے بھی فیض اٹھایا اور بعد میں عربی وفارسی کے مشہور عالم ہوئے۔ راجہ کرتت چند، راجہ رام نرائن موزوں، بال مکند شہود، مہاراجہ کلیان سنگھ، لالہ سبھا رام دانش، لکشمی نرائن، لالہ اجاگر چند الفت وغیرہ اس دور کے بڑے عالم گزرے ہیں، جن سے فیض اٹھانے والوں کی بڑی تعداد بہار اور بیرون بہار میں ملتی ہے۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو بہار کا وہ دور سنہری دور میں شمار کئے جانے کے لائق ہے۔ ایک زمانہ تھا جب تعلیمی، سماجی، ثقافتی، معاشی میدان میں ان شخصیتوں کی طوطی بولتی تھی۔ بہار کے تقریباً ہر شہر، ہر گاؤں میں بڑے اچھے اور معیاری مدارس قائم تھے، جہاں لوگ نسل در نسل تعلیم وتربیت حاصل کیا کرتے تھے، جن کے باعث بہار کے باہر بھی بہار کے وقار اور عظمت میں اضافہ ہوا۔ ان سے متاثر ہو کر خاندان تیموریہ اورنگ زیب، اورنگ زیب کی بیٹی زیب النسا اور شہزادہ معظم وغیرہ کی تعلیم وتربیت کے لئے بہار کے عالموں کو اتالیق مقرر کیا گیا تھا۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں بہار کے تعلیمی معیار اور وقار کا اندازہ ''صبح صادق'' کے اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر سید محمود نے اپنے مذکورہ مضمون میں لکھا ہے:

> '' انگریز طلبا جن مضامین کی تعلیم لاطینی اور یونانی زبان کے ذریعے انگلینڈ کے کالجوں میں حاصل کرتے تھے، وہی تعلیم عربی وفارسی کے ذریعہ اس عہد میں یہاں (بہار) کے طلبا بھی حاصل کرتے تھے۔''

اسی طرح ایک اطلاع یہ بھی ہے کہ راجہ رام موہن رائے جیسی عظیم شخصیت کو جب عربی اور قران پڑھنے کا شوق ہوا، تو انھیں بھی عظیم آباد کے اساتذہ کرام کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنا پڑا تھا۔ بہار کے سلسلے میں ایسی اہم اطلاعات بھری پڑی ہیں۔ بہار کا شاید ہی کوئی ایسا شہر اور قصبہ ہو، جس کی علمی، ادبی، ثقافتی، معاشرتی اور سیاسی وسماجی تاریخ نہ ہو۔ اس ضمن میں چند مزید شہروں کا ذکر ضروری ہے، جن سے شہر نامہ بہار کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

بہار میں آرہ شہر کی ایک شاندار تاریخ رہی ہے۔ آرہ کو یوں بھی کئی لحاظ سے تاریخ میں مرکزیت حاصل ہے۔ بابو کنور سنگھ نے اس شہر میں جو نقوش چھوڑے ہیں۔ وہ آج بھی یہاں کے تاریخی پس منظر کو بیان کرتے ہیں۔ شہر آرہ مذہبی نقطۂ نظر سے بھی ہمہ جہتی کا مظہر رہا ہے۔ یہاں مدارس شریعت وفقہ اسلام کی تبلیغ وتدریس کا ایک زمانے میں مرکز رہے ہیں، تو جین مذہب کے سنتوں نے یہاں اتنے عظیم الشان منادر

قائم کئے کہ یہ شہر مندروں کا شہر کہا جاتا ہے اور جین مذہب کی ایک اہم زیارت گاہ ہے۔ سویتامبر اور پتامبر جینی حضرات سال میں کئی بار مذہبی جلوس بڑی شان وشوکت سے نکالتے ہیں۔ ان کے مندروں میں صنم سازی اور بت تراشی کے ایسے نمونے موجود ہیں، جنھیں دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ یہ شہر چونکہ ہندو مذہب کے رشیوں ومنیوں کی جگہ رہی ہے، لہٰذا ان کی رام لیلائیں، کرشن لیلائیں اور دسہرے کے تہوار بھی قابل دید ہوتے ہیں۔

بہار کے سیمانچل میں ایک شہر پورنیہ ہے، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ عہد قدیم سے ہی یہ پورا علاقہ اپنی زرّیں تاریخ اور علمی واعلیٰ ثقافتی سرگرمیوں کے لئے مشہور رہا ہے۔ اسور گڑھ، بڑی جان گڑھ، بینو گڑھ، ننھا کا گڑھ، دھرہرا، ٹھاکر گنج، کسم گڑھ، ستیلی گڑھ اور کرن دیکھی جیسے تاریخی مقامات کی باقیات کو دیکھنے سے پورنیہ کی تاریخی اور تہذیبی خصوصیات کی تصدیق ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ مہابھارت، منواسمرتی، چینی سیاح یوآن چوانگ کا سفر نامہ اور عہد وسطیٰ کی مشہور فارسی تواریخ، ''طبقات ناصری''، ''تاریخ شاہی''، ''تاریخ فرشتہ''، ''آئین اکبری''، ''مآثر جہانگیر''، سلیم اللہ کی ''تاریخ بنگالہ'' اور یوسف علی کے احوال نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔ مشہور ماہرین لسانیات گریرسن اور جان ہنٹرے نے اس علاقے کی زبان اور یہاں کی آبادی کا بطور خاص تذکرہ کیا ہے۔

بہار کے دسنہ کی علمی حیثیت اپنی جگہ، لیکن جو چیز اس جگہ کو اہم بناتی ہے۔ وہ اس گاؤں کی لائبریری ہے۔ یہ لائبریری اتنی اہم اور مشہور ہوگئی تھی کہ مہاتما گاندھی بھی اسے دیکھنے یہاں تشریف لائے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین جب بہار کے گورنر ہوئے اور ان تک بھی اس لائبریری کی شہرت پہنچی تو وہ بھی خود کو وہاں جانے سے نہیں روک سکے اور ان ہی کی ایما پر اس لائبریری کی بہت ساری اہم کتابوں کو خدا بخش لائبریری منتقل کرایا گیا تھا، جہاں دسنہ سیکشن بنا کر انہیں محفوظ کیا گیا ہے۔ اس سیکشن میں آج بھی دسنہ سے لائی گئی کتابوں میں بہت سارے اہم قلمی نسخے اور بیش قیمت کتابیں موجود ہیں۔ ایسا ہی ایک قصبہ سارن ضلع میں کھجوا کے نام سے مشہور ہے۔ مشہور مؤرخ پروفیسر (پدم شری) حسن عسکری کی پیدائش اسی گاؤں میں ہوئی تھی۔ عقل دنگ رہ جاتی ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں یہاں چھاپہ خانے بھی قائم تھے، جہاں سے تین اخبار اور رسائل شائع ہوا کرتے تھے۔ یہی نہیں یہاں ٹینس کورٹ بھی تھا، لائبریری بھی قائم تھی۔ اس طرح کی علمی وادبی اور سیاسی وثقافتی تاریخ سے بہار کے شہر اور گاؤں بھرے پڑے ہیں۔ اگر میں چند جملوں ہی میں ان سارے شہر اور گاؤں کا تذکرہ کروں تو بہت ممکن ہے یہ مقالہ پوری کتاب میں تبدیل ہوجائے۔

بہر حال اس مختصر تمہید کے بعد اب بہار کے جغرافیائی حدود کے ساتھ ساتھ یہاں کی سیاسی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی، اقتصادی اور معاشرتی حالات جاننے کے لئے ہم تاریخ کے اوراق کو پلٹیں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ بہار کی اہمیت ہر زمانے اور عہد میں رہی ہے۔ خاص طور پر جس طرح مختلف مذاہب کے پیامبروں نے اس صوبہ کو اپنے علوم وفیوض سے منور کیا، اس کے اثرات یہاں کی مذہبی، سماجی، ثقافتی اور سیاسی حالات پر مرتسم ہوئے۔ مشہور عرب مورخ ابن فضل اللہ عمری نے محمد بن تغلق (۱۳۲۵ء-۱۳۵۱ء) کے عہد کی مرتب کردہ تاریخ میں، سلطنت کے مختلف صوبوں کی تفصیلات میں بہار کو ایک باضابطہ صوبہ قرار دیا تھا، لیکن وقت اور حالات کے تقاضوں، ضرورتوں اور اپنی بعض سہولیات کے لئے ملک کے مختلف حکمرانوں نے اس صوبہ کو اپنے انتظامی امور کے تحت اپنے اپنے طور پر

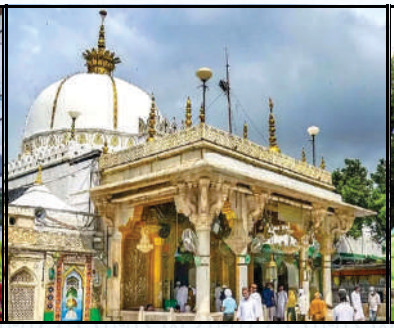

کبھی اس کے کچھ حصوں کو منقسم کیا، تو کسی دوسرے حکمراں نے دوسرے صوبوں کے بعض علاقوں کو یہاں جوڑنے کا بھی کام سرانجام دیا۔

بہار کی تاریخ، بہت ہی دلچسپ اور حیرت انگیز تاریخ چندر گپت موریہ اور اس کے خاص مشیر (دوست) چانکیہ کے دور میں ملتی ہے۔ چانکیہ کا اصل نام وشنو گپت تھا، جس کے علم ودانش، دوراندیشی اور ذہانت کے قصے آج بھی مشہور ہیں اور جن کی مثالیں اکثر وبیشتر پیش کی جاتی ہیں۔ تاریخ ہند میں اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ مگدھ زمانہ قدیم سے ہی ایک اہم اور تاریخی صوبہ رہا ہے، جس کی راجدھانی پاٹلی پتر تھی۔ جہاں پر سکندر کے حملہ کے وقت نند راجا کی حکومت قائم تھی۔ سکندر کی موت کے پانچ سال بعد ۳۲۱ قبل مسیح یعنی تقریباً ۲۲ سو سال قبل چندر گپت موریہ، مگدھ پر اپنے مشیر خاص چانکیہ کی دوراندیشی اور رہنمائی میں قابض ہوتا ہے، جس کی تاریخ بہت طویل ہے۔ اس دور کے سیاسی، سماجی، اقتصادی، معاشرتی، مذہبی، لسانی حالات کوٹلیہ کی بہت ہی مشہور کتاب ''ارتھ شاستر'' میں بڑے ہی دلچسپ انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مصنف کوٹلیہ کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ یہ دراصل چانکیہ کا ہی دوسرا اور قلمی نام ہے۔

''ارتھ شاستر'' میں جس طرح کی قدیم روایات، رسومات، رواداری، سماجی رسم ورواج، قانون، عدلیہ، خواتین کے حقوق، کمزور، معذور اور ضعیف لوگوں کے تئیں فرائض، صنعت وحرفت، محصول وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے مطالعہ سے ایسا لگتا ہے کہ اس کتاب میں دور جدید کے حالات کو قلمبند کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں بادشاہی کے اختیارات، تاج پوشی کے وقت وہاں کی رعایا جس انداز میں راجہ کو سپرد کیا کرتی تھی اور راجہ اپنی رعایا کے سامنے یہ عہد کرتا تھا کہ:

''اگر میں تمہیں ستاؤں تو بھگوان مجھے سورگ سے، زندگی سے اور آل واولاد سے محروم کردے۔''

سبھی کچھ تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ مذکورہ کتاب میں اس بات کا بھی تذکرہ ہے کہ قدیم بھارت میں حکمرانی کا مطلب عوام کی خدمت گزاری تھی۔ رعایا کے مفادات کو ترجیح دیا جاتا تھا۔ اس دور کی یہ بھی خاص بات تھی کہ کوئی بادشاہ اگر ظلم کا مرتکب ہوتا تھا تو رعایا کو یہ اختیار تھا کہ اسے بادشاہت سے محروم کرکے کسی دوسرے کو بادشاہت سونپ دے۔

کوٹلیہ کی کتاب ''ارتھ شاستر'' میں شہر پاٹلی پتر (موجودہ نام پٹنہ) کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ گنگا ندی کے کنارے نو میل تک پھیلا ہوا شہر تھا اور انتظامی امور مختلف ناموں سے بٹا ہوا تھا۔ صفائی ستھرائی کے لئے اس وقت یہ عالم تھا کہ اگر کوئی شخص سڑک پر کیچڑ یا پانی جمع ہونے دیتا اور اس سے عوام کو پریشانی ہوتی تو ایسے شخص پر جرمانہ عائد کیا جاتا تھا۔ ''ارتھ شاستر'' کا مطالعہ، دور حاضر کے لئے واقعی مثالی ہے اور یہ حیرت واستعجاب سے بھری کتاب اس لئے بھی ہے کہ وہ سارے تصورات اور انتظامی امور جو پاٹلی پتر کے لئے عہد قدیم میں رائج تھے، آج بھی تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ قائم ہیں۔ ان امور کا ذکر پنڈت نہرو کی ایک کتاب ''یادگار شخصیتیں'' میں بھی موجود ہے، جس کا اردو ترجمہ رفیق محمد شاستری نے کیا ہے، اس میں ''چندر گپت موریہ اور چانکیہ'' کے متعلق ایک جگہ پنڈت نہرو نے لکھا ہے کہ:

''پاٹلی پتر میں شہری انتظام کے لئے ایک میونسپل کونسل تھی۔ تمام شہری اس کونسل کے ممبروں کا انتخاب کرتے تھے۔ اس میں ۳۰ اراکین ہوتے تھے۔ ان میں سے پانچ پانچ ارکان پر مشتمل چھ کمیٹیاں تشکیل دی جاتی تھیں۔

شہری صنعت کی حوصلہ افزائی اور دیکھ ریکھ، مسافروں اور تیرتھ یاتریوں کے آرام اور حفاظت کے انتظامات، پیدائش اور موت کے اندراجات اور دوسری چیزوں کا انتظام انھیں کمیٹیوں کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ پوری کونسل صفائی، ستھرائی، آمد وخرچ، پانی کا انتظام، باغ، باغیچے، پبلک اور عمارتوں کی دیکھ ریکھ کا انتظام کرتی تھی۔ انصاف کرنے کے لئے پنچایتیں اور اپیل سننے کے لئے عدالتیں قائم تھیں۔ قحط زدوں کی مدد کا خاص انتظام ہوتا تھا۔ سرکاری گودام کا آدھا غلہ قحط زدوں کی ضرورتوں کے لئے ہمیشہ محفوظ رکھا جاتا تھا۔'' (یادگار شخصیتیں، ص۲۲)

پاٹلی پتر پر چندر گپت کی تقریباً چوبیس سال تک حکومت قائم رہی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا بندوسار تخت نشیں ہوا اور اس نے اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کم وبیش پچیس برس تک بہت ہی پرامن طور پر حکومت کی۔ اس کے بعد اس کا فرزند ''اشوک'' پاٹلی پتر کا بادشاہ بنا اور اس نے اپنی بہادری، شجاعت، ذہانت، جرأت اور حوصلہ مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہر جنگ جیتی۔ یہاں تک کہ اس کی حکومت، شمال اور وسط بھارت سے لے کر وسط ایشیا تک پھیل گئی تھی۔ باقی ماندہ مشرق اور جنوبی علاقوں کو بھی اپنے زیر حکومت قائم کرنے کی خاطر اس نے اپنی تخت نشینی کے آٹھ سال بعد کالنگ پر حملہ کیا تھا، جس میں اشوک کو فتح ملی ضرور، لیکن اس کے لئے اسے بہت بھاری قیمت چکانی پڑی اور ایک کتبہ کے مطابق ڈیڑھ لاکھ لوگ وہاں سے قید کئے گئے اور ایک لاکھ سے زائد افراد اس جنگ کے دوران مارے گئے۔ اتنی بڑی تعداد میں لوگ مارے گئے تھے کہ میدان جنگ، انسانی لہو سے لالہ زار ہو گیا تھا۔ اس خونین اور لہولہان منظر کو دیکھ کر اشوک کو جنگ سے شدید نفرت ہو گئی اور اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب وہ انسانی لہو بہانے کے لئے جنگ نہیں کرے گا اور آخر دم تک وہ اپنے اس فیصلہ پر قائم رہا۔

مشہور مورخ ایچ جی ویلس نے اس سلسلے میں اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ تاریخ میں اشوک ہی ایک ایسا فوجی اور جنگجو راجہ گزرا ہے، جس نے فتح کے بعد جنگ سے توبہ کر لیا تھا۔ اشوک نے اپنے دور شہنشاہی میں ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دئے کہ اسے لوگ آج تک ''دی گریٹ اشوک'' کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اس کی لاٹ کو اس ملک کے سرکاری نشان کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کالنگ کی جنگ کے دوران جس طرح انسانی جانوں کی قربانیاں دی گئیں، یہ سب دیکھ کر اشوک کے اندر کی انسانیت کراہ اٹھی، اور اس نے نہ صرف یہ کہ امن وشانتی کا مذہب بودھ دھرم قبول کیا، بلکہ امن وامان کی ترویج کے لئے بودھ مذہب کی تبلیغ میں بہت نمایاں کردار بھی ادا کیا۔ اشوک نے بودھ مذہب کو دنیا کے مختلف خطوں میں پھیلانے کے لئے، اپنے سگے بھائی مہندر اور بہن سنگھ مترا کو، بودھ گیا (بہار) میں مہاتما بدھ کو جس پیڑ کے نیچے گیان (Enlightment) حاصل ہوا تھا، اس بودھی پیپل کے پیڑ کی ایک قلم لے کر (سری) لنکا بھیجا تھا۔ بھارت میں بودھ مذہب کے فروغ کے ساتھ ساتھ اس کے مذہبی اقدار نے انسانی فلاح و بہبود کے لئے ایسے یادگار کام کئے، جو انمٹ نقوش چھوڑ گئے۔ مثال کے طور پر ملک کے مختلف گوشوں میں رفاہ عام کے لئے باغات، اسپتال، کنواں اور سڑکوں کی تعمیر کرایا۔ عورتوں کی تعلیم کے لئے خاص انتظامات کئے۔ اس وقت اشوک نے کس قدر تعلیم کا شاندار انتظام کیا تھا، اس کے بارے میں پنڈت جواہر لعل نہرو اپنی

مذکورہ کتاب میں اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اس وقت چار بڑی بڑی یونیورسٹیاں قائم تھیں۔ایک شمال میں پشاور کے پاس تکشیلا میں، دوسری متھرا میں، تیسری وسط ہندوستان اجین میں اور چوتھی پٹنہ کے پاس نالندہ میں۔ان یونیورسٹیوں میں ہندوستان کے ہی نہیں بلکہ چین سے لے کر مشرقی ایشیا تک دور دراز کے ملکوں سے طالب علم پڑھنے آتے تھے۔سارے ملک میں بڑی بڑی خانقاہیں بن گئی تھیں، جو 'وہار' کہلاتی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ پاٹلی پتر یا پٹنہ کے آس پاس اتنے زیادہ 'وہار' تھے کہ سارا صوبہ ہی 'وہار' یا آج کل کی زبان میں بہار کہا جانے لگا۔'' (یادگار شخصیتیں، ایضاً، ص ۲۷)

دی گریٹ اشوک نے تقریباً 38 برس تک حکومت کی جسے یقینی طور پر سنہری دورِ حکومت کا نام دیا جا سکتا ہے۔اپنی موت سے قبل اشوک، بادشاہت سے دست بردار ہو کر بودھ بھکشو بن گیا تھا۔اشوک کی موت کے چھ سو سال بعد چینی سیاح جب پاٹلی پتر آیا تھا، اس وقت تک اگرچہ اس شہر میں اشوک کے تعمیر کردہ بہت سارے نقوش مٹ چکے تھے، پھر بھی ان کھنڈرات کو دیکھنے کے بعد اپنے سفر نامہ میں اس نے حیرت و استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

''یہ راج محل انسانوں کا بنایا ہوا معلوم ہی نہیں ہوتا ہے۔''

صوبہ بہار کے ان ابتدائی حالات کے بعد بہار کی سرزمین پر شیر شاہ کی بادشاہت نے بہار کو ایسی پہچان دی، جس کے نقوش صرف باقی ہی نہیں، بلکہ آج بھی عوام ان سے فیضیاب ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ افسوس اس بات کا ضرور ہے کہ آج اس کی قدر دانی نہیں ہے، جب کہ شیر شاہ نے بہار کو بھارت کے نقشہ پر ایک بہت ہی اہم مقام دیا ہے، جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔اس بادشاہ نے اپنی تقریباً پانچ سال کی بے حد مختصر حکمرانی میں جس طرح لمبی سڑک ''گرینڈ ٹرنک روڈ'' کی تعمیر کرائی اور جس طرح جگہ جگہ سرائے، سڑک کنارے درخت، محصولات اور ڈاک وغیرہ کے نظام قائم کئے گئے، وہ سب کے سب کے تاریخی نوعیت کے تھے، جو آج بھی کسی حد تک بدلی ہوئی شکل میں قائم ہیں۔

مورخوں نے بھی شیر شاہ کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ رہی کہ شیر شاہ کی اچانک حادثاتی موت کے دس سال کے اندر ہی اس سوری خاندان سے عنان حکومت چھن گئی اور جب مغل اس ملک پر برسر اقتدار ہوئے تو مغل بادشاہوں نے شیر شاہ اور اس کے کارناموں کو پوری طرح دانستہ طور پر فراموش اور نظر انداز کیا۔مورخوں کو بھی اس جانب راغب نہیں کیا، کالکا رنجن قانون گو نے ۱۹۲۱ء میں شیر شاہ پر ایک کتاب اگرچہ بہت ہی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ ضرور لکھی، لیکن اس میں بھی بہت ساری باتیں ایسی ہیں، جو متنازعہ ہیں، پھر بھی شیر شاہ کے متعلق کچھ حقائق ایسے اہم ہیں جنھیں میں بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔شیر شاہ کی حکمرانی کے دوران صوبہ بہار میں بہت ساری مثبت تبدیلیاں سامنے آئیں، جن کا تذکرہ تاریخ شیر شاہ ''Sher Shah and his times'' مصنفہ کالکا رنجن قانون گو میں بہت تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

شیر شاہ کا اصل نام فرید خاں تھا۔اس کے والد کا نام حسن سور تھا۔حسن سور کے باپ کا انتقال ہریانہ کے نارنول میں ہوا تھا، جس کا وہاں مقبرہ بھی تھا۔شیر شاہ کی ولادت کے سلسلے میں دو تاریخ بتائی جاتی ہے، اوّل ۱۴۷۳ء اور دوسری تاریخ ۱۴۸۶ء۔بہر حال ان میں سے جو بھی سنہ ہو، لیکن پیدائش نانول (ہریانہ) میں ہوئی تھی۔اس کے دادا کے انتقال کے بعد اس کے والد حسن سور نے سلطان سکندر لودی کے ایک امیر جمال احمد خاں کے یہاں ملازمت حاصل کر لی تھی، جس نے سہسرام اور خواص پور جو کہ قلعہ روہتاس کے تحت تھے، جاگیر کے طور پر دئے۔ اس کے زیر حکم پانچ سو سوار تھے۔فرید خاں کے سات بھائی تھے، جن سے فرید خاں کا ہمیشہ اختلاف رہا۔اس دوران فرید خاں اپنی اوائل عمری میں ہی بے سروسامانی کے عالم میں جونپور کے مدرسوں اور خانقاہوں میں علم و ہنر حاصل کرنے میں منہمک رہا۔شیر شاہ کو دینیات اسلامی میں بھی مہارت حاصل تھی۔ بعد میں وہ آگرہ بھی گیا اور سلطان ابراہیم کے ایک سردار دولت خاں کے یہاں ملازمت اختیار کر لی۔حسن خاں کے انتقال کے بعد دولت خاں نے ہی اس جاگیر کے پرگنے فرید خاں (شیر خاں) کے حوالے کئے، جن کا وہ عرصہ تک انتظام کار رہا۔

جب پانی پت میں سلطان ابراہیم کی شکست ہوئی اور اس پر

بابر نے فتح پائی تو اس دور میں فرید خاں پھر بہار آ گیا اور سلطان محمد کے یہاں ملازمت کرنے لگا۔ اسی دوران اپنے آقا بہار خاں کے ہمراہ ایک دن شکار کھیلنے کے لئے جنگل گیا اور جنگل میں اچانک سامنے آئے شیر کو فرید خاں نے اپنی تلوار کے ایک ہی وار سے ختم کر دیا۔ یہ دیکھ کر جہاں بہار خاں ششدر رہ گیا، وہیں بہت خوش بھی ہوا اور خوشی میں اس نے فرید خاں کو شیر خاں کا خطاب دینے کے ساتھ ساتھ اپنے فرزند ہلال خاں کا اتالیق بھی مقرر کیا۔ بعد میں بنگال کے حکمراں کے ایک امیر اور حاجی پور، بہار کے حکمراں مخدوم عالم سے شیر خاں کی دوستی ہوگئی۔

بنگال کے سلطان نے شیر خاں پر فتح حاصل کرنے کے لئے فوج بھیجی، لیکن شیر خاں نے اپنی شجاعت اور جوانمردی سے ان پر خود ہی فتح پا لیا اور ابراہیم کو قتل کر کے، اس کا سارا اثاثہ اور مال و دولت اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اس شجاعت اور دولت کی حصولیابی کے باعث اس کی اہمیت میں دن بہ دن اضافہ ہوتا چلا گیا اور ایک وقت ایسا آیا جب شیر شاہ پورے بہار پر قابض ہوگیا۔

اپنی تخت نشینی کے بعد شیر شاہ نے کئی اہم اور تاریخی کام کئے۔ علاء الدین کی بسی بسائی دلّی کو اجاڑ کر ایک نیا شہر فیروز آباد کے نام سے تین کوس کی لمبائی میں بسایا۔ اسی دور میں شیر شاہ نے بنگال سے روہتک (ہریانہ) تک شاہراہ بنائی، جس میں خاص بات یہ تھی کہ آگرہ سے مانڈو تک ہر کوس پر ایک سرائے، مسجد اور پختہ کنواں تعمیر کراتا گیا۔ مسجد میں ایک مؤذن اور امام کا بھی تقرر کیا۔ سڑک کے دونوں طرف درخت لگوائے، تاکہ آنے جانے والے مسافروں کو چھاؤں ملے۔

شیر شاہ، حج کے لئے جانے والوں کو، لوٹنے والے قزلباشوں کے لئے فکرمند رہتا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح حرمین شریفین کے تعاون سے حج پر جانے والوں کو اس پریشانی سے نجات دلائے۔

شیر شاہ نے ۱۵۴۵ء میں کالنجر کو فتح کرنے کے لئے اس کے قلعہ کا اپنے فوجیوں کے ساتھ محاصرہ کر لیا، جہاں اس کے سپاہی سرنگوں کے ذریعہ قلعہ کے اندر داخل ہو گئے اور شیر شاہ اپنی نگرانی میں بارود دی گولہ سے قلعہ پر حملہ کر رہا تھا کہ اچانک ایک گولہ قلعہ کی دیوار سے ٹکرا کر شاہی لشکر کی جانب لوٹ آیا اور پھٹ پڑا۔ جس کے نتیجے میں وہاں پر موجود سارے گولے پھٹ پڑے اور ہر طرف آگ لگ گئی، جس میں خود شیر شاہ بھی گھر گیا اور اس کا سارا جسم جھلس گیا۔ جھلسے جسم کو لے کر وہ اپنے خیمہ میں آ گیا اور اپنی تکلیف کی شدت کے باوجود وہ اپنے سپاہیوں کا فتح کے لئے حوصلہ بڑھاتا رہا۔ اس وقت ایک غیبی مدد کی بھی تاریخ بیان کی جاتی ہے۔ آخر کار شیر شاہ کو فتح ملی، لیکن وہ خود جانبر نہ ہوسکا اور وہیں فوت ہوگیا۔ چونکہ شیر شاہ کا آبائی قبرستان سہسرام میں تھا، اس لئے اس کی لاش کو سہسرام میں لاکر سپرد خاک کیا گیا۔ بعد میں اس قبرستان کو ایک شاندار یادگار میں بدل دیا گیا، جو آج بھی شیر شاہ کے مقبرہ کے نام سے مشہور ہے۔

شیر شاہ نے پندرہ برسوں تک سرداری کی اور صرف پانچ سال تک خود مختار بادشاہ رہا۔ شیر شاہ کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے سلیم خاں کو، جو اس وقت پٹنہ میں موجود تھا، تخت نشینی کے لئے بلایا گیا اور تخت نشیں کیا گیا۔ اس کے بعد اس کا بڑا بھائی عادل خاں تھوڑے دنوں کے لئے تخت نشیں ہوا۔ سلیم خاں کی بادشاہت زمانے تک رہی۔ اس کا دارالخلافہ گوالیار بھی رہا۔ اس کے مقعد میں زخم ہونے کے باعث ۱۵۵۳ء میں اس کی وفات ہوئی اور اسے بھی سہسرام میں ہی شیر شاہ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ اس نے تقریباً ۹ سال تک حکومت کی۔ سلیم شاہ کے دولت خاں سے عشق کا قصّہ بھی کافی مشہور ہوا۔

شیر شاہ کے متعلق مشہور تاریخ داں کالکا رنجن قانون گو نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ شیر شاہ دنیا کی ان ممتاز ہستیوں میں سے ایک ہے، جس کے ساتھ تاریخ نے انصاف نہیں کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس کی وفات کے دس سال کے اندر نہ صرف اس کا خاندان نیست و نابود ہوگیا بلکہ عنان حکومت بھی اس قبیلے کے ہاتھ سے نکل کر جس اجنبی قوم کے ہاتھ میں پہنچی اس کا ہند پر صدیوں اقتدار قائم رہا، جس کے باعث شیر شاہ کے کارناموں پر توجہ نہیں دی گئی۔ قانون گو کے مطابق اکبر اعظم کے بعد اگر کسی کو قابل حکمراں تسلیم کیا جاسکتا ہے تو وہ شیر شاہ ہی ہے۔

حقیت یہ ہے کہ شیر شاہ کے بارے میں تاریخ کی زبان، خاموشی اختیار کئے رہی، جس کی وجہ سے شیر شاہ سے متعلق تاریخ میں بہت کم معلومات ملتی ہے۔ بہار کے تعلق سے شیر شاہ اور اس کی تاریخ

بہت اہمیت رکھتی ہے، اس لئے میں نے مختصراً اس کا ذکر کر دیا ہے، تاکہ بہار کی تاریخ جب کبھی لکھی جائے، تو شیر شاہ کی تاریخی حکمرانی اور اس کے شاندار کارناموں کو نظر انداز نہیں کیا جائے۔

شیر شاہ کے بعد پٹھانوں (داؤد خاں کرانی) کی حکومت (۱۵۶۵ء-۱۵۷۲ء) قائم ہوئی۔ اس عہد میں اس خاندان کا تسلط بہار بنگال اور اڑیسہ کے ساتھ ساتھ آسام کے بعض علاقے پر قائم رہا، لیکن مغلوں نے پٹنہ اور حاجی پور شہر کے مغربی علاقوں پر حملے کے بعد فتح حاصل کی اور کرانیوں (تاج خان خاندان) کو باہر کر دیا۔ گرچہ داؤد خاں نے مقابلہ خوب کیا، پھر بھی اسے مغلوں کی بے پناہ طاقت اور منظّم فوجی دستوں کے سامنے سپر ڈالنا پڑی اور بعد میں وہ ۱۵۷۶ء میں مغل فوجوں کے ہاتھوں اس کا قتل ہوا، جس کے بعد مغل بادشاہ جلال الدین محمد اکبر کی سلطنت نے کرانی کی پوری سلطنت کو دہلی میں شامل کرتے ہوئے ۱۵۸۰ء میں بہار کو باضابطہ ایک صوبہ کے طور پر تشکیل دیا اور ''آئین اکبری'' کے مطابق مغرب سے مشرق اور شمال سے لے کر جنوب تک کا رقبہ بھی طے کر دیا، ساتھ ہی ساتھ اس پورے صوبہ بہار کو بہار سرکار کے ماتحت سات سرکار یعنی، بہار سرکار، سرکار مونگیر، سرکار چمپارن، سرکار حاجی پور، سرکار سارن، سرکار ترہت، سرکار روہتاس کو ۱۹۹ پرگنہ میں منقسم کرتے ہوئے سلطنت کی سہولیات اور انتظامی امور کے لئے اسے مختلف حصوں میں بانٹ دیا۔

اس کے بعد مغل حکومت کا عروج اور پھر زوال آیا اور صوبہ بہار بھی مختلف خانوں میں منقسم ہوتا رہا، یہاں تک کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے رابرٹ کلائیو کی قیادت میں ۱۷۵۷ء میں بنگال کے نواب سراج الدولہ کو پلاسی کی جنگ میں شکست دے کر برٹش حکومت کی بنیاد کو مضبوط کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ پلاسی کی لڑائی بھارت کے لئے ایک بہت ہی اہم اور ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہوئی۔ اس جنگ کے بعد انگریز اس ملک پر قابض ہوتے چلے گئے۔ پلاسی کی اس جنگ کے چھ سال بعد انگریزوں نے مغل بادشاہ، شاہ عالم، اس کے وزیر شجاع الدولہ اور میر قاسم نواب بنگال کی مشترکہ فوجوں کو بہار کے بکسر کے مقام پر ہونے والی جنگ میں شکست دے دی۔ مغل بادشاہ، شاہ عالم نے انگریزوں کو چھبیس لاکھ روپے کے بدلے برٹش کمپنی کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کے دیوانی حقوق بھی سونپ دئے۔

مغل حکومت کے عروج کی طویل مدت کے بعد کمزور پڑتے جا رہے مغل بادشاہوں پر دھیرے دھیرے انگریزوں نے اپنی گرفت مضبوط کر لی اور اپنی منصوبہ بند سازش سے پورے ملک پر تسلط قائم کر لیا، یہاں تک کہ دھیرے دھیرے بہار کا وجود بھی ایک زمانے میں ختم کر دیا گیا اور اسے بنگال میں ضم کر دیا گیا، لیکن بھارت کے لوگوں نے کبھی بھی انگریزوں کی حکمرانی کو قبول نہیں کیا اور ہمیشہ ان کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کئے رہے، یہاں تک کہ بغاوت کی چنگاری ۱۸۵۷ء میں پھوٹ پڑی۔

اس بغاوت کے وقت خاص بات بلکہ قابل فخر بات یہ رہی کہ غدر ۱۸۵۷ء کی پہلی چنگاری پھونکنے والا مجاہد آزادی بہار کے شاہ آباد (موجودہ آرہ) کا ہی باشندہ منگل پانڈے تھا۔ اس انقلاب اور بغاوت میں بہار کے مختلف علاقوں مثلاً پٹنہ، گیا، روہتاس، موتیہاری، مظفر پور، سارن وغیرہ کے محبّ وطن نے جو کردار ادا کئے، وہ آزادئ ہند کی تاریخ کا بہت ہی اہم اور سنہرا باب ہے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے تعلق سے ڈاکٹر این ایم پی شری واستو نے اپنی ہندی زبان میں لکھی کتاب ''بہار میں راشٹریتا کا وکاس'' میں لکھا ہے کہ:

> ''اس وقت وہابی تحریک ایک مذہبی تحریک تھی، پھر بھی اس کا سیاسی مقصد ہندستان کو انگریزی اقتدار سے آزاد کرنا تھا۔ تحریک کے لیڈران کے مطابق، انگریزوں کے ذریعہ زیر اقتدار ہونا اسلام مذہب کے خلاف تھا۔ ۵۹-۱۸۵۷ء کی بغاوت کے وقت حکومت کو یہ شک تھا کہ وہابی لیڈران کا بھی سازش میں ہاتھ ہے، اس لئے پٹنہ کے کمشنر ٹیلر نے پٹنہ کے اہم وہابی لیڈران مولوی محمد احمد اللہ و دیگر لیڈران پر مقدمہ چلایا اور احمد اللہ کو جلاوطنی کی سزا ملی پھر بھی، پوشیدہ طور سے یہ تحریک چلتی رہی۔''
>
> (دستاویز ۱۲، بہار قانون ساز کونسل، پٹنہ، ص ۱۷)

اپنے اس مضمون میں ڈاکٹر این ایم پی شریواستو نے آگے راجندر پرساد کی خودنوشت کے حوالے سے بہار کی زبوں حالی اور برٹش حکومت کے آغاز

سے ہی بنگال کے ساتھ ضم ہونے کی بات کو اس انداز میں واضح کیا ہے کہ:

''اس تناظر میں راجندر پرساد نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ 'بہار ایک پسماندہ صوبہ تھا، جہاں عوامی زندگی کا چشمہ بہت پتلا بہا کرتا تھا۔ تعلیم کا بھی پورا فقدان تھا۔ سبھی باتوں میں بہار کے لوگ دیگر صوبوں کے لوگوں کے مقابلے بہت پسماندہ تھے۔ بہار، انگریزی حکومت کے آغاز سے ہی بنگال کے ساتھ تھا۔ وہ برسوں بنگال کا حصہ بنا رہا، یہاں تک کہ بہار کا الگ نام تک لوگ بھول گئے تھے۔ بنگال ترقی پذیر صوبہ تھا، لیکن اس ترقی کا اثر بہار تک نہیں پہنچ پایا تھا۔ انگریزی تعلیم میں بھی بہار اتنا پسماندہ تھا کہ بہاری لوگ سرکاری دفتروں تک نہیں پہنچ پاتے تھے، اونچے عہدوں کو کون کہے۔'' (ایضاً،ص۱۹)

صوبہ بہار کے بنگال کے انضمام کے بعد بہار اور بہاریوں کی ترقی کی رفتار تھم سی گئی تھی، یہاں تک کہ جو بہار چندر گپت موریہ، اشوک، شیر شاہ اور اکبر کے زمانے میں ایک مثالی صوبہ کے طور پر بھارت کے نقشہ پر اپنے وجود کا احساس کراتا تھا، وہ بنگال کے اندر ایسا معدوم ہوا کہ باہر کے لوگ بہار کا نام سننے کے بعد حیرت کا اظہار کرتے تھے کہ ہندوستان میں بہار نام کی بھی کوئی جگہ ہے۔ ان باتوں سے راجندر پرساد، سر علی امام، سچتا نند، مہیش نرائن، سر سید محمد فخر الدین وغیرہ بہت متفکر تھے، اور ان لوگوں نے بہار کو بنگال سے الگ کرایک الگ صوبہ کے وجود کے لئے انگریزوں سے مطالبہ شروع کر دیا۔

۱۸۹۴ء میں ''بہار ٹائمز'' (مدیر: مہیش نرائن) اور اردو کے کئی اخبار اس مطالبہ میں پیش پیش نظر آئے۔ ان اخبارات میں شائع ہونے والے ایسے مضامین میں اس بات پر زور دیا جانے لگا کہ بہار کا الگ وجود نہیں رہنے اور بنگال کے ماتحت رہنے کے باعث بہار کے لوگوں کی سماجی، سیاسی، تعلیمی،، معاشرتی اور اقتصادی ترقی میں رخنہ اندازی ہو رہی ہے، یہاں تک کہ مختلف دفاتر میں افسران، ملازمین، اسکولوں، کالجوں میں اساتذہ بنگال سے آتے ہیں اور انھیں تنخواہ کے علاوہ بہار میں رہنے کا الگ سے بھتہ ملا کرتا ہے۔

بہار کو بنگال سے الگ کرنے کے مطالبہ میں مزید وسعت دینے اور اسے دھاردار بنانے کے لئے بیرسٹر شرف الدین، سچتا نند سنہا، مہیش نرائن اور دیگر کئی لوگوں نے یہ طے کیا کہ اس تحریک میں بہار کے طلبا کو بھی شامل کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے بقول ڈاکٹر سریواستو ''۱۹۰۶ء میں دسہرے کی چھٹی میں پہلی بہاری طالب علم کانفرنس، پٹنہ کالج، میں پٹنہ کے مشہور بیرسٹر شرف الدین کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اسی دوران مہیش نرائن (مدیر، بہار ٹائمز، جو جولائی ۱۹۰۶ء میں ''بہار'' کے نام شائع ہونے لگا تھا) کی ۱۹۰۷ء میں وفات ہوگئی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سریواستو لکھتے ہیں:

''مہیش نرائن کی موت کے بعد مظہر الحق، علی امام، و دیگر بہاری مسلمانوں نے بھی سچتا نند سنہا کو اپنا تعاون دیا۔ ان لیڈران کی کوشش سے بہار ریاستی کانفرنس کا قیام ہوا، جس کا پہلا اجلاس علی امام کی صدارت میں ۱۳/اپریل ۱۹۰۸ء کو پٹنہ میں ہوا۔ اس اجلاس میں محمد فخر الدین نے ایک تجویز رکھی، جس میں بہار کو بنگال سے الگ کر کے ایک نیا صوبہ بنانے کی مانگ تھی۔ یہ تجویز اتفاق رائے سے پاس ہوئی۔ ۱۹۰۸ء میں ہی سونپور میلے میں سچیتا نند سنہا نے مظہر الحق، حسن امام اور دیپ نرائن سنگھ کے تعاون سے بہار کے کانگریسیوں کا ایک جلسہ نواب سرفراز حسین خاں کی صدارت میں بلایا۔ اس جلسہ میں بہار ریاستی کانگریس کمیٹی کی تشکیل کی گئی، جس کے صدر حسن امام بنائے گئے۔'' (ایضاً،ص۲۲)

ڈاکٹر شریواستو اس کے آگے کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں:

''اسی انتخاب میں مظہر الحق بھی مسلمانوں کے نمائندہ کی شکل میں منتخب ہوئے۔ اس کے قبل ۱۹۰۷ء میں سر فخر الدین کو کلکتہ ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا گیا، جو ایک بہاری کے لئے پہلا موقع تھا۔ اسی طرح ۱۹۰۸ء میں علی امام کو کلکتہ ہائی کورٹ میں حکومت ہند کے مستقل قانونی مشیر کی شکل میں بحال کیا گیا۔ یہ بھی پہلا موقع تھا، جب

کوئی بہاری اتنے بڑے عہدہ پر پہنچا ہو۔سچیتا نند سنہا کے انتخاب کے قبل سابق مرکزی قانون ساز کوؤنسل میں دربھنگہ کے دومہاراجہ ہی آ سکے تھے۔'' (ایضاً،ص۲۲)

بنگال سے بہار کو ایک الگ صوبہ بنانے کی کوشش تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔۱۹۱۱ء میں جب مجاہدین بہار کو یہ اطلاع ملی کہ اس سال دلی میں ایک شاہی دربار منعقد ہوگا اور جارج پنجم کو ہندوستان کا بادشاہ بنائے جانے کا اعلان ہوگا تو اس خبر سے ان مجاہدین بہار کو امید بر ہوتی نظر آئی اور انہوں نے کوششیں مزید تیز کر دیں گئیں اور بہار کو ایک الگ صوبہ تسلیم کئے جانے کے مطالبے کے لئے میمورنڈم اور مضامین کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا اور آخر کار مسلسل محنت،سخت جد وجہد اور کوششوں نے رنگ لایا اور ۱۲/دسمبر ۱۹۱۱ء کو دلی کے شاہی دربار کا انعقاد ہوا،جہاں بادشاہ نے بہار اور اڑیسہ کو ملا کر ایک نئے صوبہ کی تشکیل کا سرکاری طور پر اعلان کیا۔ جس میں بہار کو،کاؤنسل کے ساتھ نائب گورنر کا بھی فائدہ ہوا۔

اس طرح یکم اپریل ۱۹۱۲ء کو صوبہ بہار کا باضابطہ افتتاح ہوا۔جس کی راجدھانی پٹنہ کو بنایا گیا۔ یوں تو بہار کو بنگال سے الگ کرنے کے سلسلے میں اس دور میں بہت سارے لوگوں کی کوششیں شامل رہیں،لیکن تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اس تاریخی کوششوں میں سرعلی امام،سچیتا نند،سرسید محمد فخر الدین،شرف الدین وغیرہ کا بہت نمایاں رول رہا۔سرعلی امام کی اس ضمن میں جو قربانیاں دیں،انھیں بعض مورخوں نے فراموش کرنے کی دانستہ کوششیں کی ہیں،لیکن ایسے لوگوں کے لئے یہ یاد دلانا ہی کافی ہے کہ سرعلی امام کے انتقال کے بعد پٹنہ ہائی کورٹ میں جو تعزیتی جلسہ منعقد ہوا تھا،اس میں ان کے بہت سارے اوصاف اور ایثار کا اعتراف کرتے ہوئے یہ تجویز بھی منظور ہوئی تھی کہ:

" In fact Bihar owaisits seperate identity to him and he has been rightly called the maker of Modern Bihar."

(یعنی''حقیقت یہ ہے کہ بہار ایک الگ صوبہ انھیں کی کوششوں سے بنا اور ان کو جدید بہار کا معمار اوّل کہا جانا بالکل صحیح ہے۔'')

ان کوششوں سے صوبہ بہار کو ایک الگ صوبہ کا درجہ ضرور مل گیا،لیکن یونیورسٹی اور کورٹ وغیرہ صوبہ بنگال کے ماتحت ہی رہے۔ بہار کے لوگوں کی لڑائیاں جاری رہیں۔خاص طور پر اس طبقہ کے لوگوں کی جدوجہد شدت سے سامنے آئی،جو ملازمت میں اپنے صوبہ بہار کی اہمیت اور اوّلیت چاہتے تھے۔نتیجتاً ۱۹۳۵ء میں بنگال کا ایک بار پھر بٹوارہ ہوا اور بہار-اڑیسہ کو دو ریاستوں کا درجہ دے دیا گیا اور صوبہ بہار کا پہلا وزیر اعظم محمد یونس کو بنایا گیا۔اس کے بعد بلا شبہ بہار کی سیاسی، سماجی،معاشرتی،اقتصادی اور تہذیبی سطح کے ساتھ ساتھ یہاں کی لسانی، ادبی اور صحافتی تبدیلیاں سامنے آنے لگیں۔اس کے برسوں بعد بہار، ایک بار پھر شیبوسورین،سورج منڈل وغیرہ جیسے آدی باسی رہنماؤں کی کوششوں سے لالو پرساد کے دور اقتدار میں ۱۵/نومبر ۲۰۰۰ء میں منقسم ہوا،جس کے سیاسی،سماجی،معاشی،لسانی اور معاشرتی اثرات ریاست بہار پر یقینی طور پر پڑے،جن کے گواہ بہار کے مختلف شہر ہیں،جہاں ادبی علمی،لسانی،معاشرتی،تہذیبی اور تاریخی تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ انسانی دانش وعمل کے ارتقا کے مطالعے کا سب سے اہم،موثر اور قابل اعتبار وسیلہ ہے اور یہ تاریخ جس قدر پرانی ہوتی جاتی ہے اسی قدر دلچسپ اور بے حد قیمتی ہو جاتی ہے،جو ایک طرف تاریخی سچائیوں کی عکاس بن جاتی ہے اور پھر دوسری جانب علم وادب،شعر وسخن،سیاست ومعاشرت اور تہذیبی اقدار،بدلتے وقت کی تبدیلی کی تاریخ رقم کرنے کے ساتھ ساتھ ایک وہ وقت بھی آتا ہے جب تاریخ معتقدات کا منبع بن کر انسانی معاشرے کے بہت سارے حقائق کو واضح کرنے کا بھی اہم فریضہ انجام دیتی ہے،اس لئے ضروری ہے کہ شہروں،قصبوں اور گاؤوں کی روشن تاریخی سچائیوں کو آنے والے وقت کے حوالے کیا جائے۔ہم اس تلخ حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ دھیرے دھیرے بہار کے مختلف شہروں کے بہت سارے تاریخی نقوش مٹتے جا رہے ہیں،اس لئے یہ ضروری ہے کہ ان مٹتے نقوش اور نفوس کو تحقیق وتاریخ کے حوالے سے یکجا کر دیا جائے تا کہ آنے والے وقت اور اگلی نسل کے لئے بہار جیسی اہم ریاست (صوبہ) کی سنہری تاریخ کے ابواب محفوظ ہو جائیں۔

❁❁❁

مقالات

ڈاکٹر محمد ارمان

Asst. Prof. Deptt. of Urdu & Persian, Veer Kunwar Singh University
Ara - 802301 (Mob.- 82102 52026)

پروفیسر اشرف جہاں* کے عنوانیہ افسانے

۱۸؍اگست ۲۰۲۰ء ـــــ یہ ہے تاریخ وفات اُس معروف و محترم خاتون قلم کار کی، جسے ادبی دنیا پروفیسر اشرف جہاں کے نام سے جانتی ہے۔ وہ میری رشتہ میں خالہ ہوتی تھیں اور حسن اتفاق کہ خالو جان محمد نذیرالدین حیدر، رشتے میں میرے چچا بھی ہیں۔ ایک زمانہ تھا، جب مجھے ایک ہی گھر میں رہ کر بہت قریب سے انہیں دیکھنے کا موقع ملتا رہا۔ واقعی وہ بہت ہی پڑھی لکھی، نستعلیق ومہذب اور نہایت ہی مہربان خاتون تھیں۔ تدریسی مشاغل کے ساتھ ساتھ کتابوں کا مطالعہ اور تصنیف وتالیف ان کا دائمی مشغلہ رہا۔ انہوں نے نہ صرف افسانوں کے کئی مجموعے بلکہ کئی اہم تنقیدی کتابیں بھی یادگار چھوڑی ہیں، لیکن اس وقت میرا مقصودِ تحریر نہ تو ان کی سیرت وشخصیت کا بیان ہے، نہ ہی ان کی تنقیدی باقیات اور ان کی انشائیہ نگاری کا تذکرہ، بلکہ اپنے عنوان تحریر کے بموجب میں صرف ان کے عنوانیہ افسانوں کے تجزیے تک ہی اپنی گفتگو محدود رکھنا چاہتا ہوں۔

پروفیسر اشرف جہاں کے افسانوی مجموعے اگر چہ صرف تین ہی ہیں یعنی ''شناخت''، ''اکیسویں صدی کی نرملا'' اور ''اگر میں نا ہوتی''، لیکن یہ بات بہت خاص ہے کہ ان کی تصنیفی زندگی کا آغاز جس کتاب سے ہوتا ہے، وہ پہلی کتاب اُن کے آٹھ افسانوں کا خوبصورت مجموعہ ''شناخت'' ہے۔ کراؤن سائز کے ۶۴ صفحات پر مشتمل، اگست ۱۹۹۷ء میں شائع ہونے والے اس مجموعہ کا ''انتساب'' انہوں نے اپنے شریک حیات محمد نذیرالدین حیدر کے نام کیا ہے۔

اس مجموعہ کا ''پیش لفظ'' مشہور افسانہ نگار احمد یوسف کے قلم سے ہے۔ ''موم کی مریم'' اس مجموعہ کی پہلی کہانی اور ''فکر آ گہی'' آخری کہانی ہے اور جس کہانی کو اس مجموعہ کی عنوانیہ کہانی کا مرتبہ ملا ہے یعنی ''شناخت'' وہ اس مجموعہ کی فہرست میں تیسرے نمبر پر ہے اور مجموعہ کے صفحہ ۲۲ سے صفحہ ۲۸ تک پھیلی ہوئی ہے۔ اشرف جہاں کے اس افسانوی مجموعہ میں ''پٹنہ کالج میگزین''، ''بانو'' اور ''حریم'' میں شائع شدہ

---

* اشرف جہاں معروف وممتاز خاتون افسانہ نگار، انشائیہ نگار اور تنقید نگار کی حیثیت سے کسی تعارف کی دست نگر نہیں۔ وہ ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، اُن کا آبائی وطن ندول، پٹنہ، جائے ولادت ہزاری باغ اور تاریخ ولادت ۲۱ رجنوری ۱۹۵۱ء ہے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۶۵ء میں انہوں نے گورنمنٹ ہائی اسکول سے میٹرک کیا اور پھر بھاگل پور کے سندروتی مہیلا کالج سے انٹر اور ۱۹۶۹ء میں آرہ کے مہنت مہادیوانند مہیلا کالج سے بی۔اے کرنے کے بعد ۱۹۷۱ء میں پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ سے ایم۔اے کی سند لی۔ انہوں نے یو جی سی اسکالرشپ حاصل کیا اور ڈاکٹریٹ کی سند کے لئے، محترمہ قریشہ حسین کی نگرانی میں اپنا جامعاتی تحقیقی مقالہ بعنوان ''ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں کردار نگاری'' لکھا۔ ڈاکٹر اشرف جہاں ۱۹۸۱ء میں گورنمنٹ وومنس کالج، گردنی باغ، پٹنہ میں لکچرر اور اکتوبر ۱۹۸۷ء سے پٹنہ کالج میں لکچرر ہوئیں، ۲۰۱۱ء میں پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی صدارت کا منصب سنبھالا اور ۳۱ رجنوری ۱۹۶۱ء کو ملازمت سے سبکدوش ہوئیں۔ ڈاکٹر اشرف جہاں کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۶۵ء کے آس پاس ان کی افسانہ نگاری سے ہوا۔ ان کی تنقیدی کتابیں ''اردو ناول کے آغاز میں دبستان عظیم آباد کا حصہ''، ''افسانے کا بدلتا مزاج''، شادؔ کے ناول ''ولایتی کی آپ بیتی کا تنقیدی تجزیہ'' اور انشائیوں کا مجموعہ ''ہم اردو کے ٹیچر ہوئے'' اشاعت پا چکا ہے، علاوہ ازیں ان کے تین افسانوی مجموعے ''شناخت''، ''بیسویں صدی کی نرملا'' اور ''اگر میں نا ہوتی'' بھی شائع شدہ ہیں۔ وفات کے وقت ان کی عمر تقریباً ۷۰ سال تھی۔

کہانیوں کے علاوہ مجلّہ ''زبان وادب'' میں اشاعت یافتہ کہانی نے بھی جگہ پایا ہے اور مجموعہ ''شناخت'' اسی موخرالذکر ماہنامے میں چھپی ہوئی کہانی ہے۔ محترمہ اشرف جہاں کی اس کہانی میں ایک طرف ہماری ملاقات ناہید، اس کے شوہر ندیم اور ان کے بچے حنا اور جاوید سے ہوتی ہے تو دوسری طرف ان کی کئی پڑوسن سے بھی یکے بعد دیگرے ہماری آشنائی ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایک پڑوسن نسیمہ باجی ہیں، دوسری مسز شکلا، تیسری بلقیس اور چوتھی فرحانہ۔ ناہید اور اس کے پڑوس کی انہیں عورتوں کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو جوڑ کر اشرف جہاں نے ''شناخت'' کی کہانی بنایا ہے جس میں بہرحال ان کی ہنرمندی روشن ہے۔

ناہید کسی دفتر میں کام کرنے والے ندیم کی بیوی ہے، جس کے بچے اسکول میں زیرتعلیم ہیں۔ ندیم کی آمدنی چاہے زمانے کے لحاظ سے بہت وافر نہ ہو، لیکن وہ ایک سنجیدہ سمجھدار اور محنتی شوہر کہلانے کا حقدار ضرور ہے، اسے اخبار بینی کی عادت ہے اور دفتری اوقات کے بعد وہ بچوں کو ہوم ورک کرانے کے لئے بھی اپنا وقت دیتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر وہ بچوں کی تعلیم میں عملاً دلچسپی لینے والا آدمی ہے اور بیوی سے یوں ٹوٹ کر محبت کرنے والا کہ ایک موقع پر اُسے پریشان اور متفکر دیکھ کر خود بھی پریشان ہوجاتا ہے اور بار بار اس سے تفکر اور تردد کی وجہ پوچھتا ہے۔

ندیم کے کردار کا ایک خاموش پہلو یہ بھی ہے کہ وہ ناہید کو تجرباتی ڈگر پر چلنے کا موقع دیتا ہے اور جب اسے تجربے سے عبرت ملتی ہے اور وہ اس کا اعتراف کرلیتی ہے اور اپنا بدلا ہوا حتمی فیصلہ سنا دیتی ہے تو بڑی ہی خندہ پیشانی سے وہ اُسے قبول کرلیتا اور بڑی ہی محبت سے اس کے ساتھ پیش آتا ہے۔

ناہید کے شوہر ندیم کی یہ عادت ضرور ہے کہ وہ بیوی کی ہر بات کے جواب میں ''ٹھیک ہے'' کہہ دیتا ہے اور اس رویے کی وجہ سے ناہید کو شوہر کی طرف سے عدم توجہ کا شکوہ رہا کرتا ہے، لیکن دراصل اس کے اس رویے میں ایک دور رس معنویت بھی ہے۔ وہ بیوی کی محنت سے بڑھنے والی آمدنی کا کچھ بھی اثر نہیں لیتا ہے، بقول ناہید:

''نہ اس کے اوقات بدلتے ہیں نہ اس کا انداز''

بلکہ وہ گویا خاموشی سے سب کچھ دیکھتا رہتا ہے اور انتظار کرتا رہتا ہے کہ آخر اس بحر کی تہہ سے اُچھلتا ہے کیا؟ یہاں تک کہ انتظار ختم ہوتا ہے اور چونکہ وہ خود حالات کو سنبھالنے کے لئے ذہنی طور پر تیار رہتا ہے، اس لئے اُسے گویا ناہید کے حتمی فیصلے یعنی ملازمت چھوڑنے کے فیصلے سے کوئی زحمت یا کسی طرح کی کوفت اور شکایت قطعاً نہیں ہوتی۔

ندیم کا مزاج اور کردار اپنی جگہ، لیکن ناہید کا مزاج، پڑوسی عورتوں سے رابطہ میں رہنے کا اثر تیزی کے ساتھ قبول کرنے لگتا ہے۔ ناہید کا پڑوس ملی جلی آبادی کا پڑوس ہے۔ یہاں بلقیس، فرحانہ اور نسیمہ باجی ہیں تو مسز شکلا بھی ہیں۔ ناہید کھلی چھت پر مسز شکلا کو اپنے شوہر کی گود میں آرام کرتے ہوئے دیکھتی ہے، مگر وہ عورت کی آزادی کے نام پر ایسی کھلی ڈلی تہذیب سے متاثر نہیں بلکہ یک گونہ حیرت زدہ اور کسی حد تک یوں کہیں کہ متنفر بھی ہوجاتی ہے اور اس تحیر وتنافر کا یک گونہ نفسیاتی رشتہ اس کی نسوانیت اور اس کے اپنے تہذیبی ماحول سے بھی ہے اس لئے وہ اپنے آپ میں اس منظر پر احتجاجی سوچ کی اسیر ہوجاتی ہے اور ایسی موڈ قسم کی عورت بننے کا کوئی جذبہ اس کے اندر نہیں ابھرتا ہے۔

اسی طرح وہ سرراہ ایک گیارہ سالہ کم سن لڑکے کو سرراہ سگریٹ پیتے ہوئے دیکھتی ہے تو اس کے اندر افسوس کا جذبہ جاگتا ہے اور اپنی اولاد کی تربیت پر دھیان نہ دینے والے والدین کے بارے میں وہ حیرت وحقارت سے سوچنے پر مجبور ہوجاتی ہے، لیکن کچھ بھی ہونا ہید اپنے زمانے اور اپنے ماحول ہی کی پروردہ ہے اور نفسیاتی طور پر وہ گردوپیش کے نوع بہ نوع مشاہدوں کا اثر بتدریج قبول ہی کرلیتی ہے۔

اس کی پڑوسن بلقیس اپنے مکان کے ایک کمرے کو دو کمرے میں بدل کر، کرایہ دار بسالیتی ہیں اور اس کے علم میں یہ بات بھی آجاتی ہے کہ انہوں نے ایک ہزار روپے کرایہ پر اپنا مکان اٹھادیا ہے، لیکن اس معاملہ کا بھی اس کی سوچ پر بروقت کچھ زیادہ اثر نہیں پڑتا ہے، البتہ جب وہ بلقیس کے مکان میں آنے والی کرایہ دار فیملی نیاز اور فرحانہ کو وہ دیکھتی ہے تو اس کی سوچ تیزی سے بدلنے لگتی ہے۔

کہانی کے بموجب ناہید کی سوچ کو بدلنے میں نسیمہ باجی کا بڑا حصہ ہے۔ ناہید کی یہ پڑوسن اصل میں بڑی خوبصورتی سے تانیثی کردار بنانے کے لئے عورت کے ذہن کو موڑنے اور واش کر دینے کا ہنر جانتی ہے اور اسی کے ذریعہ دراصل ناہید کو نیا ذہن ملتا ہے۔ وہ بلقیس کے خوش پوش کرایہ دار جوڑے کو ناہید کے سامنے ایک رول ماڈل بنا کر دکھانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

بلقیس کے گھر کا کرایہ دار جوڑا نیاز اور فرحانہ دونوں ہی بینک کی ملازمت میں تھا اور ظاہر ہے کہ ان کی اپنی الگ روٹین اور اپنا الگ رہن سہن اور پہناوا تھا۔ نسیمہ، ایک طرف بلقیس کی مداح تھیں کہ ایک ہزار کی آمدنی کا راستہ نکال کر انہوں نے بڑی عقلمندی کا کام کیا تھا اور دوسری طرف وہ نیاز اور فرحانہ کو بھی بہت ستائشی نظر سے دیکھتیں اور ناہید کو دکھایا کرتی تھیں، یہاں تک کہ ناہید پر ان کی اس ہنرمندانہ تانیثی تبلیغ کا نفسیاتی رنگ آ ہی گیا۔

ناہید نے بہت قریب سے فرحانہ کی نقل وحرکت اور اس کے رہائشی طرز و انداز کو دیکھا، نسیمہ نے ناہید کو شوہر کی چہیتی بننے کا گر بتایا اور اسے بھی اپنی آمدنی پیدا کرنے پر اُکسایا اور اس کا راستہ دکھایا، تانیثی کا ایک فکری و ذہنی سیلاب تھا جو اس طرح آہستہ آہستہ دبے قدموں آیا اور ندیم کے گھر آنگن میں یوں داخل ہو گیا کہ ناہید اس کی لہروں کے ساتھ بہہ جانے سے خود کو بچا نہیں سکی۔

بلقیس سے تو ناہید اگرچہ کم کم ہی متاثر تھی، مگر فرحانہ سے وہ پوری طرح متاثر بلکہ مرعوب ہو گئی۔ اس نے ندیم کو اپنا فیصلہ بتایا۔ جواب ملا ''ٹھیک ہے'' اور پھر اس نے ایک سلائی سینٹر میں نوکری کر لی اور جیسا کہ نوکری پیشہ عورت ہونے کا تقاضا تھا، اُس نے اپنا حلیہ بھی بدل لیا، گھریلو عورت کے چولے اتار دیے اور بزعم خویش اپنی ''شناخت'' پا کر نئی دنیا میں مگن ہو گئی۔

ناہید اپنی شناخت کے لئے نوکری کر کے یوں بھی مطمئن رہی کہ گھر کی آمدنی بڑھ گئی تھی اور اس کے بچوں کے لئے اسکولی بس کا خرچ پورا ہونے لگا تھا، لیکن یہ تو صرف نوکری کا ایک رُخ تھا، دوسرا رُخ یہ بھی سامنے آیا کہ کئی نئے مسئلے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس ملازمت نے اسے تھکن کی مریضہ اور بدمزاج بنا دیا۔ وہ کئی طرح کے نفسیاتی کرب اور کھلے ڈھکے احتجاج واختلاج میں گھر گئی اور پھر ایک دن جب اس کے سامنے یہ راز کھلا کہ فرحانہ کا کم سن بیٹا کس طرح برباد ہو رہا ہے تو اس کا احساس جاگ اُٹھا اور اس نے خود ہی گھر واپسی یعنی نوکری چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور تانیثیت پسندی کی چمک دمک والی دنیا سے اپنے گھر آنگن اور اپنے بچوں کی فطری و پرسکون دنیا میں لوٹ آئی۔

ڈاکٹر اشرف جہاں کی یہ کہانی ''شناخت'' ایک طرف پڑوسنوں کے ذریعہ ذہن سازی اور ان کی تحریک سے بنی ہے اور آگے بڑھی ہے تو دوسری طرف خود ناہید کے شوہر اور اس کے بچوں کے بے نام احتجاج سے قابو میں بھی رہی ہے اور اپنے مثبت انجام کی طرف لوٹ بھی آئی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کہانی میں دوبار کے اتفاقی مشاہدے سے مثبت ذہن سازی کی راہ نکل آئی ہے، اس نے اجنبی لڑکے کے طور پر بازار میں فرحانہ کے کم سن بیٹے کی سگریٹ نوشی دیکھی اور پھر گھر کے باہر اُسی لڑکے کا ماں کے ساتھ ضدی رویہ بھی دیکھ لیا اور یہی مشاہدہ اُسے ایک ذہنی تحریک دے گیا، یا یوں کہا جائے کہ اس کے لئے خاموش معہود ذہنی بن گیا اور اس کی سوچ کو بدلنے کا باعث ہوا، لیکن بات صرف اتنی ہی نہیں بلکہ اس سے آگے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ افسانہ ''شناخت'' میں فن کار کا احتجاجی رویہ شروع سے ہی ایک خاموش زیریں لہر بن کر موجود رہا ہے۔

ناہید کے شوہر کا تکیہ کلام اگر یوں کچھ کہے اور کچھ اَن کہے لفظوں میں احتجاج ہے کہ: ''ٹھیک ہے.....'' یعنی ٹھیک ہے آئندہ خود ہی سمجھ میں آ جائے گا، تو ناہید کی بیٹی حنا کا وہ مطالبہ بھی چیختا احتجاج ہی ہے، جس کے بدلے میں اُسے ماں کے ہاتھوں تھپڑ کھانا پڑا ہے۔ ماں سلائی سینٹر کا آرڈر پورا کرنے کے لئے نوکری پر جانے کی فکرمند ہے تو بچی کی ضد یہی کہہ رہی ہے کہ میرا حق مارا جا رہا ہے اور پھر اس کہانی میں جاوید کے اُس بڑھے ہوئے، گندے ناخن کا بھی خاموش احتجاج موجود ہے جو ایک نہیں دس دس انگلیوں کی تائید کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ میرا حق مارا جا رہا ہے، میرا حق مجھ سے نہ چھینو۔

حقیقت یہی ہے کہ اشرف جہاں کی یہ کہانی ''شناخت'' ایک نہیں کئی ایک فکری وفنی پہلو سے اپنے پڑھنے والوں کو آخر آخر تک

متوجہ رکھتی ہے۔ یقیناً م۔ناگ جیسے ادیب اگر اس کہانی میں ''عصری تازہ کاری'' کے معترف ہیں تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ اس طرح احمد یوسف کے اس خیال میں بھی اپنا وزن اور وژن موجود ہے کہ افسانہ ''شناخت'' ایثار کی ایک خاص صورت دکھا جاتا ہے۔ بیشک اس مجموعہ کے ایک تبصرہ نگار کی زبان میں:

''اگر عورت گھر کی ذمہ داری اور بچوں کی تربیت سے منھ موڑ کر دفتر کی زینت بن جائے تو اس کے بچے غلط راہوں پر لگ جاتے ہیں۔ افسانہ 'شناخت' میں انہیں برائیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔'' (ہمارے تبصرے، ڈاکٹر محمد مظاہر الحق، ص ۱۷)

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تانیثی حوالے سے ''شناخت'' کا مسئلہ اور اس کا حل ہی اشرف جہاں کی اس عنوانیہ کہانی کا خاص موضوع اور اس کا واقعاتی محور ہے۔ اس کہانی میں نہ صرف منظر کشی اور پیکر تراشی کی مثالیں ملتی ہیں اور زبان واسلوب کے لحاظ سے اس میں بول چال کا بے تکلف خطابیہ لہجہ (ناہید کی جگہ ''ناہد'') اور بعض خوبصورت جملے ''ندیم کے نہ تو اوقات بدلے نہ انداز'' (ص ۵) اور ''وہ شام گلے میں اٹکی ہوئی، نمکین گھونٹ کے ساتھ کیسے رات میں اتر گئی، پتہ ہی نہیں چلا'' جیسا خوبصورت فقرہ اور استعارت بداماں جملہ ہمیں ملتفت کر لیتا ہے، بلکہ فکری اعتبار سے اس کہانی کا مطالعہ ہمیں جن مقصدی نتائج تک پہنچاتا ہے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ جنسی آزادی و بیباکی کے نام پر نہ تو عورت کی شناخت وہ ہے جو کھلی چھت پر مسٹر شکلا کی گود میں آرام فرما مسز شکلا دکھا جاتی ہیں۔ نہ ہی عورت کی شناخت وہ باتیں ہیں، جن کا ذکر نسیمہ باجی کی زبان پر آتا ہے کہ گھریلو عورتوں کی طرف مرد توجہ نہیں دیتے، اس لئے گویا انہیں ملازمت پیشہ، برسر روزگار اور معاشی لحاظ سے خود کفیل وخود مختار ہونا چاہئے۔

اسی طرح عورت کی شناخت، وہ بھی نہیں ہے جو اپنے دو بچوں کو ہوسٹل میں رکھ کر بینک کی ملازمت کرنے والی فرحانہ کا رنگ روپ، رہن سہن اس کی سوچ اور اس کا کردار دکھاتا ہے اور عورت کی شناخت وہ بھی نہیں ہے جس کی خاطر بلقیس اپنا ڈرائنگ روم، دو کمروں میں بانٹ کر، کرایہ اُٹھاتی ہے۔

عورت کی پہچان نہ تو وہ سج دھج ہے جو فرحانہ اپناتی ہے اور نہ ہی وہ بناؤ سنگار جو ناہید اختیار کرتی ہے، عورت کی شناخت وہ بھی نہیں ہے جو مرد کے محض ''ٹھیک ہے'' کہہ دینے سے بنتی ہے بلکہ عورت کی اصل اور دائمی شناخت وہ ہے جو اس کے ایثار اور ممتا کے جذبے سے سامنے آتی ہے۔

اشرف جہاں کی اس کہانی کا بلاشبہ اپنا فکری وفنی وصف ہے اور اس وصف کے اجمال کی تفصیل اگر لکھنی ہو تو بلا تکلف یہ لکھا جا سکتا ہے کہ ''شناخت'' جیسی کہانی مشاہدے سے بنتی ہے، پھر تجربے میں ڈھلتی ہے اور تب احساس سے نتیجہ خیز ہوتی ہے اور اپنا اعتبار بناتی ہے۔

اس کہانی کی وساطت سے اشرف جہاں جو ذہن دینا چاہتی ہیں وہ یہی ہے کہ تانیثیت کے حوالے سے خواہ کسی تحریک یا کسی رجحان اور فلسفے یا نظریے کی بات کی جائے، مگر یہ سچائی اپنی جگہ اٹل ہے کہ کسی سلائی سینٹر میں عورت کی ملازمت سے ہو سکتا ہے کہ گھر کی مالی حالت وقتی طور پر تھوڑی سی بہتر ہو جائے، لیکن جہاں تک عورت کی اصل شناخت کا معاملہ ہے وہ نہ تو کسی ناہید کی طرح بال ترشوانے، ساڑیاں خریدنے اور نئے نئے زیور خریدنے سے بنتی ہے، نہ ہی شوہر کے تکیہ کلام کو ہلکے انداز بلکہ منفی مفہوم میں لینے سے بنتی ہے، بلکہ اصلاً یہ شوہر کے اشارے، انداز ومزاج اور اس کے جواب کی معنویت کو سمجھنے سے اور اس کی خاموش محبت یا اس کا خاموش احتجاج محسوس کر لینے سے بنتی ہے۔ اس کا مطلب، گھریلو زندگی میں باہمی غلامی کے تصور سے جڑا ہوا نہیں ہے بلکہ اس فطری بات سے وابستہ ہے کہ اصل نسوانی شناخت بیوی کو شوہر کی محبت پا لینے اور بچوں کو باپ کی توجہ کے ساتھ ساتھ ماں کا پیار عملاً سلامت رہنے سے بنتی ہے۔

پروفیسر اشرف جہاں کی اس زیر تجزیہ کہانی میں ازدواجی زندگی کے لطیف جنسی اشارے کی رمق، ایک اچھی فنی بنت اور نفسیاتی پٹ ہی نہیں، گھر کا نقشہ بھی ہے اور پڑوس اور بازار کا مشاہدہ اور سروس سنٹر کے کاموں کا دباؤ بھرا تجربہ بھی۔

اس کہانی کا یہ پہلو تو کھلا ہی ہوا ہے کہ اس میں افسانہ نگار پروفیسر اشرف جہاں نے ''تکیہ کلام'' سے خوب کام لیا ہے اور اس کی معنویت کئی پہلو سے اجاگر ہوئی ہے۔ یہاں یہ ذہن بھی دیا گیا ہے کہ

مشاہدے سے اثر لینا برا نہیں اور اس کی خرابی کا احساس ہونے پر اصلاح کر لینا بھی ٹھیک ہے۔ اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہاں نظریہ تھوپا نہیں گیا ہے، بلکہ خود پرکھ کر فیصلے پر پہنچنے کا موقع دیا گیا ہے اور شناخت کے قدیم وجدید متبادلوں کو عقل و تجربے کی کسوٹی پر رکھ کر دیکھنے اور منتخب کرنے کا فن کی زبان میں موثر پیغام دیا گیا ہے۔

اشرف جہاں کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''اکیسویں صدی کی نرملا'' ۱۱۲ صفحات اور ۱۹ کہانیوں پر مشتمل ہے جو ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعہ کی پہلی کہانی ہی اس کی عنوانیہ کہانی ہے جب کہ ''کون ہوتم'' پر اس مجموعہ کی کہانیوں کا سلسلہ اختتام پذیر ہوا ہے۔ مصنفہ کی یہ ٹائٹل کہانی، جیسا کہ خود اس کتاب میں وضاحت کردی گئی ہے ماہنامہ ''بہار'' ۲۰۰۲ء میں چھپی تھی اور وہیں سے مجموعہ کے لئے اسے اخذ کیا گیا ہے۔

کتاب کے صفحہ ۹ سے صفحہ ۱۶ تک پھیلی ہوئی یہ کہانی اپنے عنوان میں پریم چند کی ''نرملا'' سے جو استعاراتی نسبت دکھا رہی ہے وہ محتاج وضاحت نہیں۔ پریم چند قلم کے سپاہی تھے اور فکشن کے حوالے سے ایک ایسے بلند پایہ اور منفرد و مفکر قلم کار کہ جب ان کی صدی بدلی تو نئی صدی کے قلم کاروں نے ان کی خاص خاص تخلیقات سے غذا لے کر فکشن کو آگے بڑھانے اور اس کا ایک نیا رنگ دکھانے میں بجا طور پر فخر بھی محسوس کیا اور کامیابی سے بھی ہم کنار ہوئے۔

پروفیسر اشرف جہاں کا نام بھی اس ٹائٹل کہانی کی بدولت ایسے ہی قلم کاروں کی فہرست میں داخل ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ پریم چند کی ''نرملا'' اور ''اکیسویں صدی کی نرملا'' میں مبینہ فرق ہونا ہی تھا اور وہ ہر لحاظ سے نمایاں ہے۔ پریم چند کی نرملا، ان کے ناول کی ہیروئن ہے جب کہ اشرف جہاں کی نرملا، ان کے افسانے کی ہیروئن بن کر آئی ہے۔

یہاں بہت اختصار سے ہی سہی، مگر اتنا لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند کا ناول ''نرملا'' اُن کا دوسرا ناول ہے جس کا نام انہوں نے ناول کی ہیروئن کے نام پر رکھا ہے۔ یہ ناول پہلی بار ہندی میں ''چاند پریس'' الٰہ آباد سے ۱۹۲۳ء میں چھپا تھا اور اس کے چھ سال بعد ۱۹۲۹ء میں ''گیانی الکٹرک پریس، بک ڈپو'' لاہور سے اردو میں شائع ہوا۔ اس ناول میں ہندو رسم و رواج کے خلاف آواز اُٹھائی گئی ہے اور بھگتی کو پناہ کی جگہ بتایا گیا ہے۔ ''نرملا'' لکھنے کا اصل مقصد بے جوڑ شادی کے نتائج کو دکھانا تھا۔

منشی پریم چند کی نرملا، ناول کے پلاٹ کے بموجب اودے بھان وکیل کی بڑی بیٹی ہے جس کی شادی چالیس سالہ طوطا رام سے ہوجاتی ہے اور قصہ مختصر ایک دن دمِ آخریں وہ اپنی بیٹی کو، اپنی نند کی گود میں ڈال دیتی ہے۔

اشرف جہاں کی افسانہ نگاری: ادبی دانشوروں کی نظر میں

☆ ڈاکٹر اشرف جہاں کا قوت مشاہدہ، حساس دل ان کے افسانوں میں جا بجا دھڑکتا نظر آتا ہے۔ عورتوں کی معاشرتی زندگی، بے چارگی اور استحصال کی تصویریں ان کے افسانوں میں نمایاں (ہیں) اور پڑھنے والوں کو باندھ لیتی ہیں۔ (ان کے پہلے مجموعہ) ''شناخت'' کے افسانوں میں ان کی تخلیقی توانائی، مشاہداتی قوت اور فن کارانہ صلاحیت کی جلوہ گری ہے۔ افسانہ ''شناخت'' کی تازہ کاری آج بھی قائم ہے..... ''اکیسویں صدی کی نرملا'' کے تمام افسانے میں عورت کی زندگی، اس کے مسائل اور دکھ درد کے نئے نئے رنگ بھرے ہیں (اور) عورت کی بے بسی، لاچاری، تڑپ جیسے سنجیدہ موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ افسانے نہ صرف تفریح کراتے ہیں بلکہ زندگی کے تلخ و شیریں حقائق سے روبرو کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے کردار اور فضا ہمیں اپنائیت سے بھر دیتی ہیں اور ہم افسانہ نگار کے تجربات اور مشاہدات سے ہم رشتہ ہونے لگتے ہیں۔ (م۔ ناگ ''اگر میں نا ہوتی'' کے اندرونی فلیپ سے)

پریم چند کی نرملا کو دیکھیں تو اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ وہ ہوس پرستوں سے بھرے اُس سماج میں جہاں تعزیر کا قانون بھی بے اثر ہے، نہ صرف محبت اور صبر کا پیکر بن کر کھڑی دکھائی دیتی ہے بلکہ آشرم اور سیوا سدن کا سہارا لینے کی بجائے سماج سے ٹکراتی ہے اور یہاں تک کہ ٹکرا کر خود پاش پاش ہو جاتی ہے، لیکن ایک مثال ضرور چھوڑ جاتی ہے۔

اب آیئے، اشرف جہاں کے ٹائٹل افسانہ کی اُس نرملا کی طرف جو اکیسویں صدی کی نرملا ہے۔ یہ میڈیکل کی طالبہ ہے اور اپنے ایک ہم جماعت لڑکے فراز کے دیئے ہوئے نام سے نرملا کہلا رہی ہے، ورنہ اس کا اصل نام مریم ہے۔ وہ فراز کے اصرار پر کالج کے ایک ڈرامے میں حصہ لیتی ہے اور ہیروئن کی حیثیت سے نرملا کا کردار نہایت کامیابی سے ادا کرتی ہے۔ فراز کو ایسا لگتا ہے جیسے وہ بالکل نرملا جیسی ہو ''ویسی ہی نرمل، ویسی ہی کومل، ویسی ہی شانت'' لہٰذا وہ بہت خوش ہوتا ہے اور کہہ اُٹھتا ہے:

''تم ایک دم پریم چند کی نرملا لگ رہی تھی''

لیکن ڈرامے میں ایکٹنگ سے قطع نظر اس کا نظریہ کچھ اور ہی ہے۔ وہ نرملا کو ذہنی طور پر سخت ناپسند کرتی ہے اور غصہ میں یہ دھیان دیے بغیر کہ اس کی بات سننے کے لئے فراز موجود نہیں ہے، کہہ اُٹھتی ہے:

''نفرت ہے مجھے ایسی جاہل گنوار عورتوں سے جو سماج کے بنائے ہوئے اصولوں کی چتا پر جل جاتی ہیں، نفرت ہے مجھے نرملا کے کردار سے.....''

یہ سوچ ہے اور یہ باغیانہ آواز ہے اکیسویں صدی کی نرملا کی۔ اشرف جہاں نے اِس نرملا کی جو کہانی پیش کی ہے اس کا آغاز ڈرامائی نفسیاتی انداز سے ہوا ہے، وہ ذہنی سکون کے لئے پارک میں کہیں دور سے آتی ہے اور ایک ذہنی بے چینی میں مبتلا رہتی ہے۔ ماضی کی یادیں اسے ڈستی رہتی ہیں اور وہ اندر ہی اندر تڑپتی رہتی ہے۔ کبھی تو ''نرملا'' نام کی ایک خوشبو جو اصل میں فراز کے دیئے ہوئے نام کی خوشبو ہے، اس کی روح میں اُترنے لگتی ہے اور اسے بے چین کر دیتی ہے اور کبھی جب وہ کمرے میں ہوتی ہے اور اس کے سامنے کھانے کے نام پر ابلی ہوئی سبزیاں، سوکھی روٹیاں، جوس اور سوپ گویا بیمار کا روکھا پھیکا بدمزہ کھانا رکھا ہوتا ہے تو اسے اپنی ماں کے ہاتھوں کا بنا ہوا پکوان، قورمہ، پلاؤ، پوریاں، کچوڑیاں، چٹنی، اچار بے تحاشہ یاد آتا ہے۔

اشرف جہاں کی نرملا کے سامنے ماں کا چہرہ گھومنے لگتا ہے اور وہ وقت بھی، جب اس نے ماں کی بات ٹھکرا دی تھی اور کچن میں خود کھانا پکانا سیکھنے سے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا تھا کہ پڑھ لکھ کر کامیاب ہونے کے بعد جب اُسے نوکری اور اعلیٰ عہدہ مل جائے گا تو وہ یہ کام دائی ماما سے لیا کرے گی۔ اسے یاد آتا ہے کہ اُس کے غصہ بھرے جواب پر ماں کو حیرت بھی لگتی تھی کہ:

''کیا میری بیٹا، لڑکوں جیسا کمائے گی؟''

مگر یہ سب بیتے دنوں کی باتیں تھیں۔ اشرف جہاں کی اس کہانی میں اس کی ہیروئن جس رنگ روپ میں آئی ہے، وہ کئی لحاظ سے بیسویں

☆ ''اشرف جہاں کے افسانوں میں جا بجا ہمیں عورتوں کے استحصال کی کوئی نہ کوئی صورت نظر آ ہی جاتی ہے۔ ''موم کی مریم'' میں ایثار کی ایک صورت ہے اور ایثار کی ایک اور صورت ہمیں ''شناخت'' میں بھی ملتی ہے۔ یہ وہ ایثار ہے جو (بسا اوقات ماں باپ) اپنے بال بچوں کے لئے بھی نہیں کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ والدین کی بے توجہی کے سبب بچوں میں بغاوت کا جذبہ جنم لینے لگتا ہے اور بڑے ہو کر بالعموم ایسے بچے غیر متوازن شخصیت کے مالک ہو جاتے ہیں۔ (شناخت، پیش لفظ بہ قلم احمد یوسف، ص ۹)

☆ ڈاکٹر اشرف جہاں کے ادبی سفر کا آغاز افسانے سے ہوا..... ان کے منتخب افسانوں کا ایک مختصر مجموعہ 'شناخت' (کی اشاعت) سے نہ صرف ان کی شہرت و مقبولیت میں اضافہ ہوا بلکہ اس سے ان کی ایک پہچان بھی بنی۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں خواتین ہی کے مسائل کو موضوع بنایا اور انہیں موضوعات کو مختلف زاویے سے چھان پھٹک کر فنی پیرائے اور موثر اسلوب میں پیش کیا۔ عورتوں کے مسائل سے ان کی دلچسپی خصوصی نوعیت کی تھی۔ (ہم اردو کے ٹیچر ہوئے، ''حرفے چند'' بہ قلم ڈاکٹر منظر اعجاز، ص ۱۲ و ص ۱۳)

صدی کی نرملا کے رنگ روپ اور اس کی سیرت سے بالکل ہی جداگانہ ہے۔

یہ اکیسویں صدی کی نرملا ہے جسے امور خانہ داری اور کچن کی دنیا سے نہ کوئی واسطہ ہے اور نہ اس کی کچھ سمجھ اور معلومات، پریم چند کی نرملا کا مذہب نام کے مطابق تھا۔ اس کی تعلیم کا معاملہ بھی زمانے کی روش کے تابع تھا، لیکن یہ اکیسویں صدی کی نرملا ہے جو ایک مسلم دوشیزہ ہے، مگر وہ نہ ہندی جانتی ہے۔ نہ اردو جانتی ہے نہ ہی ادب کے مطالعہ سے اس کو کوئی دلچسپی ہے گویا وہ ہندوستانی، تہذیب و زبان، گنگا جمنی ثقافت سے ناآشنا ہے اور مطالعہ شعروادب کی برکتوں سے محروم۔

کہانی بتا رہی ہے کہ اکیسویں صدی کی اس نرملا کے پاس صرف اپنے اصلی نام (مریم) کا ایک تقدس ہے، ورنہ اس کے کردار نے اس تقدس اور اس کے تصور پر کاری ضرب لگانے میں بھی کوئی کور وکسر نہیں دینے دیا ہے، اس افسانے کی کہانی، تیس برسوں کا زمانہ اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے اور اس کا جو نقشہ بنتا ہے وہ گویا آج کے سماج میں آزادی نسواں کے نام پر عورتوں کی ذہنی کجی و کج روی اور آزاد خیالی کے انجام کا نقشہ ہے۔

پریم چند کی نرملا میں چاہے ایک نہیں، کئی خرابیاں اور خامیاں ڈھونڈ نکالی جائیں، مگر یہاں ایک علامت کے طور پر ہی سہی جو نرملا ہمارے سامنے کھڑی ہے اس کا حال واحوال بھی یقیناً حد سے سوا دگرگوں ہے، اکیسویں صدی کی نرملا بہت پڑھی لکھی اور ڈگری یافتہ ضرور ہے، مگر اس کے اندر تعلیم کا غرور اس حد تک ہے کہ پناہ مانگنے کو جی چاہتا ہے۔

اکیسویں صدی کی نرملا ہی کیا، کہانی میں اس کی بھابھی سے بھی ہماری ملاقات ہوتی ہے جو ساس کی انتہائی نافرمان ہے۔ یہ اس کہانی کی نیلوفر نامی لڑکی ہے جو کسی فرم میں اپنے ساتھ کام کرنے والے نوجوان سے شادی کر کے، ایک گھر کی بہو بنتی ہے، مگر اس کی بداخلاقی اور اس کے ''تعلیمی پندار'' کا عالم یہ ہے کہ وہ ساس کو جاہل ہونے کا طعنہ دیتی ہے اور بیٹے کے لئے ماں کی محبت کے جذبے کو سمجھنے، اس کی قدر کرنے اور اس سے بہت کچھ سیکھنے کی بجائے، کھانا بنانے میں، طرح طرح کی ڈش تیار کرنے میں اس کی مہارت اور دلچسپی کو انتہائی حقارت سے دیکھتی ہے۔

یہاں ذرا سا رُک کر دیکھیں تو اُس ماں کے انجینئر بیٹے کا کردار بھی بڑی حد تک لائق نفرین ہی نظر آتا ہے جو محبت کی شادی کر لیتا ہے اور بیوی کے ذریعہ ماں کی ناقدری یا اس کے رویہ پر بہن کے اعتراض کا جواب یوں دیتا ہے کہ نیلوفر کو ساتھ لے کر، گھر ہی چھوڑ دیتا ہے۔

بہرکیف یہ اس کہانی کا ایک دوسرا رُخ ہے جو ہمیں یہ اشارہ دے رہا ہے کہ لڑکیاں اور عورتیں ہی نہیں، نئے دور کے تعلیم یافتہ عہدے دار نوجوان لڑکے بھی اخلاق و آداب اور اصول کی ڈگر سے دور بہت دور اور عام سی عقل سے بھی بالکل ہی پیدل ہو چکے ہیں۔

☆ اشرف جہاں نے اپنے افسانوں میں عورتوں کی معاشرتی زندگی اور ان کے استحصال کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے (اور) مختلف زاویوں سے عورت کی عظمت کو پرکھا ہے۔ (بہار میں تخلیقی نثر، ڈاکٹر قیام نیر، ۲۰۱۴ء، ص ۴۰۸)

☆ تبسم فاطمہ کے یہاں عورتوں کے روایتی مسائل مثلاً طلاق، جہیز، سسرال یا شوہر کی زیادتی جیسے موضوعات نہیں ہیں (جب کہ) تبسم کے برعکس اشرف جہاں کے یہاں عورتوں کے روایتی یا بنیادی مسائل زیادہ تر موضوع بنتے ہیں۔ ''اکیسویں سدی کی نرملا'' کے نام سے شائع ان کے افسانوی مجموعہ میں عورت کی تنہائی، بے بسی اور مرد کی بے اعتنائی کا اظہار تو ہوتا ہی ہے، اپنی بقا، تشخص اور آزادی کے لئے احتجاج کا رویہ بھی ملتا ہے..... مرد اساس معاشرے اور مرد حاوی سوچ کے خلاف اشرف جہاں کا یہ مزاحمتی رویہ ان کی بہت ساری کہانیوں میں زیریں لہروں کی طرح موجود ہے۔ (اردو فکشن: تنقیدات و تفہیمات، شہاب ظفر اعظمی، ۲۰۲۳ء، ص ۲۲۵ و ص ۲۲۶)

☆ اشرف جہاں نے مستورات کے مختلف مسائل کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے..... ڈاکٹر اشرف جہاں کو عورتوں کی نفسیات سے نہ صرف واقفیت ہے بلکہ انہوں نے اپنے افسانوں میں عورتوں کی نفسیات کی جو تصویر کشی کی ہے وہ حقیقت سے قریب تر ہے۔ (شناخت پر تبصرہ، ہمارے تبصرے، ڈاکٹر محمد مظاہر الحق، ۲۰۲۵ء، ص ۱۶ و ص ۱۷)

ڈاکٹر اشرف جہاں نے اپنی اس عنوانیہ کہانی میں اکیسویں صدی کی جس نرملا کو لایا ہے، وہ اخبار وہ ٹی وی پر خبریں سننے کی عادی ہے، مگر ان خبروں کو بھی وہ اپنے ہی رنگ اور مزاج سے دیکھتی اور پرکھتی ہے اور یہ رنگ روپ، مزاج اور انداز وہی ہے جو عورتوں کی برتری اور بالادستی کے تانیثی نظریہ سے جڑا ہوا ہے۔ ٹی وی کی اینکر ناری ریزرویشن سے جڑی خبر سناتے دیر نہیں کہ لوک سبھا میں اس پر زور دیا گیا ہے اور اکیسویں صدی کی نرملا کا غصہ یہ سوچ کر ساتویں آسمان تک پہنچتے بھی دیر نہیں کہ اس نئی صدی میں بھی عورت کو کمزور سمجھا جا رہا ہے۔ اس کی ناقدری ہو رہی ہے اور اسے ریزرویشن کے سہارے جینے کی بات کی جاری ہے۔

ٹی وی کی خبر پر یہ ردّعمل اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کہانی کی ہیروئن کتنی جذباتی اور کس حد تک تانیثیت پسندی بلکہ تانیثیت پرستی میں مبتلا ہے۔

یہ بات اپنی جگہ ٹھیک ہے کہ اس کہانی میں جونسوانی کردار ہیروئن کے سنگھاسن پر براجمان ہے، اس کی کچھ ذاتی خوبیاں بھی ڈھکی چھپی نہیں رہتی ہیں، مثلاً یہ کہ وہ ایک بیٹی کی حیثیت سے بہو کے ذریعہ اپنی ماں کی توہین برداشت نہیں کر پاتی ہے اور اپنی بساط بھر ماں کے لئے سپر بن کر کھڑی ہو جاتی ہے، پھر یہ بھی کہ وہ حالات سے ایک ذہنی اور عملی تحریک لیتی ہے۔ وہ اپنی بھابھی کے تعلیم یافتہ ہونے سے جلتی نہیں ہے، بلکہ اس کے غرور کا اپنے عزم و کردار سے مثبت جواب دینے کے لئے ایک فیصلہ کر لیتی ہے اور اس پر کاربند ہو جاتی ہے۔ اس کے افراد خانہ کی تفصیل یہ ہے کہ اس سے بڑی دو بہنیں بیاہی جا چکی ہیں۔ بھائی انجینئر ہے، بھابھی بھی تعلیم یافتہ اور نوکری پیشہ ہے اور وہ خود بھی میڈیکل کی تیاری کر رہی ہے۔ اسی تیاری کے دوران وہ فراز کی شریر آنکھوں اور اس کی قاتل مسکراہٹ پر فدا ہو جاتی ہے، اُسی کے اصرار پر کالج کے ڈرامہ میں ''نرملا'' کا پارٹ کرتی ہے اور اُسی کی زبان سے خود اس کو ''نرملا'' کہہ کر پکارنے کی بنیاد پڑتی ہے۔ پریم چند کے ناول میں بھی تکیہ کلام موجود ہے اور ہم چاہیں تو اشرف جہاں کی اس کہانی میں ''نرملا'' کو فراز کا تکیہ کلام نہ سہی ''تکیہ خطاب'' کہنے کی گنجائش ضرور نکال سکتے ہیں۔

کہانی کی اس ہیروئن کا مزاج عام لڑکیوں سے الگ تھلگ ہے۔ وہ ایک نک چڑھی لڑکی ہے، یہی وجہ ہے کہ کالج کی لڑکیوں سے اس کا کوئی ربط ضبط نہیں بنتا اور جو کچھ دوستی بنتی ہے، وہ فراز سے ہی بنتی ہے، اسے فراز کی محبت، دوستی اور اس کے ایثار کا احساس و اعتراف ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ وہ محسن کش یا احسان فراموش نہیں ہے، یہ اور بات ہے کہ فراز کی طرف اس کے جھکاؤ میں عمر کے تقاضے شامل ہیں۔

اس کہانی کی ہیروئن اس لحاظ سے بہرصورت محروم قسمت ہی کہلائے گی کہ اس نے اسے ڈاکٹر بن کر ماں کی خدمت کا موقع نہیں دیا اور اس لحاظ سے بھی بدقسمت ہی کہی جائے گی کہ اس نے ماں کے ہزار کہنے پر بھی شادی کے لئے آمادگی ظاہر نہیں کی، مگر اس لحاظ سے وہ خوش قسمت ضرور کہلائے گی کہ اس کے ماموں لندن میں تھے اور انہوں نے اسے وہاں بلا لیا۔ وہ فراز کی فین تھی، لہٰذا بدیس جانے والی فلائٹ سے بس ایک رات پہلے وہ اس سے ملاقات کے لئے گئی اور یہی جذباتی ملاقات ہیروئن کی زندگی اور اس کے کردار کو ایک نیا موڑ دے گئی۔

اکیسویں صدی کی نرملا اور فراز کی یہ ملاقات اپنے وطن کی دھرتی پر آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد درمیان میں تیس برسوں کا فاصلہ ہے، پھر لندن میں ان دونوں کی جب ملاقات ہوتی ہے تو خاص بات یہ نہیں کہ شکایتوں کے دفتر کھل جاتے ہیں بلکہ خاص بات یہ ہے کہ مریم یا یوں کہا جائے کہ فراز کی نرملا کے سارے ڈھکے چھپے، پریشانی اور پشیمانی والے راز ہی بے نقاب نہیں ہو جاتے ہیں بلکہ وہ آخری ملاقات کی رات کا حوالہ دے کر خود اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہے کہ:

''اُس رات میں تم سے کچھ چرا لائی تھی۔''

اس مقام تک پہنچ کر اشرف جہاں کی اس کہانی میں دو بات اور بھی لائق ذکر بن جاتی ہے، ایک کا تعلق ہیروئن کی جذباتی غلطی کے ساتھ اس کی ہمت اور محبت سے ہے اور دوسری بات کا تعلق دو ملک کے معاشرتی مزاج و اطوار سے۔ بقول ہیروئن:

''لندن میں ایسی چوری چھپانا کوئی خاص بات نہ تھی۔''

یہ اشارہ ہے یوروپ میں کھلی جنسی آزادی والے ماحول کا۔ اسی جگہ یہ معاملہ بھی سامنے آ جاتا ہے کہ چاہے صدی بدل گئی ہو، مگر اولاد کے تئیں ماں کی حیثیت سے عورت کی سوچ اپنی جگہ رہتی ہے اور اس پر نکاحی اور

بے نکاحی کا فرق بھی کوئی اثر نہیں ڈالتا۔

پریم چند کی نرملا نے اپنی بیٹی اپنی نند کی گود میں ڈال دیا تھا یعنی پرورش اور حفاظت کا ممکنہ بندوبست کر گئی تھی، یہاں اشرف جہاں کی نرملا کا بھی معاملہ وہی ہے کہ وہ اپنی محبت یا جذباتی غلطی کے انجام کو خود گلے لگالیتی ہے اور جسے جنم دیتی ہے اسے پال پوس کر کھڑی کر دیتی ہے۔

نازیہ، فراز کے نطفہ سے ہیروئن کی بیٹی ہے جو لندن کے معاشرے میں ڈاکٹر آصف کی بہو اور سلیمان کی دلہن بن کر سامنے آتی ہے۔ بات حیرت کی تھی، حیرت ہوئی، مگر فراز کا یہ جملہ غور طلب ہے:

''ایں! سلیمان کی دلہن، تمہاری نازیہ۔ یہ تصویر وہ بالکل مشرقی خیال کی دلہن.....''

یہاں فراز کا کردار ''تمہاری نازیہ'' کے ٹکرے نے کمزور کر دیا ہے کہ وہ اپنی جذباتی غلطی کا ذمہ دار بننے کو اندر سے تیار نہیں ہے اور پھر ''بالکل مشرقی خیال کی دلہن'' کا ٹکڑا لندن یا مغربی ممالک میں اسلام اور اسلامی تہذیب کی مقبولیت کا اشارہ دے رہا ہے۔

پریم چند کی نرملا کے پاس ڈگریاں نہ تھیں، مگر اس کے خیالات سلامت تھے جب کہ اکیسویں صدی کی نرملا نے خود اپنے ریزہ ریزہ خیالوں کا اعتراف کر لیا ہے:

''نازیہ کو میں نے اپنے ریزہ ریزہ خیالوں کے زیر اثر نہیں پالا ہے۔ بڑے جتن سے تعلیم دی ہے کیونکہ جیسے جیسے میں آگے بڑھی۔ جیسے جیسے آگے بڑھی، جان گئی کہ عورت سماج کی نہیں، مذہب کی نہیں، اصولوں کی نہیں اپنے احساس کی قیدی ہوتی ہے۔ یہ اس کا احساس ہے (جو) کبھی تمنا، کبھی پیار بن کر اسے پابند کر دیتا ہے، وہ آزاد کہاں ہو سکتی ہے۔ نقاب اتارو تو جسم ننگا ہوتا ہے روح کو نہیں دیکھا جا سکتا، عورت کی آزادی اور پابندی بھی ایسی ہی ہے کچھ فراز!''

(اکیسویں صدی کی نرملا، ص ۱۶)

''اگر میں نا ہوتی'' پروفیسر اشرف جہاں کا تیسرا اور آخری افسانوی مجموعہ ہے۔ ۱۶۴ صفحات، ۲۱ افسانے اور ۱۸ افسانچوں پر مشتمل ۲۰۱۸ء میں اشاعت پانے والے اس مجموعہ کی ۲۱ویں یعنی آخری کہانی کو ٹائٹل کہانی کا درجہ ملا ہے۔

اشرف جہاں کی افسانہ نگاری بہ نظر خواتین

☆ محترمہ ڈاکٹر اشرف جہاں کا شمار ایک ایسی مہذب و مشہور خاتون قلم کارہ میں کیا جائے گا جو اپنی بیشتر کوششوں میں کامیاب و کامراں ہیں ..... مدیر شاعر افتخار امام صدیقی نے ان پر مارچ ۲۰۱۶ء میں خصوصی گوشہ بھی شائع کیا تھا (ان کے افسانوی مجموعے) ''اگر میں نا ہوتی''، ''اکیسویں صدی کی نرملا'' اور ''شناخت'' سیدھے سادے بیانیہ میں ایک جہان معنی کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں۔ ایک طرف اپنے وجود کا اصرار ہے تو دوسری جانب وجود کی بے معنویت کا اظہار..... انداز بیان کی جادوگری کے نقطہ نظر سے ''اکیسویں صدی کی نرملا''، ''موم کی مریم''، ''اگر میں نا ہوتی''، وغیرہ یقیناً فکشن کے تقاضوں میں ان کی بھرپور دلچسپی کے مظاہر ہیں۔ چھوٹے چھوٹے گھریلو واقعات سے کہانی کس طرح دلچسپ ہو سکتی ہے یہ ہنر ڈاکٹر اشرف جہاں کو معلوم ہے۔ ان کے اسلوب میں تخلیقیت کے عناصر بھی ہیں..... (اور) تانیثی تحریک کے حوالے سے (بھی) محترمہ اشرف جہاں کے افسانوں کا مطالعہ خاصا دلچسپ ہے۔'' (اگر میں نا ہوتی، حرف آغاز بقلم پروفیسر قمر جہاں، ص ۱۳ تا ص ۱۵)

☆ اشرف جہاں نے اپنے افسانوں میں عورت ذات کی شناخت قائم کرنے کی پوری کوشش کی ہے..... وہ افسانوں کے ذریعہ پہیلیاں بجھانے کی کوشش نہیں کرتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے ہر خاص و عام میں مقبول ہیں۔ (اردو کی اہم خواتین افسانہ نگار، ڈاکٹر رخسانہ جمیل، ۲۰۱۳ء، ص ۷۷ و ص ۷۸)

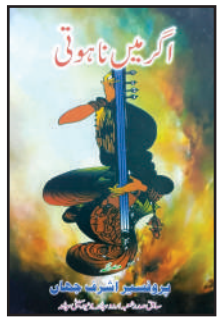

یہ کتاب ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ اشرف جہاں کے پہلے مجموعہ ''شناخت'' کا جو ٹائٹل ہے، بس رنگ و روغن کے فرق کے ساتھ وہی ٹائٹل اس کتاب کے لئے بھی اُٹھالیا گیا ہے۔مزید یہ کہ ''شناخت'' کی طرح اس کا ''انتساب'' بھی مصنفہ نے اپنے شریک حیات کے نام کیا ہے اور فرق ہے تو بس اتنا کہ اس انتساب میں ''بچوں'' کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔

اشرف جہاں کے اس تیسرے مجموعہ کی یہ ٹائٹل کہانی اگر چہ کہنے کو ایک مختصر سی سیدھی سادی مزاحیہ کہانی ہے جو سسرال جا کر، پھر ماں کے گھر آجانے والی اور ہمیشہ کے لئے حالات کے تحت وہیں رہ جانے والی اُس خاتون کے اردگرد گھومتی ہے، جسے تیسری نسل ''بصیرت نانی'' کہا کرتی ہے۔

بصیرت نانی کی کہانی بیان کرنے والی نشاط کی بیٹی ہے جس کی ماں بصیرت نانی کی بڑی بہن تھیں۔ کہانی کے بموجب یہ گھر تو بصیرت نانی کا اپنا نہیں تھا، لیکن وہ یہاں تھیں اور سارے گھر کی حاکم عملاً وہی تھیں۔انہوں نے ایک زندگی یہیں گزار دی تھی اور اُن کی خدمات کا دائرہ اس گھر کے لئے نسل در نسل بہت وسیع ہو چکا تھا۔

یہاں کہانی کار نے بصیرت نانی کا کردار جس انداز سے دکھایا ہے وہ گھریلو معاملات میں ان کے اثر ورسوخ، ان کی بے پناہ محبت اور ان کے جذبہ خدمت کی بالکل چلتی پھرتی، جیتی جاگتی حرکی تصویر سامنے لا دیتا ہے، لیکن اصل میں یہ تصویر کا اک رُخ ہے، دوسرے رُخ سے دیکھیں تو بصیرت نانی ایک بڑے گمان اور بڑے ہی ٹھسے والی بوڑھی

اشرف جہاں کی افسانہ نگاری: ناشر و مشتہر کی نظر میں

☆ محترمہ اشرف جہاں کے افسانوی سفر کا آغاز ان کے دور طالب علمی سے ہوتا ہے.....محترمہ کی قوت مشاہدہ اور حساس دل، عورتوں کی معاشرتی زندگی، بے چارگی اور استحصال کا غماز ہے 'شناخت' کے افسانوں میں یہی تصویر نمایاں ہے اور چونکہ حقیقی پس منظر میں نمایاں ہے، اس لئے اثر انگیزی کے جوہر سے بھی مملو ہے۔(تحریر بقلم ناشر، شناخت، ص ۵)

☆ عورت فطری طور پر ممتا سے مملو ہوتی ہے۔ وہ بچپن سے بڑھاپے تک اپنی ماں، خالہ، چچی، ممانی، دادی، نانی (اور) اس سے وابستہ رہتی ہے، جن میں ممتا کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے، اس کے یہاں ''نا'' کا لفظ نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا بھی ہے تو اس میں ممتا در آتی ہے۔ جیسے ایک ماں اپنے ننھے کو سمجھانے کے لئے غلط کاموں سے روکنے کے لئے کہتی ہے، ''نا'' یہ کام مت کرو۔ پروفیسر اشرف جہاں اردو کے معاصر نسائی ادب کی ایک ایسی کہانی کار ہیں کہ ان کے موضوعات خواتین کے عائلی اور دنیاوی مسائل سے گھرے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر اشرف جہاں نے ''نا'' کو ایک نیا تخلیقی پیرہن دیا ہے ''اگر میں نا ہوتی'' جیسے خوب سیرت مجموعہ کی کہانیاں آج کی عالمی عورت کے مسائل کو اشرف جہاں کے سوچ کینوس سے بیان کرتی ہیں۔ ڈاکٹر اشرف جہاں تخلیقی نثر میں شاعری کا ہنر بھی جانتی ہیں۔ اس مجموعے میں محترمہ کی ایک نثری نظم بھی ہے، ملاحظہ کیجئے: اگر میں نہ ہوتی.....تو یہ کائنات سونی ہوتی، خیر و شر کی جنگ کیسے ہوتی؟ کس کے دوش پر.....، صلیب زیست گراں بار ہوتی؟، آدم کے قدم زمین پر کیسے پڑتے.....؟، دھرتی پر محبت کی جنت کیسے آباد ہوتی؟، کس کی گرمی سے زندگی سرسبز ہوتی اور کس کے نور سے سکون برستا؟، کس کے خون سے تخلیق کے عمل میں نکھار آتا؟ ساز کیسے بجتے.....دھنک رنگ کیسے بجتا، عشق کے رمز سے آگاہی کیسے ملتی؟ فانی سے لافانی ہونے کا راز.....، اس جہاں میں کیسے آتا؟ اگر میں نا ہوتی، تو یہ دنیا سونی سونی ہوتی۔(ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی، افسانہ نمبر ۲۰۱۸ء، دوسرا اندرونی اشتہاری پس ورق)

خاتون نظر آتی ہیں جو شروع سے ہی بس اپنے بارے میں سوچنے کی عادت اور مزاج رکھتی ہیں۔ بات بات میں ''اگر میں نا ہوتی'' ان کا تکیہ کلام ہے، یہاں تک کہ اس تکیہ کلام سے مہمان بچے بھی انہیں کبھی کبھی چڑھا دیتے ہیں اور گویا ان کا غصہ، گھر کے لئے آفت بننے لگتا ہے۔

بصیرت نانی دل کی بری ہرگز نہیں، مگر حالات کی ستائی ہوئی اور نفسیاتی طور پر مسلسل احساس کمتری میں مبتلا رہنے والی خاتون ہیں جس کا اظہار ان کے تکیہ کلام سے احساس برتری کی صورت میں ہوتا رہتا ہے۔ اُن پر اپنے وجود کے عدم تحفظ کا ایک بے نام سا خوف، گویا ایک سایہ بن کر منڈلا رہا ہے۔

بصیرت نانی کے کردار اور ان کے تکیہ کلام سے بننے اور بجنے والی یہ کہانی ۲۹ جون کی دوپہر کو اس وقت اپنے کلائمکس پر پہنچتی ہے جب وہ کچن میں گر پڑتی ہیں اور گھر کے باورچی کلو دادا کا پوتا عمر، جو ''موٹو پتلو'' سیریل دیکھنے کا شوقین تھا اور اسی مناسبت سے جسے سبھی موٹو پتلو کہہ کر پکارتے بھی تھے، یہ بتاتا ہے کہ وہ اُس وقت وہاں موجود تھا، مگر جب اس سے پوچھا جاتا ہے تو وہ ایسا جواب دیتا ہے جو کہانی کو مزاحیہ انجام کے رنگ سے شرابور کرتا ہے۔ چھوٹو موٹو کے الفاظ ہیں:

''میں کیسے بتاؤں، یہ تو بصیرت نانی کا کرشمہ ہوگا۔
پوچھئے وہ کہیں گی اگر میں نا ہوتی تو کیوں گرتی۔ وہی
سب کچھ جانتی ہیں۔''

یہاں بصیرت نانی کے تکیہ کلام پر بے نام سا، مگر جو گہرا اور کھرا طنز ہے وہ اپنے اندر ایک بلیغ معنی و مفہوم رکھتا ہے۔

ڈاکٹر اشرف جہاں نے اس مجموعہ کے شروعاتی صفحہ میں وجود زن کے تعلق سے جو فلسفیانہ سطریں لکھی ہیں، اُن کا ظاہری طور پر اپنے آپ میں کہانی سے کوئی جوڑ نہیں، لیکن اس کہانی کے انجام کو اُس اقتباس کے ساتھ ملا کر دیکھیں تو بہرحال یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ عورت کے وجود کی عظمت اپنی جگہ، مگر جب شخصی طور پر وہ اس کے نفسیاتی غرور اور احساس تفوق میں گھر جاتی ہے تو اس کا انجام کس طرح بصورت انہدام سامنے آتا ہے۔

اشرف جہاں کی کہانی ''اگر میں نا ہوتی'' کے عنوان کا لفظ ''نا'' خاص طور سے متوجہ کرتا ہے۔ یہ لغت کے لحاظ سے حرف نفی ہے جو نفی کی تاکید کا فائدہ دیتا ہے۔ اس مجموعہ کا جو اشتہار ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی کے افسانہ نمبر ۲۰۱۲ء میں چھپا ہے، اس میں ممتا کے حوالے سے اس لفظ کے استعمال کا منظر و پس منظر لکھا گیا ہے۔ ممکن ہے وہاں دی ہوئی وضاحت پورے مجموعہ کی نسبت سے اپنی جگہ برجستگی رکھتی ہو، لیکن جہاں تک راقم الحروف کا خیال ہے، ان کی ٹائٹل کہانی میں لفظ ''نا'' کا استعمال اُن معنوں میں یا تو نہیں ہے یا ایک خاص نفسیاتی اظہار و انداز کے ساتھ یوں ہے کہ یہاں ''نا'' بمعنی ضرور سمجھا جائے تو بات صاف ہو جاتی ہے کہ عورت کا وجود نہ ہوتا تو انسانوں کی یہ بستی اگر بس بھی جاتی تو بسنے کے قابل نہیں رہتی۔ بہرحال یہ بحث دوسری ہے اور یہاں اس سے چنداں فرق نہیں آتا اس لئے کہ اشرف جہاں اس کہانی میں جو کچھ دکھانا چاہتی تھیں، اُسے انہوں نے کامیابی سے دکھا دیا ہے اور صرف اسی کہانی میں نہیں بلکہ اپنے پہلے اور دوسرے مجموعہ کی عنوانیہ کہانی میں بھی مختلف انداز سے وہ عورت کی مظلومیت، مزعومیت اور ملزومیت دکھاتے ہیں اور وجودیت کی نفسیات اور تانیثی رجحان کے غلغلہ کی اصلیت و حقیقت فن کے کینوس پر اُبھار دینے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔

❁❁❁

اشرف جہاں کا افسانچہ: قسطوں میں

''لڑکی ہمیں پڑھی لکھی چاہیے''..... ''جی جناب لڑکی خوبصورت بی۔اے پاس ہے۔''..... ''آپ نے نہیں سمجھا پڑھی لکھی صرف گریجویٹ نہیں پروفیشنل چاہیے۔''..... ''وہ کیوں؟''..... ''جو کچھ ارن کر سکے۔ یعنی ڈاکٹر، انجینئر یا کم سے کم پروفیشنل کورس میں کامیاب ہو۔''..... ''یہ کیا شرط ہے۔ نان نفقہ شوہر کے ذمہ ہے یا بیوی کے؟''..... ''آپ سمجھتے نہیں، یہ اکیسویں صدی ہے۔ ہمیں صرف خوبصورت لڑکی نہیں، کام کرنے والی لڑکی چاہیے۔ بس..... ہماری مانگ کچھ بھی نہیں۔''..... ''اب میں سمجھ گیا۔ آپ تلک قسطوں میں چاہتے ہیں۔'' (مشمولہ ''زبان و ادب''، ج ۲۶، ش ۱، جنوری ۲۰۰۵ء، ص ۶۱)

ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی

At+P.o.- Ijra, Via. Rayam Factory, Dist.- Madhubani - 847337 (Mob. 9910509702)

شاؔد کی سوانح نگاری

شاؔد عظیم آبادی جہاں ایک نامور اور منفرد شاعر تھے، وہیں وہ ایک عمدہ اور ممتاز نثر نگار بھی تھے۔ نثر کی مختلف اصناف پر بھی انھیں مہارت حاصل تھی، وہ ایک ناول نگار کے ساتھ اچھے سوانح نگار اور تذکرہ نویس بھی تھے۔ اپنی مختلف کتابوں میں انھوں نے شعرا و ادبا کے احوال و اشعار قلم بند کیے ہیں۔ ''نوائے وطن''، ''نقش پائدار'' حصہ اول، ''مکتوبات شاؔد''، ''شاؔد کی کہانی شاؔد کی زبانی''، ''فکر بلیغ'' حصہ اول اور ''حیات فرؔیاد'' کے حوالے سے شاہ عطاء الرحمٰن کاکوی نے ایک سو بتیس شعرا پر مشتمل ایک کتاب ''تذکرہ شعرا بزبان شاؔد'' مرتب کیا ہے، ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاؔد عظیم آبادی کو سوانح نگاری یا تذکرہ نویسی سے کتنی دلچسپی تھی۔ شاؔد عظیم آبادی نے جن شعرا یا افراد کے احوال لکھے ہیں، ان میں متعلقہ شخص کی سیرت اور ان کے ذاتی احوال رقم کرنے میں کسی تعصب کا مظاہرہ نہیں کیا ہے، بلکہ جس شخص کو جیسا پایا اور دیکھا ہے، اس کو بعینہٖ لکھ دیا ہے، تاکہ قارئین کسی گمراہی کے شکار نہ ہوں۔

سب سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم سوانح نگاری کی تعریف سے واقف ہوں۔ سوانح کی تعریف میں بڑا اختلاف رہا ہے، یہ کبھی تاریخ کی وہ صورت قرار دی گئی ہے جس کا تعلق افراد سے ہے نہ کہ انسانی نسلوں اور گروہوں سے۔ کسی نے یہ کہا ہے کہ سوانح کسی شخص کی پیدائش سے لے کر موت تک کے افکار و افعال کا بیان ہے، کبھی کہا گیا ہے کہ یہ ایک فرد کی منھ بولتی تصویر ہے، کبھی سوانح میں خارجی احوال کے ساتھ داخلی کیفیات و احساسات کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ سوانح عمری کی ایک تعریف میں بہت ساری دوسری تعریفیں بھی مدغم نظر آتی ہیں، وہ یہ ہے کہ:

> ''یہ کسی انسانی روح کی مہمات حیات کی ہو بہو تصویر ہے۔'' (شاؔد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۱ء، ص ۹۱)

ان تمام تعریفوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سوانح عمری ایک شخصیت کی زندگی کے احوال پر مرتب ہوتی ہے، لیکن شخصیت بڑی تہدار چیز ہے، ایسی صورت میں یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ متعلقہ شخصیت کے تمام تر احوال بے کم و کاست سوانح حیات میں بیان ہو جائیں۔ مارکوئز اس مسئلہ کا حل یوں پیش کرتا ہے اور جو کچھ کہتا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ شخصیت سے متعلق مواد کے رد و انتخاب میں سوانح نگار کو ایک قسم کی چھوٹ مل جاتی ہے اور یہیں سے حالات و واقعات کی پردہ پوشی کا جواز بھی نکل آتا ہے، وہ کہتا ہے:

> ''سوانح نگاری میں یہ ضروری نہیں کہ جو کچھ ہم جانتے ہوں وہ جوں کا توں پیش کر دیں، اس طرح ہر شخص کی سوانح عمری اس کے ایام حیات کی طرح طویل ہو جائے گی۔'' (شاؔد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۱ء، ص ۹۱)

اردو زبان میں ابتدا سے ہی سوانح نگاری کا سراغ ملنا شروع ہو جاتا ہے۔ سوانح نگاری کی فنی تاریخ اگرچہ مولانا الطاف حسین حاؔلی سے شروع ہو جاتی ہے، لیکن اس کے خدوخال حالی کے عہد سے بہت پہلے متعین ہو چکے تھے۔ حاؔلی کے بعد شبلی کا عہد آتا ہے جنھوں نے بہت سی شخصیات کے سوانحی احول لکھے ہیں۔ انھیں سوانح نگاری سے خصوصی دلچسپی حاصل تھی۔ پروفیسر وہاب اشرفی اس تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''بہر حال حالی اور شبلی فن سوانح نگاری کے آغاز و ارتقا کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان کی سوانحی تصنیفات کو ادبی لحاظ سے اولیت حاصل ہے۔ بعد کے سوانح نگار ان کے خوشہ چیں ثابت ہوتے ہیں۔ اب تک کی بہترین سوانح عمریوں کا جائزہ اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ سوانح نگاری کا

فن ان بزرگوں کی کاوشوں سے آگے بڑھا ہے۔''

(شادؔ عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری، ص ۱۰۲)

شمس الرحمٰن فاروقی ایک عمدہ سوانح کی شرائط بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عمدہ سوانح عمری کی پہلی شرط یہ نہیں ہوتی کہ وہ واقعات کے اعتبار سے بالکل مکمل اور صحیح ہو، کیوں کہ نئی نئی معلومات کی روشنی میں اکثر تاریخیں یا سوانح عمریاں نامکمل یا محض جزوی طور پر درست معلوم ہونے لگتی ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ جس شخص کی سوانح عمری لکھی جا رہی ہے، مصنف اس سے ذاتی طور پر واقف رہا ہو۔ عمدہ سوانح عمری کی صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ صاحب سوانح کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کے بارے میں ہماری معلومات میں اضافہ کرتی ہیں اور صاحب سوانح کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے میں ہماری معاون ہوتی ہے۔'' (اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا، ڈاکٹر ممتاز فاخرہ، رونق پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۸۴، ص: ۱۴)

سوانح نگاری ادب کی بہت اہم صنف ہے، اس میں مصنف کو بہت محنت اور تلاش وجستجو سے کام لینا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر ممتاز فاخرہ لکھتی ہیں:

''دوسری اصناف کی طرح سوانح عمری بھی ادب کی ایک شاخ ہے لہٰذا ادبی تقاضوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ سوانح نگار کو اکثر ایک طرف موضوع، مواد اور اسلوب کی طرف توجہ دینی ہوتی ہے تو دوسری طرف شخصیت کے نہاں خانوں کی نقاب کشائی بھی ضروری ہوتی ہے۔ کامیاب سوانح عمری در اصل موضوع، مواد اور انداز بیان کا حسین امتزاج ہے۔'' (ایضاً، ص ۲۵)

شادؔ عظیم آبادی کی دو سوانحی تصنیفات ملتی ہیں۔ ایک ''حیات فریادؔ'' اور دوسری ''کمال عمر''، یا ''شادؔ کی کہانی شادؔ کی زبانی'' ہے۔ ''حیات

فریادؔ'' میں شادؔ کے استاد شاہ الفت حسین فریادؔ کے احوال و آثار کے ساتھ ان کے کلام پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

''حیات ابد'' معروف بہ ''حیات فریادؔ''، مولوی سید حسین خاں خلف شادؔ کی فرمائش پر ۱۹۲۷ء میں دار المصنفین اعظم گڑھ میں مولانا سید سلیمان ندوی کے زیر نگرانی شائع ہوئی۔

یہ شادؔ عظیم آبادی کے آخری وقت کی تصنیف ہے۔ اپنی وفات سے چند روز قبل ہی اس کی تصنیف سے فارغ ہوئے تھے۔ اپنی وفات سے دو ماہ پیش تر تک شادؔ عظیم آبادی ''حیات فریادؔ'' کی تدوین و تالیف میں مصروف رہے۔ انہوں نے اس کتاب کی تالیف ایسے وقت میں شروع کی تھی جب کہ کبر سنی کی وجہ سے وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ اس قدر محنت شاقہ کے نتیجے میں ہی اپنی قوت بینائی بھی کھو بیٹھے۔ سید سلیمان ندوی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''شادؔ نے زندگی کے ابتدائی کارناموں کو اپنے خاتمہ عمر میں انجام دیا اور انھیں اوراق کے خاتمے پر اپنی زندگی کا آخری لمحہ بھی ختم کر دیا تا کہ ان مقدس اوراق کے بعد ان کے دست وقلم کسی اور بیگانہ تصنیف کو چھو نہ سکیں۔ شادؔ کا یہ آخری کارنامہ حیات امید ہے کہ کارخانۂ حیات کے خاتمہ تک اردو دنیا میں قائم و باقی رہے گا۔''

(شادؔ عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری، ص ۱۰۳)

نبیرۂ شادؔ نے اس کتاب کی تالیف اور شادؔ عظیم آبادی کے عارضۂ موتیابند پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''یہ کتاب تین بار حیدرآباد دکن میں شائع ہوئی، مرنے کے چند ماہ پہلے لکھی گئی۔ سچ پوچھئے تو اس کتاب کی تصنیف کے باعث مرحوم کی جان گئی۔ بعض صاحبوں نے اس کتاب پر اعتراضات کیے ہیں۔ من جملہ ان میں قاضی عبد الودود صاحب (بھی) ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہ سبب پیرانہ سالی بعض بعض جگہ مرحوم کے حافظے نے غلطی کی ہے۔ مرنے سے تقریباً سات یا آٹھ ماہ پہلے آپ نے اس کتاب کو لکھنا شروع کیا، اس وقت

حال یہ تھا کہ گویا مرض الموت میں گرفتار ہو چکے تھے۔ بہ دقت تمام دھوپ میں بیٹھ کر چار گھنٹے روزانہ کتاب لکھا کرتے تھے۔ رات کے وقت اکثر احباب سے حوالہ کی کتابیں نکلوا نکلوا کر پڑھوا کر سنا کرتے تھے۔.....زیادہ تر حافظہ کی مدد سے کتاب تالیف کرتے تھے۔ ڈاکٹروں نے دماغی محنت کی سخت ممانعت کر دی تھی، یہاں تک کہ جسٹس آر۔ ایل۔ داس جو کسی زمانہ میں آپ سے اردو فارسی پڑھا کرتے تھے، دوبار دیکھنے آئے، ایک بار وہ اپنے ساتھ ایک انگریز ڈاکٹر کو بھی لائے۔ اس نے جانچ کیا (کذا) اور کہا کہ جسم میں خون کی بے حد کمی ہو گئی ہے اگر اسی طرح دماغی محنت کریں گے تو موت جلد آجائے گی، والد مرحوم یہ سن کر رونے لگے اور 'حیات فریاد' کا مسودہ چھپا دیا، مگر جب حضرت برہم ہوئے تو کتاب پھر لا کر حاضر کر دی۔ جب سکت اور جاتی رہی تو بعض وقت پلنگ پر لیٹے لیٹے لکھنے لگے۔ مرنے کے دس پندرہ دن قبل کتاب مکمل کر کے مسودہ ہی کی صورت میں بذریعہ رجسٹری حیدرآباد دکن روانہ کر دی۔''

(شادؔ عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری، ص ۱۰۴)

''حیات فریادؔ'' کے مضامین و ماخذ کے بارے میں شادؔ خود لکھتے ہیں:

(۱) خود حضرت مآب (فریادؔ) ہی نے وقتاً فوقتاً حالات بیان فرمائے تھے۔

(۲) راقم نے اپنے بزرگوں سے بھی بہت کچھ سنا تھا۔

(۳) مولوی بندہ علی خاں صاحب مرحوم کی زبانی جو کچھ سنتا آیا تھا، جو یاد رہا، زیب صفحہ کیا۔

(۴) بعض واقعات اس کتاب میں حضرت کی زندگی اور خاندان کے متعلق جناب مستطاب جامع علوم قدیم و جدید محترمی مولوی سید ہادی علی خاں جنت آرام گاہ کے بیان کیے ہوئے ہیں۔

(۵) آغا صاحب (نواب آغا علی خاں مؤلف تذکرۂ نشتر عشق) ہمارے حضرت (فریادؔ) سے تین چار برس چھوٹے تھے۔ بہتیرے حالات حضرت کے بیان فرمایا کرتے تھے۔ (تلخیص از حیات فریاد، ص ۵)

مواد کے حصول میں خلف فریادؔ مسٹر ہمایوں مرزا سے بھی شادؔ نے رجوع کیا تھا۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''آپ کو اگر اور اساتذہ کا حال معلوم ہو تو اسی کاغذ پر اضافہ کر کے جلد بھیج دیجیے۔ اب رہے طفلی سے لے کر جوانی تک کے حالات اور حضرت کے اخلاق آخر عمر تک اس کو بطور نوٹ کے آپ جلد لکھ دیجیے، تاکہ میں آٹھ دنوں میں لکھ کر فارغ ہو جاؤں۔''

شادؔ کے مکتوبات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شادؔ ''حیات فریادؔ'' کا مسودہ لکھ کر بھیجتے جاتے تھے اور ہمایوں مرزا کو اس میں حک و اضافہ کی اجازت تھی۔

''حیات فریادؔ'' کتنے ابواب پر مشتمل ہے، ذیل میں اس کا جائزہ لے رہے ہیں۔ کتاب فریادؔ کی تصویر بہ عمر شست و پنج سال سے شروع ہوتی ہے۔ ''عرض حال'' سید حسین خاں خلف شادؔ نے لکھا ہے۔ ''پیش لفظ'' علامہ سید سلیمان ندوی نے سپرد قلم کیا۔ دیباچہ میں شادؔ نے اس سوانح عمری کے مختلف اجزا پر روشنی ڈالی ہے، اور ماخذ سے بحث کی ہے، نیز اس کی ابواب بندی بھی کی ہے۔ ''حیات فریادؔ'' کل سات ابواب میں منقسم ہے:

باب اوّل : اس میں فریادؔ کے حسب و نسب اور ان کے دادیہال اور نانیہال کے حالات درج ہیں۔

باب دوم : عہد طفلی کے حالات سے لے کر جوانی کے ایام تک، نیز ہم عصر و قریب شعرا و امرا کے احوال پر مبنی ہے۔

باب سوم : مرشد آباد، کلکتہ کے سفر اور قیام کے حالات، نیز تقرر عہدہ ہائے اتالیق مرشد زادگان و سفارت و نیابت پر مشتمل ہے۔

باب چہارم : اس میں مراجعت بوطن و واقعات تا رحلت کا حال مذکور ہے۔

باب پنجم : اس میں اخلاق و عادات و مذاق طبعی و عقائد مذہبی وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔

باب ششم : اساتذہ و تلامذہ کے حالات

باب ہفتم : مقدمہ نفس شاعری اور فریادؔ کا اردو و فارسی کلام درج کیا گیا ہے اور اخیر میں ۹ رصفحات پر مشتمل خان بہادر سید احمد علی خاں کی تقریظ ہے۔ (حیات فریاد، ص: ۷)

''حیات فرؔیاد'' کا پہلا صفحہ ہی قابل اعتراض ہے، دراصل اس میں فرؔیاد کی جو ۶۵ سالہ تصویر ہے، وہ امر واقعہ یہ ہے کہ حقیقی تصویر نہیں، بلکہ صرف شاؔد کے تخیل پر مبنی ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

''حیات فریاد کا پہلا صفحہ فرؔیاد کی ۶۵ سالہ تصویر سے مزین ہے، لیکن افسوس ناک امر یہ ہے کہ اس کی بسم اللہ ہی غلط ثابت ہوتی ہے۔ درحقیقت فرؔیاد کی کوئی تصویر نہ شاؔد کے پاس تھی اور نہ کہیں سے اس کے حصول کی امید ہی تھی۔ شاؔد تصویر کے بغیر اپنی کتاب کو نامکمل سمجھتے تھے۔ نتیجہ کے طور پر اپنے شاعرانہ تخیل کی مدد سے ایک نقلی تصویر بنوائی جو اب 'حیات فرؔیاد' میں چھپی ہوئی ہے۔''

(شاؔد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری، ص ۱۰۶)

بہر حال کتاب کی ابتدا اس افسانوی طرز پر ہوئی ہے اور اس کے بعد پہلا باب شروع ہوتا ہے، جس میں فرؔیاد کے حالات نسب بیان ہوئے ہیں۔ حسب ونسب کی تفصیل میں شاؔد نے سولہ پشتوں تک کے نام دیے ہیں۔ فرؔیاد کے کون کون بزرگ ہندستان تشریف لائے، اس سلسلے میں شاؔد عظیم آبادی لکھتے ہیں:

''غالبا ۱۳۰۵ھ میں ہمارے حضرت علیل ہوکر زندگی سے مایوس ہوئے، اس وقت بنظر عیادت چند عمائدین موجود تھے۔ حضرت نے مخاطب ہوکر فرمایا۔ چھ سو برس کا چراغ جو ہندستان میں روشن چلا آتا تھا، اب بجھتا ہے۔ حضرت کے اس ارشاد کے بموجب اگر حساب کیا جائے تو ابتدا اس خاندان کے ورود کی سلطان محمد تغلق کے زمانے میں پائی جاتی ہے۔''

(شاؔد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری، ص ۱۰۹)

اس کتاب میں ایسی باتیں بھی نقل ہوگئی ہیں جن کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔ یہ سب شاؔد کے ذہن کی اپج ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

''حیرت انگیز امر یہ ہے کہ مذکورہ کتابوں کے سارے کے سارے حوالے فرضی ہیں۔ 'حیات فرؔیاد' میں نقل شدہ عبارتیں ان کتابوں سے یا تو معدوم ہیں یا سرے سے کتاب کا وجود ہی نہیں ہے۔''

(شاؔد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری، ص ۱۱۰)

قاضی عبدالودود صاحب نے بھی اس کی تائید کی ہے اور کہا ہے کہ فرضی حوالے شاؔد کے یہاں کثرت سے ملتے ہیں۔ اپنے استاد کے حالات طفلی لکھتے ہوئے شاؔد عظیم آبادی بتاتے ہیں کہ:

''ان کی رسم بسم اللہ ساتویں سال سید شاہ کمال علی نے ادا کی۔ اس کے بعد فرؔیاد پیر بیگہ چلے گئے، جہاں مولوی فرزند علی نے انھیں پڑھانا شروع کیا۔ ان کے انتقال کے بعد خود ان کے والد تعلیم دینے لگے اور 'ملا جامی' تک ان سے پڑھا۔ جب وہ بھی رحلت کر گئے تو اپنے ماموں اور نانا سے پڑھنے لگے۔ ان کے علاوہ ایک بزرگ مولوی احمد بھی انھیں پڑھایا کرتے تھے، جب فرؔیاد پندرہ سال کے تھے تو مولوی احمد نے بعض طب کی تعلیم ان کے ذمہ کردی۔ فرؔیاد ستر ہویں سال فارغ التحصیل ہوئے اور دستار بندی ہوئی۔ اس موقع پر ذی علم حضرات نے ان سے 'ملا جلال' یا 'شرح مواقف' سے متعلق مسائل پوچھے انھوں نے سبھوں کے معقول جوابات دیے۔'' (شاؔد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری، ص ۱۱۳)

فرؔیاد کی استادی کے حوالے سے پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

''شاؔد کا بیان ہے کہ فرؔیاد بحیثیت استاد بہت معروف تھے، مختلف علوم کی کتابیں پڑھنے کے لیے پچاس برس کی عمر کے لوگ ان کے پاس آیا کرتے تھے، خود ان کے استاد مولوی احمد علی صاحب کسی مسئلہ میں الجھتے تھے تو فرؔیاد سے رجوع کرتے تھے۔''

(شاؔد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری، ص ۱۱۴)

شاہ الفت حسین فرؔیاد کو بہت سے ممالک کی تاریخ ازبر تھی۔ پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

''شاؔد عظیم آبادی نے فرؔیاد کی تاریخ دانی پر بہت زور دیا ہے اور مدعی ہیں کہ انھیں اکثر ممالک کی تاریخ ازبر

تھی۔ ان کی تاریخ دانی کے مختلف واقعات انھوں نے بڑی تفصیل سے سپرد قلم کی ہے۔'' (شادؔ عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری، ص ۱۱۴)

ہندستان میں سب سے پہلے مشرقی زبان میں کس نے اخبار نکالا، اس حوالے سے شادؔ عظیم آبادی لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں سب سے پہلے مشرقی زبان میں جو اخبار نکلا وہ فریادؔ ہی کا اخبار 'آئینۂ گیتی نما' تھا، اس کے بعد بھی دو اخبار 'سلطان الاخبار' اور 'دور بین' فریادؔ کے مشورے سے نکلے۔'' (شادؔ عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری، ص ۱۱۷)

شادؔ نے اپنے استاد کے بارے میں مختلف واقعات نقل کیے ہیں، انھیں میں سے ایک یہ حادثہ بھی ہے جو شادؔ نے لکھا ہے:

''کلکتہ میں خواجہ عمر شاہ شہرتؔ نے فریادؔ کا اردو دیوان نقل کے لیے لیا اور ہمیشہ کے لیے ہضم کر بیٹھے۔'' (ایضاً، ص ۱۱۸)

شادؔ عظیم آبادی نے جگہ جگہ واقعات میں اختراع سے کام لیا ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی بھی لکھتے ہیں:

''حیات فریادؔ کا مفصل تنقیدی جائزہ جو اوپر ہوا، اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ شادؔ فریادؔ سے متعلق احوال و آثار کی بحث میں ہمیشہ ملحوظ رکھتے ہیں کہ انھیں ایک منفرد اور ممتاز حیثیت سے پیش کیا جائے، ہیرو پرستی کی ایسی مثال سوانح عمری کی تاریخ میں شاید نہیں ملے گی۔''

(شادؔ عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری، ص ۱۳۱)

مزید لکھتے ہیں:

''شادؔ کو اس بات کا احساس تھا کہ ان کے سوا ان کے استاذ کا کمال دکھانے والا کوئی نہیں۔ یہ احساس اپنی جگہ درست ہے کہ شادؔ نے ان کے کمالات کے مظاہرے کے لیے (جیسے) اختراعی واقعات سے کام لیا ہے، وہ کسی اور کے بس کی چیز نہیں تھی اور اس کی ایک اہم وجہ ہمایوں مرزا سے مالی اعانت کی توقع تھی۔ محمد حسین آزاد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے 'آب حیات' میں خیالات کے طوطا، مینا اڑائے ہیں، لیکن اس معاملے میں آزاد، شادؔ کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔'' (ایضاً، ص ۱۳۲)

شادؔ کی دوسری سوانح عمری، خود ان کی آپ بیتی ہے جس کا نام ہے ''شادؔ کی کہانی شادؔ کی زبانی''، یہ خودنوشت سوانح حیات صیغۂ غائب میں ہے۔ شادؔ نے یہ آپ بیتی اپنے شاگرد مسلم عظیم آبادی کی طرف سے لکھی ہے۔ یہ خودنوشت سوانح عمری ۱۹۲۱ء میں مرتب ہوگئی تھی، مگر یہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی نگرانی میں معارف پریس اعظم گڑھ سے ۱۹۶۱ء میں چھپی۔ دراصل شادؔ عظیم آبادی نے خود یہ وصیت کی تھی کہ ان کی سوانح عمری ان کے مرنے کے بعد شائع کی جائے۔ اس کا پتہ ایک خط سے چلتا ہے، جس میں یہ لکھا ہے:

''میں نے اپنی سوانح عمری ۳۰ جزو لکھ کر اپنے ایک قابل شاگرد کو سپرد کر دی ہے اور وصیت کر دی ہے کہ میرے مرنے کے بعد ضرور (اسے) چھپوا کر عبرت کے لیے مشتہر کرنا۔'' (بہار میں سوانح نگاری کا آغاز و ارتقا، ص ۱۲۸)

شادؔ نے اپنی آپ بیتی کا نام ''کمال عمر'' رکھا تھا، لیکن اس کے مرتب پروفیسر مسلم عظیم آبادی نے اس کا عنوان ''شادؔ کی کہانی شادؔ کی زبانی'' کر دیا۔ اس کی تفصیل وہ ابتدا میں ہی اس طرح بیان کرتے ہیں:

''حضرت استاد خان بہادر سید علی محمد شادؔ مغفور عظیم آبادی کی یہ آپ بیتی کہانی بھی، اپنی ایک کہانی رکھتی ہے، جس کے بیان سے ان کی سیرت کے ایک پہلو پر روشنی پڑتی ہے..... استاذ مرحوم کو دو آرزو (کذا) نے زندگی بھر بے چین رکھا۔ ایک تو یہ کہ ان کا دیوان کامل صحت اور بہترین کتابت و طباعت کے ساتھ شائع ہو جاتا۔ دوسرے یہ کہ ان کے سوانح حیات، ان کی حیات میں مرتب ہو جاتے۔'' (شادؔ کی کہانی شادؔ کی زبانی، ص ۱)

شادؔ کے کئی شاگرد تھے جو اس خدمت یعنی سوانح نگاری کے کام کو انجام دے سکتے تھے، ان میں شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی، مگر ان میں سے کوئی شادؔ کو نہ جچا، مسلم عظیم آبادی لکھتے ہیں:

''میرے کچھ مضامین 'الناظر' اور 'جامعہ' وغیرہ میں ملاحظہ

فرما کر استاد نے مجھ ہی کو اس خدمت کے لیے تاکا اور قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند۔ متعدد شجرات حسب و نسب، پروانے، لکچر نوٹوں کے پوٹ میرے حوالے کیے اور انھی کے مرتب کیے ہوئے منصوبے کے مطابق میں نے اپنی بساط بھر پوری محنت و کاوش سے سوانح عمری کا ایک مسودہ مرتب کیا، آپ نے نظر ثانی کے بعد اپنے ہاتھ سے بہت سارے اضافے کیے، پھر بھی تسکین نہ ہوئی۔ ان کی آرزو یہ تھی کہ ان کے آباؤ اجداد، دادا دادی، نانا نانی، چاروں کے کامل شجرے، خاندانی و تاریخی حالات اس صراحت سے مذکور ہوں جیسی انھوں نے لکھ رکھی تھیں، پھر اپنی ریاست کی شان و شوکت، حکام رسی، وفاداری، سیاسی اور سماجی کارگزاریاں، میونسپل بورڈ اور ٹیکسٹ بک کمیٹی کی ممبری، کورٹ آف وارڈ کی مہتممی، آنریری مجسٹریٹی، خان بہادری اور حکام انگریزی کی قدر افزائی، تحسین و سندات کا بیان بالتصریح ہو۔ میں ایک اعلی درجے کے شاعر اور ادیب کے لیے یہ تصریحات لایعنی سمجھتا تھا۔'' (ایضاً، ص ۳)

''خلاصہ یہ کہ میں نے سوانح کے کئی نسخے مرتب کیے، مگران کی تشفی نہ ہوئی۔ آخر ۱۹۲۱ء کے لگ بھگ سید صاحب نے خود ایک مبسوط سوانح حیات میری طرف سے صیغۂ غائب میں لکھ کر اس کا نام 'کمال عمر' رکھا اور یہ غیر صاف شدہ مسودہ سینکڑوں صفحوں پر محیط میرے حوالے کر دیا۔ مجھے بڑا سکون و اطمینان ہوا کہ ایک بڑی مشکل حل ہوگئی۔'' (ایضاً، ص ۴)

شاؔد نے اس کتاب کا نام 'کمال عمر' رکھا تھا، مگر مسلم عظیم آبادی کو اس نام میں انتقال ذہنی کا وصف نظر نہ آیا، اس لیے انھوں نے اس کا نام ''شاؔد کی کہانی شاؔد کی زبانی'' رکھ دیا۔ وہ خود لکھتے ہیں:

''مجھے اس نام میں اصل موضوع کی طرف انتقال ذہنی کی صفت نظر نہ آئی، اس لیے میں نے 'شاؔد کی کہانی شاؔد کی زبانی' کے نام سے موسوم کیا۔'' (ایضاً، ص ۵)

مرتب کتاب یعنی مسلم عظیم آبادی نے اس میں جا بجا تصرفات بھی کیے ہیں، وہ خود لکھتے ہیں:

''سید صاحب نے یہ سرگذشت قلم برداشتہ لکھی ہے اور تسامح، سہو اور ترتیب کی پراگندگی سے خالی نہیں، اس لیے میں نے کہیں کہیں کسی ابہام کی حاشیہ میں تشریح کر دی، بعض فصلوں میں بلحاظ ربط کلام تقدیم و تاخیر کر دی، اگر چہ ذیلی سرخیوں کا اضافہ کر دیا، متن میں کسی فقرہ کا اضافہ یا رد و بدل جائز نہیں رکھا، اگر چہ بعض الفاظ کی صحت میں مجھے شبہ ہے۔'' (ایضاً، ص ۵)

اس آپ بیتی میں جو موضوعات زیر بحث آئے ہیں، وہ اس طرح ہیں:

''سال ولادت، خاندان، بزرگوں کا وطن، تعلیم و تربیت، حلیہ، لباس، سفر، اعزہ، تصنیف کا فطری ذوق، زبان دانی، شعر گوئی کا طبعی شوق، مشق سخن میں انہماک و محنت، بیماریاں، شعر گوئی کا آغاز، اصلاح غزل، مشاعروں میں شرکت، اساتذۂ وقت کی دادخواہی، مخالفت کا آغاز، میر مونسؔ، میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ کی صحبتیں اور واقعات، سیاسی زندگی، 'نوائے وطن' پر ہنگامہ، مشاعروں اور معرکوں میں کامیابی، مجالس عزا میں مرثیہ خوانی، مشاہیر اساتذہ کی مداحی، طریقہ اصلاح تلامذہ، تصنیفات نظم و نثر کی فہرست، غزلیات، رباعیات، قطعات اور مثنویات پر تبصرہ، مراثی و مولود پر ریویو، مرثیوں کے مضامین و دیگر مسدسات کا تفصیلی جائزہ۔''

کہانی کا پہلا باب سنہ ولادت و خاندان آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ شاؔد خود اپنی تاریخ پیدائش کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''نوازدہم محرم الحرام ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۶ء کو شہر عظیم آباد پٹنہ محلّہ پورب دروازہ اپنے نانیہال میں پیدا ہوئے۔ پانچ سال کی عمر تک اپنے نانیہال میں رہے اور پانچ سال کے کچھ پہلے مکتب ہوا۔'' (ایضاً، ص ۱۳۳)

شاؔد نے اپنے خانوادہ کے علمی پس منظر اور خوش حالی کے تذکرہ کے بعد اپنا شجرۂ نسب پیش کیا ہے، مگر اس شجرہ میں کچھ نام ایسے ہیں جن کا کہیں اور سراغ نہیں ملتا۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ بھی شاؔد کی من گھڑت داستان ہے۔ شاؔد نے اپنا جو نسب نامہ درج کیا ہے، اس میں بہت تسامح ہوا ہے۔ کچھ نام ایسے ہیں جن کا تذکرہ اس کتاب کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتا۔ شاؔد نے اپنے نسب نامے میں دو بادشاہ حسین فیروزی بادشاہ شیراز اور کبیر المشائخ بادشاہ ہرات کا ذکر کیا ہے، اس حوالے سے کافی چھان بین کے بعد قاضی عبدالودود نے ثابت کیا ہے کہ:

''حسین فیروزی نام کا کوئی بادشاہ کسی جگہ اور کسی زمانے میں نہیں ہوا اور نہ ہی کبیر المشائخ کا نام کسی تاریخ کی کتاب ملتا ہے۔'' (شاؔد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری، ص ۱۳۵)

اسی طرح ان کے نسب میں سید پہاڑی کا بھی ذکر آیا ہے جس کے متعلق قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

''سید پہاڑی کا نام کہانی صفحہ ۱۴ کے سوا اس کتاب میں (دوسری جگہ) یا کہیں اور نہیں ملتا۔''

(بہار میں سوانح نگاری کا آغاز وارتقا، ص ۱۳۰)

شاؔد نے اس کتاب میں بعض ایسی باتیں بھی لکھی ہیں جو ان کی دوسری تصانیف میں لکھی گئی باتوں سے متصادم ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے ان تضادات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے، لکھتے ہیں:

''اس کتاب میں شاؔد نے لکھا ہے کہ مرزا دبیرؔ و میر انیسؔ ۱۲۷۸ھ میں عظیم آباد آئے جب کہ 'فکر بلیغ' حصہ دوم میں ۱۲۸۱ھ درج کیا ہے کہ 'وہ پہلا مشاعرہ جس میں شاؔد شریک ہوئے اس کی تفصیل اس آپ بیتی میں ہے۔ اس واقعہ کو شاؔد نے 'حیات فرؔیاد' میں بھی لکھا ہے لیکن دونوں بیانات میں بہت فرق ہے۔''

(بہار میں سوانح نگاری کا آغاز وارتقا، ص ۱۳۱)

شاؔد نے شجرۂ نسب کا ذکر کرنے کے بعد اپنے بزرگوں اور اہل قرابت پر بھی روشنی ڈالی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان کے والد سید عباس مرزا نیک نہاد، متقی خلیق و رئیس تھے۔ ان کے حقیقی بھائی سید امیر حسن خاں ایجاؔد صاحب استعداد تھے، مگر قریبی رشتہ داروں کے تذکرہ کے بعد شاؔد نے اپنے گھر کے آداب دسترخوان کی تفصیلی تصویر کھینچی ہے، پھر ابتدائی تعلیم کے احوال رقم کیے ہیں اور عہد طفلی کے اساتذہ کرام کے نام لکھے ہیں۔ اپنی شاعری کی ابتدا پر لکھتے ہوئے شاؔد بتاتے ہیں کہ:

''جب وہ پانچ چھ برس کے تھے کہ طبیعت رنگ دکھانے لگی۔ اکثر اردو کے اشعار (وہ) بہت جلد یاد کر لیتے تھے۔'' (شاؔد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری، ص ۱۳۷)

مزید لکھتے ہیں:

''شعر و سخن کی محفلوں میں انھیں بیٹھنے کا بچپن ہی سے شوق تھا، لیکن ان کے والد یہ نہ چاہتے تھے کہ شاؔد شاعر ہوں۔ وہ انھیں دینیات پڑھنے کے لیے عراق و عرب بھیجنا چاہتے تھے، لیکن شاعرانہ ذوق فطری تھا اس لیے 'شرح ملا جامی' پڑھتے ہوئے حاصل و محصول کی بحث کو اردو میں نظم کر دیا تھا۔'' (ایضاً، ص ۱۳۹)

شاؔد اپنے تلامذہ کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ انھیں اس بات کا شکوہ رہا کہ اساتذہ سے طلبہ کی وہ محبت عنقا ہے جو پچھلے وقتوں کے تلامذہ کا طرۂ امتیاز تھی۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کے بعض شاگردوں نے یہ جرأت کی کہ ان کا کلام پڑھ پڑھ کر استاد بن بیٹھے۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں:

''۱۸۷۴ء میں 'صبح صادق' پریس سے اخبار 'نسیم سحر' (ہفتہ وار) نکلنے لگا۔ وہ اس کے اعزازی ایڈیٹر تھے۔ اخبار مذکور سات برس تک نکلتا رہا، لیکن شاؔد نے اس میں لکھنا چھوڑ دیا تو اخبار بند ہو گیا۔'' (ایضاً، ص ۱۴۲)

شاؔد نے یہ بھی لکھا ہے اور اس پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ شوق شاعری میں اپنا سب کچھ قربان کر بیٹھے اور اپنے بچوں کے لیے کچھ نہ کر سکے۔ پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

''شاؔد نے اس امر کا اظہار تاسف کے ساتھ کیا ہے کہ شوق شاعری اور تصنیف و تالیف نے انھیں اتنی مہلت نہ دی (کہ) اپنے جلب منفعت و ازدیاد معیشت کی طرف توجہ کر سکیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کے لیے

کچھ بھی نہ کر سکے۔'' (ایضاً،ص۱۴۳)

اپنے ایک سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دسمبر۱۸۸۹ء میں سید صاحب کو دہلی کا سفر درپیش ہوا تو خواجہ الطاف حسین صاحب کے فرمانے سے واپس ہوتے ہوئے علی گڈھ کالج میں سرسید احمد خاں مرحوم کے دو دن مہمان رہے۔ بورڈنگ ہاؤس کو دیکھتے وقت سید صاحب نے دس منٹ میں بیس پچیس رباعیاں نظم کر کے خواجہ الطاف حسین حالی صاحب کو دکھائیں، انہوں نے بشوق تمام سید صاحب سے لے لیں اور سرسید مرحوم کے ہاتھ میں دے دیں۔ سرسید ان رباعیوں کو پڑھ کر ایسے خوش ہوئے کہ چہرہ سرخ ہو گیا اور 'علی گڈھ گزٹ' میں اس کو چھاپا۔'' (ایضاً،ص۱۴۴)

شآد کی کہانی شاد کی زبانی کے مشتملات کا جائزہ لیتے ہوئے قاضی عبد الودود صاحب لکھتے ہیں:

''اس کتاب میں خاندانی و ذاتی حالات اور تصانیف کا بیان ص:۱۲ تا ص:۱۰۳ ہوا ہے۔ جس وقت یہ کتاب قلم بند ہوئی تھی، شآد ۷۵ برس کے تھے۔ انھوں نے جس قسم کی زندگی بسر کی تھی اس کے پیش نظر حالات کے کم از کم تین سو صفحے ہوتے تھے۔ ص:۱۰۴ سے ص:۲۴۴ تک شآد کی شاعری کی تنقید ہے جس میں ضمنی طور پر کہیں کہیں کلام کی شان نزول بھی آ گئی ہے۔ اس میں ص:۱۳۹ تا ص:۱۵۱ مختصر تاریخ واقعات کربلا ہے جس کی اس کتاب میں مطلق ضرورت نہ تھی۔ کہانی میں شخصیت کا انکشاف محض جزوی طور پر ہوا ہے۔ اس کے کل پہلو نمایاں نہ ہو سکے، مگر شآد کی شخصیت کے متعلق کچھ نتائج مصنف کی مرضی کے خلاف نکالے جا سکتے ہیں، مطالب کی ترتیب معقول نہیں۔ اس میں ضروری باتیں نہیں اور غیر ضروری موجود ہیں۔ تاریخی اور فنی (آرٹسٹ) دونوں نقطہ ہائے نظر سے یہ کتاب نا کامیاب ہے اور شآد سے نغز گو شاعر کے شایان شان نہیں، مگر ان اسقام کے باوجود شآد سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔'' (ایضاً،ص۱۴۷)

اور ڈاکٹر عبدالواسع لکھتے ہیں:

''بہر حال ان متنازع امور سے قطع نظر 'شآد کی کہانی شآد کی زبانی' شآد عظیم آبادی کی زندگی کے بہت سے گوشوں کو روشن کرتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ حقائق کی پردہ پوشی کی وجہ سے ان کی زندگی کے بعض معاملات اور بھی الجھ گئے ہیں، لیکن یہ سچ ہے کہ شآد کے زمانے کی بہت سی ادبی، سماجی، سیاسی اور ثقافتی تحریکات کا اندراج اس کتاب میں کسی نہ کسی طور ہو گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب نا کام نہیں ہے اور بہت سے اسقام کے باوجود شآد سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔'' (بہار میں سوانح نگاری کا آغاز وارتقا،ص۱۳۴)

خلاصہ یہ کہ شآد کی سوانح نگاری کا پہلو دیگر اصناف کے مقابلے میں کمزور ہے۔ انھوں نے ان دونوں کتابوں پر کافی وقت تو لگایا، کئی نسخے تیار کیے، مگر ادب کے ایک قاری کے لیے اس میں معتبر و مستند مواد موجود نہیں ہے۔ شآد عظیم آبادی اپنے عہد کے ایک کامیاب سوانح نگار کہے جا سکتے ہیں، مگر ان کا مقام و مرتبہ حالی و شبلی کے برابر نہیں۔ حالی اور شبلی فن سوانح نگاری کے امام ہیں، شآد اس رتبے کو نہیں پہنچ سکے۔ ان کی دونوں کتابیں دلچسپ ضرور ہیں، مگر وہ سوانح نگاری کے اصول وضوابط پر سو فی صد کھری نہیں اترتیں۔ اس کے باوجود انھیں ایک کامیاب سوانح نگار قرار دیا جا سکتا ہے، جس کا اندازہ ان دونوں سوانحی تصنیفات کے مطالعہ سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ ❁❁

☆ انسان کی سمجھ داری یہ ہے کہ وہ ہمیشہ کفایت شعار ہو
☆ عبرت پزیری انسان کی سب سے بڑی عقلمندی کا نام ہے
☆ بنی نوع انسان سے محبت کرنا اصل میں خدا سے محبت کرنا ہے
☆ اخلاص یہ ہے کہ اعمال کا عوض مطلوب نہ ہو

عبدالرزاق رضوی
Jama masjid, Gulzarbagh, Patna City (Mob.9835265943)

حاذقِ فن حاذقؔ انصاری

حاذقؔ انصاری (۱۹۳۰ء۔۱۹۷۶ء) کا نام ادبی دنیا میں زبان زد نہیں تو کم از کم غیر معروف بھی نہیں ہے۔ ان کا کلام ملک کے ممتاز ادبی رسالوں اور جریدوں میں اکثر شائع ہوتا رہا اور اپنے دور کے شعرا و ناقدین سے خراج داد و تحسین حاصل کرتا رہا ہے۔ خصوصاً بنگال کی جدید نسلوں کے نمائندہ شعرا میں انہیں درجہ امتیاز حاصل ہے۔

حاذقؔ انصاری کی پیدائش دریائے ہگلی کے شہرہ آفاق شہر ہوڑہ کے محلّہ فیل خانہ میں ۱۹۳۰ء میں ہوئی۔ اصلی نام محمد یونس تخلص حاذقؔ، ولدیت محمد معین الدین اور آبائی وطن جونپور یوپی ہے۔ جس کی خاک نے حفیظؔ جونپوری اور شفیقؔ جونپوری جیسی نابغہ روزگار شخصیتوں کو جنم دیا۔ حاذقؔ نے یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر جب ہوڑہ منتقل ہوئے تو عصری تعلیم کے لئے مسلم ہائی اسکول پھر ایم ایل جوبلی انسٹی ٹیوشن ہوڑہ میں داخلہ لیا۔ وطن اصلی سے منتقلی کے پیچھے کون سا سبب کار فرما تھا یہ اب تک معلوم نہ ہوسکا۔ اس کے پیچھے خاندان کا معاشی اضطراب بھی ہوسکتا ہے اور آزادی کے سہانے خواب کی وہ دل شکن تعبیر بھی، جس میں وطن کے پیارے بچھڑ بچھڑ کر نہ جانے کیسی کیسی اجنبی گودوں کو آباد کرنے پر مجبور ہوئے۔

حاذقؔ صاحب میٹرک کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد گیسوئے ہستی کو شانہ دینے میں مصروف ہو گئے، لیکن انسان کب اپنی فطری صلاحیتوں سے بغاوت کرتا ہے۔ ان کی طبیعت نے بھی بہت جلد شعر و سخن کی طرف رجوع کرلیا۔ یوں تو انہوں نے نثر نگاری بھی کی اور ادبی تنقیدی اور سماجی مضامین بھی سپرد قلم کئے، افسانے بھی لکھے اور ہندی کہانیوں کے تراجم بھی پیش کئے، طویل سیاسی مراسلے بھی لکھے، فلمی تبصرے بھی تحریر کئے اور کئی ادبی اداروں کی بے لوث خدمت و تربیت بھی کی۔ ''انکشاف'' نامی ادبی جریدہ جاری کرنے کا تجربہ بھی کیا اور بچوں کی کہانیوں کا ایک مجموعہ ''فردوسی'' کے نام سے پہلی مرتبہ کتابی شکل میں نکالا اور اس طرح جہان ہستی سے پرے سماج و ادب کے نہ جانے کتنے سوتے ان کے سرچشمہ ذات سے جا ملتے ہیں۔

حاذقؔ صاحب واقعی اپنے دور کے حاذق فن ہیں، کیوں کہ ان کو شاعری کا وطیرہ اور سلیقہ آتا ہے۔ موضوع کے تقاضے دیکھتے ہوئے مختلف اصناف کو برتنے کا وطیرہ اور اپنے تجربات کو دانائی اور فنی مہارت کے ساتھ پیش کرنے کا سلیقہ۔ کسے خبر تھی کہ وہ باسلیقہ گفتگو کرتے ہوئے اپنی زندگی کی پانچ دہائیاں بھی مکمل نہ کر پائیں گے قضا ان کی زبان پر مہر لگا دے گی، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جانے والے چلے جاتے ہیں، مگر کچھ ایسے کارنامے بھی چھوڑ جاتے ہیں جنہیں موت کے بے رحم ہاتھ مٹانے کی قدرت نہیں رکھتے۔ مشہور انگریزی شاعر ''کیٹس''، عین عالم شباب میں اس دار فانی سے رخصت ہو گیا، لیکن اپنے پیچھے ایسی شاعری کے نمونے چھوڑ گیا جس پر آج بھی انگریزی شاعری فخر کرتی ہے۔

حاذقؔ صاحب بھی جلد اس سرائے فانی سے کوچ کر گئے اور ستم بالائے ستم یہ کہ اپنی مختصر زندگی میں شاعری کا جو سرمایہ انہوں نے اکٹھا کیا تھا اس میں سے بھی بہت کچھ ضائع ہو گیا، لیکن اجزائے حسن تو ذرات میں بھی دستیاب ہوتے ہیں اور زندگی کے چھوٹے چھوٹے حصے کی تکمیل سے زندگی کی تکمیل کا وجدان ملتا ہے، پھر حاذقؔ کا جو بھی کلام دستیاب ہے اس کی خوبیوں اور اس کے محاسن کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے، وہ کسی خوبصورت خیال کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ شعری جامہ پہنانے کا انمول ہنر رکھتے ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ غلط نہیں ہے ؎

تیرے شعروں سے عیاں ہے حاذقؔ
اک سخن دانِ خوش بیاں کا خیال

زارؔ عظیم آبادی نے کہا تھا۔

ادھر بھی اک نظر او قدردان تازہ بازاری
پرانی صنف کا سوداگر جنس ہنر ہوں میں

حاذقؔ صاحب بھی جنس ہنر کے ایسے سوداگر ہیں کہ نئے خریدار بھی ان چیزوں پر نگاہ ڈالے بنا نہیں گزر سکتے۔ ہر چند حاذقؔ کی شاعری روایتی ہے ،لیکن یہ بے نمک کی کھچڑی نہیں، اس میں ایک لذت ہے اور مشاہدات وتجربات اور واردات کی آمیزش نے اسے اور بھی مزیدار بنا دیا ہے۔ان کی شاعری ان کی ذات کی طرح پرخلوص ہے اور تصنع وریا سے مبرا۔ بے جا صنائع و بدائع ،آورد اور مشکل پسندی ان کے کلام میں کہیں نہیں ملتی۔ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے جو دیکھا اور محسوس کیا ہے اسے بڑی سادگی کے ساتھ شعر کے پیکر میں ڈھال دیا ہے،لیکن اس طرح کہ سادگی کہیں سپاٹ پن میں نہیں بدلی ہے اور شعریت کا حسن کہیں مجروح نہیں ہوا ہے۔زبان و بیان میں کہیں جھول نہیں اور ہو بھی کیسے جب آرزو لکھنوی جیسے باکمال استاد نے اس کے نوک پلک درست کئے ہوں۔

حاذقؔ صاحب کی شاعری بنیادی طور پر قدیمی رنگ لئے ہوئے ہے،لیکن اس میں جدید رنگ کا امتزاج بھی ہے جس نے اسے گنگا جمنی بنا دیا ہے۔ یہاں دہلی کی داخلیت بھی اور لکھنؤ کی خارجیت بھی ہے، واردات قلبی کا بیان بھی ہے اور معشوق ستم گر کے حسن کا ظاہری جلوہ بھی، عشق ومحبت کے رموز بھی ہیں اور تصوف وفلسفہ کا رنگ بھی یہاں زندگی کی بے اعتنائیوں کا گلہ اور غم بھی ہے اور غم میں خوشی کا کئی پہلو نکالنے کی کوشش بھی۔انسان کے بگڑے ہوئے اعمال سنوارنے کا نیک مشورہ بھی ہے اور لذت فاقہ کشی کا اظہار بھی۔حسن والوں کی سادہ مزاجی بھی ہے اور ان کی بے رخی و بے نیازی بھی۔مزید برآں دھرتی کا سونا اُگلنا اور کسانوں کے بھاگ کا نہ جاگنا نئے انقلاب کی آمد کا اندیشہ اور آنکھوں کا اس خطرے سے خونبار ہونا۔مفلسی کے عذاب میں گھر کر زندگی کا نامعتبر ہو جانا نئے دور میں مزاج انساں کا برہم ہونا غرض کہ بہت سارے جدید اور ترقی پسندانہ خیالات بھی حاذقؔ کی شاعری میں اپنے قاری کو دعوت توجہ دیتے ہیں۔

جہاں تک زبان و بیان کی صفائی، سلاست کا تعلق ہے شاید ہی کوئی باذوق شخص ان اشعار کی فصاحت سے انکار کر سکے۔

غریبوں کی عیادت کے لئے جو آپ آئے ہیں
کرم ہے، مہربانی ہے، نوازش ہے، عنایت ہے

آنے بھی دو گلشن میں ، وہ پیغام بہاراں
دامن نہ رہیں گے یہ گریباں نہ رہیں گے

ابھی چمن کو ضرورت مرے لہو کی ہے
ترس رہا ہے ہر اک پھول تازگی کے لئے

اے غم عشق بتاں اتنی تو مہلت دے دے
چھیڑ کرلوں میں ذرا گردش ایام کے ساتھ

حاذقؔ کے تغزل کا رنگ بڑا دل نشیں و پر اثر ہے جس سے نفاست و پاکیزگی اور بصیرت و سادگی کی لذت پھوٹتی ہے، ان کی غزلوں میں انتہائی پختگی وارفتگی، ہمک، لطافت اور نشاط و کیف کے خوش رنگ جلوے موجزن ہیں، جن کو سچے واردات واحساسات اور پرخلوص جذبات نے اور بھی پر کیف و سرور انگیز بنا دیا ہے، ان کے احساس میں سنجیدگی ملتی ہے۔وہ کہیں بھی غیر متوازن نظر نہیں آتے۔نہ افکار و جذبات میں اور نہ اسلوب بیان میں۔یہی وہ نمایاں خصوصیات ہیں جو حاذقؔ کو اساتذہ کی فہرست میں شمولیت کا جواز فراہم کرتی ہیں۔سالکؔ لکھنوی نے ان کے شعری اختصاص کو اپنے لفظوں میں یوں بیان کیا ہے:

''حاذقؔ انصاری مرحوم ایک سادہ لوح بے ریا اور نیک دل انساں تھے۔ان کے کلام میں بھی وہی سادہ لوحی، بے ریائی اور نیک دلی ملتی ہے، جس سے ان کی زندگی عبارت تھی، انہوں نے اپنی شاعری میں آسمان کے تارے نہیں توڑے، انقلابی نعرے نہیں لگائے، بے جہت الفاظ کے گورکھ دھندوں سے کام نہیں لیا، جو محسوس کیا اسے کہنے کی کوشش کی۔قدیم وجدید شعرا میں سے وہ کسی سے متاثر نظر نہیں آتے حتیٰ کہ اپنے استاد شکیلؔ بدایونی کا عکس بھی ان پر پڑتا نظر نہیں آتا۔ان کا کلام ایک ایسا آئینہ ہے جس میں 'بس وہ نظر آتے ہیں کوئی دوسرا نہیں۔'عشق ومعشوق، جفا و وفا مایوسی ومحرومی، خدا و

خودی، دوستی و دشمنی، آرام و آلام، ویرانے اور دیوانے
اور مے خانے یہ سب اوران کے علاوہ بہت کچھ جو ہے
وہ سب ان کے اپنے ہیں کہیں بہت پرانے نظر آتے
ہیں، کہیں بالکل نئے۔ یہ سب جس شکل میں جس رنگ
میں جس حال میں بھی ہوں، ہیں ان کے اپنے۔''

دوسرے تمام کلاسیکل شعرا کی طرح حاذقؔ کے یہاں بھی عشقیہ، عارفانہؔ متصوفانہ، فلسفیانہ، اخلاقی، سماجی اور سیاسی ہر طرح کے اشعار ملتے ہیں اور فکر وفن کی ہر سطح پر شعریت کا دامن بے داغ نظر آتا ہے، ان کے عشقیہ جذبات بڑے لطیف وشیریں ہیں، ان میں نہ تو قنوطیت وفراریت ہے اور نہ ابتذال وپستی، نہ تو تھکا دینے والی یکسانیت، سطحیت اور بے رنگی ہے اور نہ سرمستی و بے خبری کا سا انداز، حتیٰ کہ ان کے خارجی رنگ کے اشعار میں بھی نیم بالغ اور شوقیانہ جذبے نہیں ملتے، واضح طور پر انہوں نے دہلی اور لکھنو دونوں دبستانوں کی بہترین قدروں کو جذب کیا ہے۔ ان کے یہاں اگر چہ درد وسوز کی وہ تیز دھار نہیں ملتی جو دہلی دبستان کے اکثر شعرا کا خاصہ ہے۔ شوخی وطرح داری کا وہ چوکھا رنگ نہیں ملتا جو لکھنوی دبستان کی خصوصیت میں شامل ہے اور ساتھ ہی وہ زور، صفائی سلاست وروانی اور برجستگی بھی ہے جو کسی بھی لکھنوی شاعر کے لئے باعث رشک ہوسکتی ہے۔ اس پر مزید حاذقؔ نے اصغر گونڈوی سے اپنی عروس سخن کے لئے نفاست پاکیزگی اور رعنائی وشگفتگی کا غازہ مستعار لے لیا ہے اور اس طرح گویا ان کی شاعری دو آتشہ نہیں سہ آتشہ بن گئی ہے۔ ذرا تصور کیجئے اگر کوئی بزم سخن آراستہ ہوتی اور اصغرؔ گونڈوی اور ان کی دبستان کے خوشہ چینوں کی موجودگی میں حاذقؔ صاحب ان شعروں کے ساتھ غزل سرائی کررہے ہوتے تو کیف ونشاط کا کیا عالم ہوتا اور خود اصغرؔ مرحوم کس کمال وارفتگی کے ساتھ ان پر داد وتحسین کی گلباری کررہے ہوتے۔

ترے حسن کے شرارے یہی کہہ رہے ہیں اڑ کر
ترے پردہ حسیں میں کہیں آگ لگ نہ جائے

وہ سامنے ہیں، مگر پھر بھی بے قرار ہوں میں
خوشی کے وقت بھی حیرت ہے اشکبار ہوں میں

کبھی حضور کے دامن تک آہی جاؤں گا
نہ بھولیں آپ مجھے خاک رہ گزار ہوں میں

ہم نے وفورِ شوق میں رکھا ہے سر کہاں
یہ بھی خبر نہیں ہے ترا سنگ در کہاں

میری وارفتگی شوق کا ہے یہ انعام
کہ میرا نام بھی آتا ہے تیرے نام کے ساتھ

کوئی پہلو خوشی کا نہ کیوں ڈھونڈ لیں
ہم بھی ہیں غمزدہ آپ بھی غمزدہ

امیدوں کی ادھر نبضیں ہماری ڈوبی جاتی ہیں
تمہارے حسن دلکش کو پریشاں کون دیکھے گا

موخر الذکر بحر اور ردیف وقافیہ میں میرے استاد گرامی جناب شفیع احمد فاطمی عظیم آبادی مرحوم نے بھی خوب کہا ہے۔ ذرا زبان و بیان کی بھرپور سادگی ملاحظہ کیجئے۔

اگر تم بھی نہ دیکھو گے تغافل اس سے برتو گے
تم ہی سوچو مراحال پریشاں کون دیکھے گا

اور زارؔ عظیم آبادی نے تو اس مضمون کا خاتمہ ہی کردیا۔

خدارا درد کا میرے اثر تم بھی نہ لے لینا
یہ ہنس ہنس کر میرا حال پریشاں کون دیکھے گا

اسی شعری زمین سے وابستہ مجھے ایک ادبی واقعہ یاد آرہا ہے جس کا سننا دلچسپی سے خالی نہیں، کیوں کہ اس سے دو بڑے شعرا کی ذہنی روش اور فکری پرواز کا سراغ ملتا ہے اور بڑے شاعر کی بداہت وبرجستگی کا بھی پتہ

چلتا ہے۔ ہوشؔ عظیم آبادی اور زارؔ عظیم آبادی دونوں بڑے گہرے دوست تھے۔اس دوستی کا دونوں نے آخری سانس تک خیال رکھا۔

ایک مرتبہ ہوشؔ صاحب علی الصباح استاذ فاطمی صاحب کے یہاں چائے نوشی کے لئے تشریف لائے تو نہایت خوشی ومسرت اور گرم جوشی کے ساتھ انہوں نے اپنے جگری دوست زارؔ عظیم آبادی کی تازہ غزل سنائی، جب وہ اس شعر ؎

غنیمت ہے شب غم نیند اُڑ جاتی ہے آنکھوں سے
سحر تک سینکڑوں خواب پریشاں کون دیکھے گا

پر پہنچے تو فاطمی صاحب نے کہا ہوش صاحب! یہ شعر آداب عشق کے خلاف ہے۔اس میں شاعر اپنے معشوق کے خواب پریشاں سے گریزاں نظر آتا ہے۔ بات کچھ بنی نہیں۔ہوشؔ صاحب نے کہا تو پھر آپ ہی کہیے تو انہوں نے کہا میں ہوتا تو یوں کہتا اور فی البدیہہ شعر کہا ؎

ہماری نیند پر کیوں شام ہجراں طنز کرتی ہے
جو ہم جاگے رہے خواب پریشاں کون دیکھے گا

بہر حال شان تغزل کی روشنی میں حاذقؔ کی غزلوں کے کچھ نمایاں اوصاف بیان کئے گئے جو اوپر گزرے۔اب آگے بڑھنے سے پہلے ان کے داخلیت اور خارجیت بداماں بعض دلکش وموثر اشعار مزید حاضر ہیں، جو ان کے فکر وفن اور مذاق شاعری کا آسان پتہ دیتے ہیں ؎

وفا کی آگ جو اس قلب سوگوار میں ہے
جلن اسی کی مری چشم اشکبار میں ہے
اسے بھی ہونا ہے اک دن اداس میری طرح
جو ہمکنار مسرت بھری بہار میں ہے

یہ کس مقام پہ پہنچا دیا محبت نے
یقیں یقیں نہ رہا اور گماں گماں نہ رہا
تمہارے عشق میں طے کرلی ہم نے ہر منزل
علاوہ موت کے اب کوئی امتحان نہ رہا

پوچھا کسی نے جب مرا حال دل تباہ
بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکل پڑے
دیکھا جو راستے میں کہیں نقش پائے دوست
میری جبین شوق میں سجدے مچل پڑے

اب مذکورہ نمونوں کے دوش بدوش لگے ہاتھوں مندرجہ ذیل خارجیت بداماں خوبصورت اشعار بھی ملاحظہ کریں ؎

کسی کا روئے منور عیاں عیاں سا ہے
فلک پہ چاند ہے، لیکن دھواں دھواں سا ہے
یہی سبب ہے کہ جذبات پر نہیں قابو
نظر میں ان کا تصور جواں جواں سا ہے

روندی ہوئی کلیاں بھی یہ دیتی ہیں شہادت
وہ مست خرام آج بھی گزرا ہے ادھر سے

غموں سے اپنے خیالات الجھے الجھے ہیں
کسی حسین کے گیسوئے پرشکن کی طرح

چشم مئے گوں سے کیا ملیں آنکھیں
چڑھ گیا اور تشنگی کا مزاج

حاذقؔ کی شاعری کے مطالعہ سے ایک بات اور بھی روشن ہوتی ہے کہ ان کے یہاں جوش وجذبے کی فروانی ہے اور زندگی کی دشواریوں سے مقابلہ کرنے کی بھرپور صلاحیت ہے۔زندگی سے کترانا ان کا شیوہ نہیں اور نہ ہی مصائب ومشکلات کے سامنے دل برداشتہ ہوکر سپر ڈال دینا ان کی عادت ہے بلکہ ان کے یہاں زندگی کے بے رحم حقائق کا سامنا کرتے وقت جرأت ومردانگی کا سبق ملتا ہے اور ہستی کے پریشان گیسو سلجھانے کی پرجوش وحوصلہ افزا دعوت بھی ؎

قدم قدم پہ اندھیروں کا جال پھیلا ہے
کہیں چراغ جلاؤ بھی روشنی کے لئے

جسے برق کا خطر ہو جسے باغباں کا ڈر ہو
وہ چمن سے دور جا کر کہیں آشیاں بنائے

مشکلات راہ سے تو ہو نہ دل برداشتہ
ٹھوکریں جو کھائیں گے وہ رہنما ہو جائیں گے

عزم انسان ہی فقط حاذقؔ بہتے دریا کو موڑ سکتا ہے

درد کی موج سے بہم ہو کر مسکراؤ رہین غم ہو کر

حاذقؔ صاحب جب بھی زندگی کے تلخ حقائق کے چہرے سے نقاب اٹھاتے ہیں تو ان کے پائے اسلوب متزلزل نہیں ہوتے اور نہ ان کا لب ولہجہ مجروح ہوتا ہے، وہ جذبات کی شدید لہروں میں بہہ نہیں جاتے بلکہ اعتدال وتوازن برقرار رکھتے ہیں۔

ان کے یہاں عہد حاضر کے اضطراب اور بے چینیوں کی تصویریں ملتی ہیں اور شاعرانہ شعور وآگہی اور سماجی پس منظر بھی وہی ہے جو تقریباً دوسرے ترقی پسند شعرا کے یہاں ہے،لیکن دوسروں کے برخلاف حاذقؔ کے یہاں عمومیت اور سپاٹ پن نہیں ہے، جھنجھلاہٹ اور جھلاہٹ بھی نہیں ہے، برق ورعد کی گھن گرج رکھنے والی کھوکھلی اور بے مغز آواز بھی نہیں ہے اور نہ الفاظ وتراکیب کا گورکھ دھندا ہے بلکہ ایک بلندی ہے، ترفع ہے، حوصلہ مندی ہے اور تمام تر سادگی کے باوجود اس میں بے پناہ خلوص بھی ہے۔ ایک خوبصورت چیز جس نے ان کی شاعری کو اور بھی حسین وجمیل بنا دیا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے بحور وقوافی اور دوسری فنی پابندیوں سے کہیں بھی بغاوت نہیں کی ہے ۔ حاذقؔ، شاعری میں ردیف وقوافی کے حسن اور ترنم کے قائل ہیں، البتہ ان کے یہاں موضوع اور اسلوب بیان میں اجتہاد کا رنگ جا بجا پایا جاتا ہے اور چونکہ وہ جو کچھ کہتے ہیں احساسات اور تجربات میں ڈوب کر کہتے ہیں اس لئے ان کے یہاں الجھاؤ اور ابہام کا نام ونشان نہیں ملتا۔

جب سے بدلا ہے آدمی کا مزاج
بگڑا بگڑا ہے آدمی کا مزاج
مفلسی برہمی سکھاتی ہے
کیوں نہ برہم ہو آدمی کا مزاج
ہے اگر اپنے آشیاں کا خیال
کیجئے پہلے گلستاں کا خیال
بہ جنوں ہے کہ ہوش کا عالم
بے زبانی میں ہے زباں کا خیال

فلک آنسو بہاتا تھا زمیں بھی خوں اگلتی تھی
زمانہ مسکراتا تھا وہ نظارے بھی دیکھے ہیں

''زنداں بدوش'' کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حاذقؔ صاحب گرچہ بنیادی طور پر غزلوں کے شاعر ہیں، لیکن دیگر اصناف سخن مثلاً قطعہ، نظم اور گیت وغیرہ پر بھی انہوں نے بڑے اعتبار کے ساتھ قلم اٹھایا ہے اور یہاں بھی وہ قارئین سے داد وتحسین لئے بنا نہیں رہتے۔ جہاں تک ان کے مخصوص انداز سخن کا تعلق ہے ان کی غزلوں، نظموں اور گیتوں کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کرنا بہت مشکل ہے کیوں کہ ان کا مخصوص رنگ ہر جگہ یکساں طور پر نمایاں ہے۔

آج کے انسان کی موجودہ بے بسی، حسن وعشق کا آب وتاب اور عروج وزوال، آدمیوں کی کم علمی اور اپنی غلطیوں کو دوسرے کے سر تھوپنے کی مذموم کوشش، آزادرہ کر غلامی، غم زندگی کے پہلو میں سکون کا حصول، وصال کی خوشی اور ہجر کا دکھ، عزم انسانی، حق وباطل کا ٹکراؤ، چراغ محبت کا اجالا، اسلامیات اور زرداری کی ننگی تہذیب کو عریاں کرنے کی کوشش، ادب کے ساتھ زندگی کا زوال اور مستقبل کے انقلاب کا اشارہ غرض کہ ایسے نہ جانے کتنے موضوعات ومسائل ہیں جن پر حاذقؔ صاحب نے اپنے قطعات میں بڑی گہری، کارآمد اور ہمہ جہت نظر ڈالی ہے، حاذقؔ انصاری صحافی بھی ہیں چنانچہ ان کے بعض قطعات میں اردو صحافت کے مزاج وماحول اور اس کی لفظیات کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔ خصوصاً کلکتہ کی اردو صحافت اور بنگال کے اردو روزناموں کے نام انہوں نے نہایت فنکاری کے ساتھ تمثیلی رنگ وروغن میں سمو دیا ہے، جن میں صحافیوں پر گہرا طنز بھی ہے۔

جہاں تک نظموں کا تعلق ہے ان میں انقلاب کی دھیمی دھیمی آنچ ہر جگہ نظر آتی ہے۔ ان میں ایک عزم، ایک جوش، ایک تمنا اور گہرے احساسات کی بجلیاں کروٹیں لے رہی ہیں۔ حاذقؔ انقلاب کو فرعونیت کا مٹانے والا، کلیوں کو تازگی اور پھولوں کو دلکشی دے کر چمن کو نئی زندگی بخشنے والا، بوڑھوں کو مسکراہٹ اور مفلسوں کو جوانی عطا کرنے والا، وطن کی بنجر زمینوں میں شادابی اور ہریالی کی روح پھونکنے والا پیامی بتاتے ہیں یہ اور بات ہے کہ ان کا جزوی اشارہ کمیونزم کی طرف ہی رہتا ہے۔

نظم ''تازیانہ'' میں مفلسوں کی بدحالی، مجبور ومقہور مزدوروں کی محتاجی اور بھوکے بچوں کے آنسو اور بیکس ماں کی سسکتی آوازیں ہیں، جن پر پھلنے پھولنے کے سارے راستے مسدود کر دیئے گئے ہیں۔ حاذقؔ کے غمزدہ دل میں خواہش مچل رہی ہے کہ زمانے کا یہ پرانا دستور بدلے اور انسان رنج وآلام کی صحرائی زنجیروں سے آزاد ہو۔

''پیام زندگی'' میں شاعر اپنے محبوب سے مخاطب ہے وہ محبوب کے غمزدہ ہونے سے بے چین ہے اور اس کے احمریں ہونٹوں پر تبسم کی کرنیں بکھیرنا چاہتا ہے اور اپنے غم کدے میں چراغ کی صورت جل کر تاریکیاں مٹانے کا خواہشمند ہے اس لئے وہ اپنے محبوب کو درد بھرے انداز میں تسلی دیتا ہے اور زندگی کے تاریک صحرا میں ہزاروں رعنائیاں بکھیرنے پر تلا ہوا ہے، اس سلسلے میں اس کا حوصلہ اتنا بلند و جواں ہے کہ وہ موت کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔

''پیام وقت'' ایک انقلابی نغمہ ہے شاعر اپنے ہم سفروں کو حیات کے جمود سے باہر نکلنے کا درس دیتا ہے اور انہیں بجلیوں کی مانند سارے جہاں پر چھا جانے پر اکساتا ہے۔ وہ اپنے گلشن وطن کو دلہن کی طرح خوبصورت بنانا چاہتا ہے اور اس کے لئے نفرتوں کو مٹانے، ظلم و جور کا خاتمہ کرنے، وطن فروشوں کو انجام تک پہنچانے اور انقلاب کے لئے اٹھ کھڑے ہونے کی تعلیم دیتا ہے۔

''نغمہ بیداری'' بھی اسی قبیل کی ایک اچھی نظم ہے، جس میں حاذقؔ صاحب جمہوریت پر میٹھے طنز کرتے ہیں اور دیش میں رشوت و بے کاری کی لعنت، اہل وطن کے دلوں میں کدورت، ملک کی سیتاؤں کی عصمت پر لگے خطروں کا رونا روتے ہیں، خود شاعر کی شکستہ حالی، پریشانی، افسردگی اور حیرانی وطن کی اس بے راہ روی کا سبب ہے۔

حاذقؔ صاحب کے گیت بھی خاص متوجہ کے حامل ہیں یہ سب اردو بحروں میں ہیں جن میں روانی، درد، صفائی، دلکشی، نغمگی اور اثر ہے۔ غم واندوہ کے ساتھ ان میں ایک سوز و گداز ہے جو گیتوں کی جان ہوتی ہے، ان میں جا بجا ہندی کے ہلکے پھلکے اور رس بھرے الفاظ یوں نظر آتے ہیں جیسے ہرے پتوں کے درمیان سفید جوہی کھل رہی ہو۔ یہ گیت بے شک بڑے انمول اور پیارے ہیں اور شاعر خود بھی اس سے بے خبر نہیں چنانچہ کہتا ہے ؎

یہ گیت بڑے انمول ہیں پیارے گیت بڑے انمول
ہر موسم کے ساز پہ گاؤ پیار کے میٹھے بول

گیتوں کے شہنشاہ پدم شری بیکل اتساہی نے بجا فرمایا ہے:

''حاذقؔ صاحب نے اردو بحروں کو اپنا کر گیتوں کی نفاست اور نزاکت کو ہاتھوں سے جانے نہیں دیا۔ ان کے یہاں گیتوں کا لہجہ سوگ اور سنجوگ کا سنگم ہے جو گیتوں کے لئے خاص عناصر کا درجہ رکھتے ہیں، حاذقؔ صاحب کے گیتوں کی نرم نرم آنچ نے کیفیت فکر کو تپا کر کندن بنا دیا ہے۔''

ذیل میں گیت کے دو بند ملاحظہ کیجئے اور نرم جذبوں کی گرمی تپی ہوئی کیفیت فکر کی چمک دمک دیکھئے ؎

پیاری پیاری، سوندھی سوندھی پریت نگر کی مٹی
اک چٹکی سندور بھروں میں آئی ان کی چٹھی
مٹی بھی سونا ہو جائے کیا چاندی کا مول
گیت بڑے انمول ہیں پیارے گیت بڑے انمول

رشتے ناتے ٹوٹ رہے ہیں بن کر کچے دھاگے
جیسے سورج سر پر آئے سایہ پیچھے بھاگے
کیسا ہے جیون کا سپنا، کیا ہے جیون دان
ساگر میں طوفان اے ماجھی ساگر میں طوفان

غرض حاذقؔ انصاری کی شاعری مجموعی طور پر اس بات کی مستحق ہے کہ اس پر ہر زاویے سے گہری نظر ڈالی جائے اور میزان نقد ونظر پر تول کر ان کے فکر وفن کے پوشیدہ حقائق کو نئی نسلوں کے سامنے لایا جائے، تاکہ ''نام نیکو رفتگان ضائع مکن'' کی نصیحت پر عمل کرنے کی سعادت بھی ملے اور اُس کے فائدے بھی ہمارے حصہ میں آئیں، اگر ایسا ہوسکا تو یقیناً بنگال کے مرحوم شاعر کے حق میں یہ ایک بہت بڑا خراج عقیدت ہوگا اور موجودہ عہد کے باذوق شعرا کو بھی کچھ سیکھنے اور شعری سمت سفر متعین کرنے کے مواقع میسر آئیں گے۔ ❁❁

ڈاکٹر محمد ثاقب انور

Vill. Sarweli, Post. Baraidgah, Via. Kasba,Dist Purnia - 854330 (Mob. 9801261623)

ابراہیم جلیس اوران کے بھائی

بیسویں صدی کے عین وسط میں یا یوں کہا جائے کہ گزشتہ صدی کی دوسری اور تیسری چوتھائی کے دوران اردو افسانے اور اردو ناول کا قافلہ جن قلم کاروں کی بدولت نمایاں انداز سے تیز گام بنتا گیا اور تقسیم کے بعد سرحد پار کی ادبی تاریخ کا ایک اہم حصہ قرار پایا اور ساتھ ہی ساتھ طنز و مزاح، ڈراما، رپورتاژ، سفرنامہ اور صحافت کا سرمایہ بھی وقیع اور وسیع ہوا، اُن میں جنوبی ہند کے تین سگے بھائیوں کو ہرگز بھلایا نہیں جاسکتا۔ یہ محبوب حسین جگرؔ، ابراہیم حسین جلیس اور مجتبیٰ حسین یعنی تین ناموں کی تثلیث ہے۔ یہ تینوں بھائی مولوی احمد حسین اور امیر النسا بیگم کے فرزند تھے اور اُن کے درمیان عمر کا فرق یوں تھا کہ جگرؔ جلیس سے بارہ سال اور مجتبیٰ سے سترہ سال بڑے تھے۔ اس طرح اُن کا سال ولادت ۱۹۲۰ء کے آس پاس قرار پاتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ تینوں بھائی ادیب اور صحافی کی حیثیت سے اپنی اپنی شناخت رکھتے ہیں۔

یہاں اگرچہ ہمارا اصل مقصود ابراہیم حسین جلیس کا تذکرہ ہے، لیکن یہ تفصیل لکھ دینے میں شاید کوئی مضائقہ نہیں کہ ابراہیم جلیس کے بڑے بھائی محبوب حسین جگرؔ اگرچہ اپنا ایک تخلص ضرور رکھتے ہیں اور انہیں اس تخلص کے ساتھ ہی یاد بھی کیا جاتا ہے، لیکن ان کی بنیادی نشاخت وشہرت ایک صحافی کی حیثیت سے ہے۔ اُن کی شاعری کے بارے میں اگرچہ عام طور سے قابل ذکر معلومات میسر نہیں، لیکن اُن کے تین کارنامے بجائے خود بڑے یادگار ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اُن کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے مخدوم محی الدین کی شاعری پر اولین مضمون لکھا تھا اور اُس وقت لکھا تھا جب کہ انہوں نے خود گریجویشن کی ڈگری بھی نہیں لی تھی۔ اُن کا یہ مضمون نیازؔ فتح پوری کے رسالہ ''نگار'' لکھنؤ میں چھپا تھا، چنانچہ اسی لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ مخدوم محی الدین کا نام بندھیا چل کے پار پہنچانے والے پہلے قلم کار ابراہیم جلیس اور مجتبیٰ حسین کے بڑے بھائی محبوب حسین جگرؔ تھے۔

محبوب حسین نے اپنا ادبی سفر افسانہ نگاری سے شروع کیا تھا، لیکن پھر وہ صحافت کی طرف آ گئے۔ اُن کا دوسرا تاریخ ساز کارنامہ ۱۹۴۹ء میں حیدرآباد سے ''سیاست'' کا اجرا ہے۔ اس کے ایڈیٹر عابد علی خاں تھے اور جوائنٹ ایڈیٹر محبوب حسین جگرؔ (عابد علی خاں ابن نواب محمود خاں جنوبی ہند کے دلوائی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا سال ولادت ۱۹۲۰ء ہے۔ وہ جامعہ عثمانیہ کے فراغت یافتہ تھے اور مخدوم محی الدین سے ملاقات نے انہیں ترقی پسندی کی طرف لایا تھا) اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ''سیاست'' کے اڈیٹر اور جوائنٹ ایڈیٹر دونوں ہم عمر تھے اور مخدوم سے ان کی ذہنی قربت بھی تھی۔ بہرحال! یہاں ذکر ہے جگرؔ کا اور یقیناً تقریباً تیس سال کی عمر میں عابد علی خاں کے ساتھ جگرؔ نے ''سیاست'' کی ادارتی ذمہ داری اٹھائی تو بشرط استواری اسے نبھانے کی مثال قائم کر گئے۔

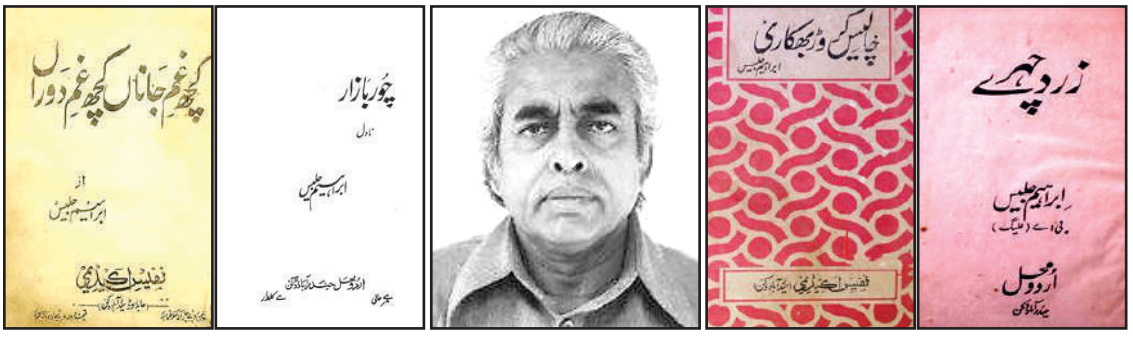

جگرؔ کا تیسرا کارنامہ بھی ''سیاست'' اخبار کی خدمت ہی سے جڑا ہوا ہے کہ انہوں نے ہی اپنے چھوٹے بھائی مجتبیٰ حسین کو اس اخبار سے جوڑا اور جب ضرورت آ گئی تو انہیں گویا حکم دے کر کالم نگاری کی شروعات کرائی۔ یہ بات ۱۲، اگست ۱۹۶۲ء کی ہے۔ بڑے بھائی کا حکم چھوٹے بھائی نے بجالایا۔ ''سیاست'' کا مزاحیہ کالم ''شیشہ و تیشہ'' فلک پیما کے قلمی نام سے لکھا اور بھائی کے حکم کی بجا آوری یوں بابرکت بنی کہ آج مجتبیٰ حسین کا نام اردو میں کالم نگاری کی تاریخ کا اٹوٹ حصہ ہے۔ مجتبیٰ حسین ۲۰۲۰ء میں دنیا سے چل بسے، لیکن جگرؔ نے اُن کی شکل میں اردو کو جیسا کامیاب کالم نگار دیا وہ مدت مدید کے لئے یادگار رہے۔

جیسا کہ گزشتہ سطروں میں ذکر آچکا ابراہیم جلیس محبوب حسین جگرؔ سے چھوٹے اور مجتبیٰ حسین سے پانچ سال بڑے تھے۔ ان کی ولادت اگست ۱۹۲۳ء میں بنگلور میں ہوئی، ان کے والد تحصیلدار تھے جو گلبرگہ میں ایک عرصہ تک تعینات رہے۔

ابراہیم جلیس نے ۱۹۴۰ء میں گلبرگہ کالج سے انٹر پاس کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لئے علی گڈھ کا رُخ کیا اور ۱۹۴۲ء میں مسلم یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری لے کر وطن آئے اور ۱۹۴۵ء میں کمرشیل کارپوریشن حیدرآباد میں ملازمت اختیار کرلی، مگر وہاں ان کا دل نہیں لگا اور یہ ملازمت چھوڑ کر وہ فلمی دنیا میں طالع آزمائی کے لئے بمبئی چلے گئے، مگر وہاں خاطر خواہ کامیابی نہ ملنے کی صورت میں پھر وطن لوٹ آئے۔ یہ جس دور کی بات ہے، وہ دور پورے ملک کی طرح حیدرآباد کے لئے بھی بڑا پرآشوب تھا۔ اُن کے بھائی مجتبیٰ حسین نے جیسا کہ لکھا ہے، اُن کے حقیقی ماموں اور پھوپھا کا ان کی آنکھوں کے سامنے قتل ہوا تھا۔ حیدرآباد میں پولیس ایکشن کی تباہی سے گھبرا کر تقریباً پچیس (۲۵) سالہ نوجوان ابراہیم جلیس نے اُس وقت ایک فیصلہ کیا اور ۱۹۴۸ء میں پاکستان چلے گئے اور وہاں ''امروز''، ''انجام'' اور ''مساوات'' کے ادارۂ تحریر سے وابستہ رہے۔ ایک طنزیہ افسانے پر وہاں مقدمہ بھی ہوا اور چار ماہ کی قید میں بھی رہے۔ اخبارات کے ساتھ ساتھ، ابراہیم جلیس کی کراچی میں ریڈیو اور ٹی وی سے بھی وابستگی رہی تھی اور انہوں نے کراچی سے اپنا ذاتی اخبار بھی نکالا تھا جس کا نام ''قومی عدالت'' تھا۔

ابراہیم جلیس کی باقاعدہ ادبی وصحافتی زندگی تقریباً چالیس برسوں پر محیط ہے۔ اُن کا پہلا افسانہ ماہنامہ ''ساقی'' ۱۹۴۱ء میں چھپا تھا۔ جس کا عنوان ''رشتہ'' تھا، اُس کے بعد وہ تادمِ حیات قلم کی کاشت کرتے رہے۔ ''زرد چہرے'' اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جس کی اشاعت نے انہیں ایک طنز نگار کی حیثیت سے خاص شہرت بخشا۔ ''زرد چہرے'' کے علاوہ ''چالیس کروڑ بھکاری''، ''کچھ غم جاناں، کچھ غم دوراں''، ''بھوکا ہے بنگال''، ''دو ملک ایک کہانی''، ''ترنگے کی چھاؤں میں''، ''تکونا دیس''، ''دیوار چین کے سائے میں''، ''گورے گئے، کالے آئے'' اور ''چور بازار'' ابراہیم جلیس کی تصنیفاتی فہرست میں شامل ہیں اور ان میں سے بعض کتابیں خاصی مشہور بھی ہیں۔ ان کے ناول ''چور بازار'' میں چور کا ذکر کہیں نہیں بس یہاں چار کردار ہیں جن کے ملنے سے ناول شروع ہوتا ہے اور جن کے بچھڑنے پر ناول ختم ہوجاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تخلیقی نثری ادب کے حوالے سے ''پاکستان میں اردو'' کا موضوع جب بھی سامنے آتا ہے، ابراہیم جلیس کا نام ضرور نمایاں ہوتا ہے۔ یوں تو ''آنچل''، ''ایک تھی لڑکی'' اور ''سویرا'' جیسی فلمی کہانیاں بھی انہوں نے لکھیں اور ''آنچل'' پر ''نگار ایوارڈ'' بھی ملا، لیکن اُن کی اصل شناخت اُن کے افسانوں ہی سے ہے۔ ''اردو انسائیکلوپیڈیا''

جلد اوّل میں واضح طور پر لکھا ہے کہ اور غلط نہیں لکھا ہے کہ:

''ابراہیم جلیس نے بعض بڑے متنوع موضوعات پر دلچسپ اور تحیر خیز افسانے تحریر کئے ہیں۔ سیاست اور معاشرے پر طنز ان کے افسانوں کا خاص موضوع ہے .....اور ساتھ ہی ساتھ انہوں نے ڈراموں میں بھی طنز و مزاح کو بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔''

''بنگال میں اجنبی'' ابراہیم جلیس کا سفرنامہ ہے جسے افسانے کے انداز میں لکھا گیا ہے ان کا ''آسمان کے باشندے'' (بھی) شخصی خاکہ نگاری کے تعلق سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ منٹو، شوکت تھانوی اور محمد طفیل کی طرح ابراہیم جلیس کا نام بھی ان قلم کاروں میں شامل ہے جنہوں نے شخصی خاکہ کاری میں خاصا معیاری اضافہ کیا ہے۔ (تفصیلات کے لئے: اردو انسائیکلو پیڈیا، ص ۸۴ تا ص ۸۷)

ابراہیم جلیس کے چھوٹے بھائی مجتبیٰ حسین نے ''اپنا آدمی'' کے عنوان سے ابراہیم جلیس کا جو خاکہ لکھا ہے، اس کا پہلا ہی جملہ ہے کہ:

''ابراہیم دوسروں کے لئے افسانہ نگار تھے، مگر میرے لئے صرف افسانہ تھے۔''

اس جملہ میں یوں کہنا چاہئے کہ بھائی کی ہجرت کے حوالے سے بھائی کا سارا کرب اور شکوہ سمٹ آیا ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ اس خاکہ کی یہ سطریں بھی اس اظہار کرب کو مزید نمایاں کر دیتی ہیں کہ:

''حقیقت جب فسانہ بن جاتی ہے۔ فاصلے جب پھیل جاتے ہیں، عمریں جب دھوکہ دینے لگتی ہیں تو دو بھائیوں کے رشتے کتنے بے بس اور بے معنی ہو جاتے ہیں۔''

ابراہیم جلیس کی تاریخ رحلت ۱۲۶ اکتوبر ۱۹۷۷ء ہے۔ ان کی وفات کے گیارہ سال بعد جب ان کے بھائی مجتبیٰ حسین نے پاکستان کا سفر کیا تھا تو اپنی بیگم کے ساتھ، کراچی میں واقع اپنے بھائی ابراہیم جلیس کے مزار پر بھی حاضری دی تھی۔ ❁❁

نہایت ضروری

☆ قلم کار حضرات! ''زبان و ادب'' کو تخلیقات سے نوازنے کا شکریہ! اکادمی اشاعت یافتہ تخلیقات کا معاوضہ براہ راست آپ کے اکاؤنٹ میں بھیجتی ہے، اس لئے آپ تخلیقات کے ساتھ اپنا وہ نام انگریزی میں ضرور لکھیں جو بینک اکاؤنٹ میں ہے۔ بینک کا نام و پتہ، اکاؤنٹ نمبر اور IFS Code بھی تحریر کریں۔ آپ کا موبائیل نمبر اور مکمل پتہ بھی ضروری ہے۔ یہ تمام تفصیلات نہ ہونے کی صورت میں آپ کی تخلیق پر غور کرنے سے ہم قاصر ہوں گے۔

☆ ہمارے کرم فرما حضرات انٹرنیٹ سے اپنی تخلیقات بھیجتے ہوئے بھی مذکورہ باتوں پر دھیان دیں۔ بسا اوقات تخلیق کار نام بھی منسلک نہیں ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی اشاعت ممکن نہیں ہو پاتی۔ از راہ کرم ان گزارشوں پر لازماً توجہ رکھیں۔

☆ جو حضرات اب تک مذکورہ تفصیلیں نہ بھیج سکے ہوں، وہ بھی اس اعلان پر نگاہ عنایت فرمائیں۔ شکریہ!

نزہت پروین نزہت
Women's College, Hajipur, Vaishali - 844101

منٹو: ایک حقائق نویس فنکار

''خالی پیٹ کا مذہب روٹی ہوتا ہے ـــــ سب سے بڑا
مسئلہ یعنی تمام مسئلوں کا باپ اس وقت پیدا ہوا تھا جب
آدم نے بھوک محسوس کی تھی ـــــ دنیا میں جتنی لعنتیں
ہیں، بھوک ان کی ماں ہے۔ یہ بھوک گداگری سکھاتی ہے،
جرائم کی ترغیب دیتی اور عصمت فروشی پر مجبور کرتی ہے۔''

درج بالا اقوال جس فنکار سے منسوب ہیں، اُسے فکشن کی دنیا سعادت حسن منٹو کے نام سے جانتی ہے۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، بیدی اور عصمت کے ساتھ ساتھ منٹو کا نام بھی شہرہ آفاق ہے۔ لکھنے کو تو منٹو نے طرح طرح کے مضامین بھی لکھے، خاکے بھی لکھا اور ڈرامے بھی لکھا، مگر سچ یہی ہے کہ منٹو اوّل و آخر افسانہ نگار ہی تھے۔ اسی صنف کے حوالے سے انہیں شناخت بھی ملی اور شہرت بھی، بلکہ ذرا آگے بڑھ کر یہ بھی کہہ دیا جائے تو مضائقہ نہیں کہ اسی صنف کی بدولت وہ فحاشی جیسے الزام کے ہدف بھی بنے۔

وہ انگریزوں کا دور تھا، ان کی کہانیوں میں ان کے موضوعات اوران کے وطیرۂ فن نے اُس وقت کے معاشرے کو جو اخلاق وشرافت کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھا، بے چین ہی نہیں، سخت بے چین کر دیا، حتیٰ کہ محاورتاً نہیں، حقیقتاً وہ عدالت کے کٹہرے میں لا کر کھڑے کر دیے گئے اوران پر ایک نہیں کئی مقدمے چلے، مگر افسانے کی تاریخ آج بھی یہی بتا رہی ہے کہ ان کی ''سعادت'' بظاہر ''فحاشی'' میں بدل کر بلکہ ڈوب کر بھی، سعادت وشرافت ہی رہی، بایں معنی کہ فن کی یہ پاکیزگی عملاً چاہے، ان کا حصہ بنی ہو یا نہ بنی ہو، لیکن ان کے مشاہدے کی بیباک اور بالکل کھری، سچی پیش کش نے کڑوی حقیقتیں ضرور بے نقاب کر دیں اور جن کی سونگھنے کی صلاحیت جاتی رہی تھی، وہ بھی اُن کی ''بو'' محسوس کرنے لگے۔

منٹو، ۱۱رمئی ۱۹۱۲ء کو ضلع لدھیانہ (پنجاب) کے سمبرالہ گاؤں میں پیدا ہوئے۔ آباو جداد اٹھارہویں صدی کے آخر میں کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب آئے اور لاہور میں بس گئے۔ ان کے والد کا نام غلام حسن اور ماں کا نام سردار بیگم تھا۔ منٹو کی شادی صفیہ بیگم سے ہوئی تھی۔ ان کے چار بچے ہوئے۔ پہلی اولاد نرینہ تھی جو زندہ نہیں رہ سکی۔ اس کے بعد تین لڑکیاں ہوئیں جن کا نام نکہت، نزہت اور نصرت تھا۔

منٹو نے اپنی بیٹیوں کے جو نام رکھے، میں اپنے طور پر غور کرتی ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ اس میں منٹو کی سوچ کا بھی اپنا حصہ ضرور ہے۔ وہ بیٹیوں کو یعنی آنے والے کل کی عورت کو خوشبو، پاکیزگی اور محبت و مدد کا پیکر دیکھنا چاہتے تھے اور یہ بھی کہ معاشرہ انہیں اسی رنگ و روپ میں دیکھنے کی طرف سدا کے لئے اپنا جھکاؤ رکھے۔

منٹو چوں کہ کشمیر سے تھے، اس لئے انہیں کشمیری ہونے پر فخر تھا۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ منٹو نے امرتسر سے علی گڑھ تک اپنا تعلیمی دور گزارا، مگر وہ ایک اچھے اسٹوڈنٹ ثابت نہیں ہوئے، ان کا ایجوکیشنل کیریئر اونچا نہیں رہا، پھر عشق نے بھی منٹو کی راہ کٹھن بنادی، انہیں جو دوست احباب ملے، خیر سے وہ خود بگڑے ہوئے تھے اوران کی صحبت میں سگریٹ، چرس، کونین اور شراب، ٹھرے کی عادت نے منٹو کو بھی بگاڑ دیا۔ وہ بظاہر عشق کا غم مٹانے کے نام پر پیتے رہے، بے تحاشہ پیتے رہے، حتیٰ کہ شراب نوشی کی اسی کثرت نے منٹو کی زندگی کا آخری فیصلہ کر دیا۔

منٹو کی سوانح پڑھی جائے تو باری علیگ نامی ایک شخص سے بھی ہماری ملاقات ہوتی ہے۔ منٹو نے باری صاحب کے ساتھ تین مہینے گزارے، یہ منٹو کے عہد شباب کی بات ہے۔ امرتسر میں باری علیگ سے ملاقات کا ذکر منٹو نے یوں کیا ہے، جیسے وہ ان کے ادبی استاد ہوں اور سچ بھی یہی ہے کہ باری علیگ سے ملاقات اور تعلقات نے منٹو کی زندگی میں ایک انقلاب لا دیا، ایسا انقلاب جس کی بدولت ادب کے

منظرنامے پر آج اُن کا نام چمک ہی نہیں رہا ہے، بلکہ تاریخ ادب کا ایک اٹوٹ حصہ بھی بن چکا ہے۔ باری علیگ نے ہی منٹو کو صحافت کی طرف راغب کیا، ان کا پہلا افسانہ ''تماشا'' اپنے ہفت روزہ ''خلق'' میں شائع کیا۔ یہ ۳۴-۱۹۳۳ء کی باتیں ہیں اور پھر روسی ادیبوں سے ان کا متاثر ہونا تو سبھوں کو معلوم ہے۔ وہ میکسم گورکی کے مداح تھے۔ انہوں نے گورکی کے افسانوں کا ترجمہ کیا اور ان پر مضامین لکھے۔

۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ تک منٹو نے ممبئی میں قیام کیا، پھر تقسیم وطن کے بعد ۱۹۴۸ء میں پاکستان چلے گئے۔ آخر کے تین سال ان کے لئے بے حد کٹھن تھے، مستقل آمدنی نہ ہونے کی وجہ سے ان کی صحت بھی خراب ہوتی چلی گئی اور دماغی بے چینی کے علاج کی خاطر وہ ہسپتال میں بھی رہے اور قصہ مختصر صرف ۴۳ سال کی عمر میں ان کی رحلت کے بعد، دنیا فکشن کے اس نابغہ روزگار سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگئی، مگر اس میں کیا شک کہ منٹو، ایک باکمال فن کار تھے اور جس صنف کی طرف آئے بہر حال اپنے فن کے سکے بٹھاتے چلے گئے۔ ان کی رحلت سے جہان افسانہ کی ''بادشاہت کا خاتمہ'' چاہے واقعی ہوا ہو یا نہیں، مگر اتنی بات تو اٹل ہے کہ ان کے افسانے کی قلمرو سے جس عنوان کے ساتھ جو اعلان ہوتے رہے ان کی گونج آج بھی سنائی دے رہی ہے۔ خاکوں کی دنیا میں ان کے ''گنجے فرشتے'' آج بھی گھوم رہے ہیں اور اُن کا ''لاؤڈ سپیکر'' بج رہا ہے اور اسی طرح ڈرامے کے اسٹیج پر ان کی ''تین عورتیں'' آج بھی اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی ہیں۔ اتنا ہی نہیں فلمی کہانی اور مکالمے بھی ''اپنے نگریا.....'' سے لے کر ''پڑوسن'' تک ان کی یادیں تازہ کر رہے ہیں۔

میں ابتدا میں ہی لکھ چکی ہوں کہ منٹو کی پہلی اور آخری اصل شناخت ان کی کہانیوں سے ہے۔ منٹو کی اس دنیا کا ایک ایک گوشہ، محض ایک مضمون میں دیکھنا اور دکھانا تو ممکن نہیں، ہاں! اشارے کے طور پر کہہ سکتی ہوں کہ ان کی افسانہ نگری میں ''آتش پارے'' بھی ہیں ''دھواں'' بھی، ''خالی بوتلیں اور خالی ڈبے'' بھی ہیں اور ''نمرود کی خدائی'' بھی۔ ان کے یہاں ''کالی شلوار'' پڑی ہو، چاہے ''دس روپے'' پڑے ہوں یا ''ٹھنڈا گوشت'' رکھا ہو، بہر حال کچھ بھی ایسا نہیں جو اپنی طرف متوجہ کرنے اور آج بھی تادیر متوجہ رکھنے میں ناکام ہو۔ نہ تو منٹو کا ''نیا قانون'' اپنی فکری وفنی جہتوں تک آج تک پرانا ہوا ہے اور نہ ہی اس کے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کی آواز نے آج تک اپنی معنویت کھوئی ہے۔

منٹو کے افسانے میں فرقہ وارانہ فسادات، جنسی ونفسیاتی مسائل، تقسیم ہند کا المیہ اور زندگی کا گھناؤنا پن اپنی خاص موضوعاتی انفرادیت کے ساتھ موجود ہے۔ ''جامع اردو انسائیکلوپیڈیا'' (ج ۱) میں سعادت حسن منٹو کے افسانے کی بابت جو تجزیاتی سطریں ملتی ہیں، وہ بجا طور سے اپنی اہمیت کا احساس دلا جاتی ہیں، بلاشبہ:

> ''منٹو ایک غیر معمولی افسانہ نگار تھے، اپنی صناعی اور مہارت کے لحاظ سے بے مثال۔ منٹو کی کہانیوں کا ڈھانچہ اور ان کی نثر، سادگی کے باوجود بہت موثر ہوتی ہے۔ منٹو کے کرداروں میں طوائفیں، کسبیاں، بھڑوے، جیب کترے، لفنگے، ہر طرح کے لوگ شامل ہیں۔ گرے ہوئے مردوں اور عورتوں کی زندگی سے منٹو کو خاص دلچسپی ہے۔ وہ ان کرداروں کے زوال کی تاریخ یا اسباب سے زیادہ توجہ ان کے روحانی کرب، ان کی مسخ شدہ انسانیت اور ان کے احساسِ تنہائی پر صرف کرتے ہیں۔ موذیل، سوگندھی اور بابو گوپی ناتھ کے

کردار منٹو نے بڑی مہارت کے ساتھ وضع کئے ہیں۔ منٹو اخلاقی فیصلے نہیں کرتے، نہ کسی طرح کے وعظ و پند سے سروکار رکھتے ہیں۔ 'ہتک'، 'بابو گوپی ناتھ'، 'نیا قانون'، 'بو'، 'کھول دو'، 'موذیل'، 'ٹوبہ ٹیک سنگھ'، 'پھندنے'، 'سیاہ حاشیے' اور ڈرامہ 'اس منجدھار میں' منٹو کی نمائندہ تخلیقات ہیں۔''

اس اقتباس پر اگر یہ اضافہ کیا جائے تو مضائقہ نہیں کہ یہ نمائندہ تخلیقات اسی لئے ہیں کہ ان میں بقول سردار علی جعفری ''ہندوستان کے متوسط طبقہ کے مجرم ضمیر کی فریادیں'' گونج رہی ہیں۔ منٹو بلاشبہ عدیم المثال تخلیقی صلاحیتوں کے حامل تھے، ان کے فکشن پر نظر ڈالتے ہوئے ڈاکٹر اعجاز حسین نے ''مختصر تاریخ ادب اردو'' میں بالکل درست لکھا ہے کہ:

''اُن کی شوخی تحریر سے ایک دنیا نقش فریادی ہے، ان کے کرداروں کا پیراہن کاغذی نہیں بلکہ گوشت پوست کا ہے، وہ فرضی نہیں بلکہ حقیقی ہیں، ہماری طرح انسان و دنیادار ہیں، سماج کی خودغرضی ونظامِ حکومت کی ابتری نے ان کو اس حالت میں پہنچا دیا ہے کہ وہ مجبوراً اپنے جسم بیچیں اور اپنی انسانیت وخودداری کو دوسروں کی تفریح و ہوس کے لئے ذلیل کر کے پیش کریں، یہ طبقہ ہمیشہ سے موجود تھا، لوٹنے اور لٹنے والے تاریخ کے ہر دور میں یہاں بستے تھے، چنانچہ آج بھی ہیں، مگر لٹنے والوں کی خستہ حالی اور مجبوری پر کسی نے اقتصادی زاویۂ نگاہ اور معاشرتی ارتقا کے خیال سے نظر نہ ڈالی، بھیانک اور گندی دنیا سمجھ کر، گناہوں کا مجسمہ تصور کر کے اربابِ حل وعقد نے ہمیشہ اس طبقہ سے چشم پوشی بہتر سمجھتی، حالانکہ روزمرہ کی زندگی میں اس طبقہ کو بھی غیر ضروری کبھی نہیں سوچا گیا، منٹو نے اپنے افسانوں میں ایسے ہی لوگوں کے پوست کندہ حالات پیش کئے ہیں۔ اُن کی زندگی کے مختلف ناقابل برداشت مصائب کا ذکر کیا ہے، ان کی گندی طرز معاشرت اور ذلیل ماحول پیش کیا ہے، خیال ہوتا ہے کہ ان کا منشا اس گناہگار و بدنام طبقہ کی زندگی کو دکھا کر غالباً زمانہ کو یہ سمجھانا تھا کہ اس دیار کے رہنے والے بے بس ہیں اور اس لئے سانس لے رہے ہیں کہ دنیا نے ان کو اس گڈھے میں ڈھکیل دیا ہے۔''

جہاں تک مجھے یاد آتا ہے، میں نے کبھی کہیں پڑھا تھا یا سنا تھا کہ سعادت حسن منٹو کا خاندان وکیلوں کا خاندان تھا اور اُن کے بڑے بھائی انہیں اکثر ''نامعقول'' کہا کرتے تھے، ہوسکتا ہے یہ اُن کی پیار بھری زبان ہو یا وکالت کی ہلکی سی ڈانٹ، مگر اتنی بات تو طے ہے کہ منٹو اپنے گھر والوں کے درمیان بھی کچھ خاص پسندیدہ نہ تھے اور یہ بھی کہ وکالت، شاید ان کے خون میں رچی بسی تھی کہ انہوں نے اپنی تحریروں پر ہونے والا مقدمہ کسی وکیل کے ذریعہ نہیں بلکہ خود ہی لڑا تھا۔ بیشک منٹو اگر وکالت کے آدمی تھے تو انہوں نے اپنی نظر اور اپنے نظریہ کے ساتھ اُس طبقہ کی بہترین اور برجستہ ترین وکالت کی، جس کا ذکر ابھی مشمولہ اقتباس میں ہوا ہے۔

منٹو نے اپنی کہانیوں میں اپنے اردگرد کے گندے اور جابر معاشرے کی جو تصویر جس رنگ میں دکھائی ہے، اس پر اگر ناپسندیدگی کا اظہار ہوا تو اس میں حیرت کی بات نہیں۔ کسی سڑی ہوئی چیز کو دیکھ کر جب اُبکائیاں آنے لگتی ہیں تو اُسے دکھانیوالے کو بروقت کوسنے سننے ہی

پڑتے ہیں، لیکن اس سے سچائیاں بدلتی نہیں ہیں۔

منٹو کو سچائی کی عکاسی عزیز تھی، لہٰذا وہ جگ بیتی بھی تھی تو اس نے اسے اس انداز سے پیش کیا، جیسے وہ اس کی آپ بیتی ہو، مقصد یہی تھا کہ بات اچھی نہ سہی اپنی ضرور محسوس ہو۔ منٹو کے یہاں جنسی کیفیات اور نفسیاتی خواہشات کے مظاہرے میں جو تفصیل اور بے باکی ہے، وہ اسی ہدف کو پانے کی غرض سے ہے، البتہ اتنا ضرور ہے کہ منٹو کا قلم جگہ جگہ ٹھوکریں بھی کھاتا رہا ہے اور تلذذ، ابتذال اور کثافت کے گڈھے میں بھی گرتا رہا ہے اور ایسی صورت حال پیدا جانے کی ذمہ داری اگر ایک طرف اُس جنسیاتی احوال کے غلبہ پر ہے جو منٹو کے دل و دماغ پر مستولی رہا تو دوسری طرف اُس خاص فلسفہ پر بھی ہے جو مارکس اور اس سے کہیں زیادہ فرائڈ کی دین ہے۔ دراصل منٹو کے یہاں مکروہات کا ہونا عیب نہیں ہے بلکہ اصل عیب یہ ہے کہ اس کے یہاں اس کا حل کہیں نہیں ملتا ہے اور جب حل نہیں ملتا ہے تو ظاہر ہے کہ الجھن اور گمراہی بڑھتی ہے اور تکثیف، تطہیر میں بدلنے سے محروم رہ جاتی ہے۔

منٹو نے جب لکھا اور جس انداز سے لکھا تو اولاً یہ خیال آنا بھی فطری تھا کہ یہ سب ترقی پسند تحریک کی عطا ہے، لیکن مزید اور متواتر مطالعہ نے بتا دیا کہ واقعی اس کا تعلق کہاں سے ہے، یہ لکھنے والے کا ذاتی فعل ہے جو ایک خاص طرز سے ابھرا ہے۔ منٹو حقائق نویس فنکار ضرور ہے، مگر صرف اتنا ہی بتانے تک کہ ''سچائی یہ ہے'' اس سے آگے یہ بتانے تک نہیں کہ ''اس سچائی کا توڑ یہ ہے'' اور یہی وجہ ہے کہ منٹو کے یہاں اسلوب میں بہاؤ ہے، سادگی، سلاست ہے، مگر گہرائی نہیں ہے اور نہ ہی نوضوع کی رنگارنگی حسب توقع دکھائی ہے۔

منٹو کی بیشتر تخلیقات پڑھتے ہوئے ایسا ہی لگتا ہے کہ وہ بس کم وبیش ایک ہی طرح کی باتیں کہہ رہی ہیں، لیکن اس کمی اور کمزوری کے باوجود منٹو کی انفرادیت سے یکسر انکار انصاف میں داخل نہیں ہوسکتا۔ منٹو نے جس قدر وسیع دائرے میں نفسیات کا مطالعہ کیا ہے اور متحرک کرنے والے جذبات یا متحرک ہونے والے اثرات کو جس عمدگی سے سامنے لایا ہے اور نفسیاتی پھندے میں پھنسنے اور پھنسانے والوں کی ذہنیت جس طرح بے نقاب کر دیا ہے، وہ بہرصورت اسی کا حصہ ہے۔

میں نے اس مضمون کا آغاز منٹو کے اقوال سے کیا تھا اور اب اختتام کے قریب آتے ہوئے بھی منٹو کے کچھ اور اقوال حاضر ہیں:

''غریبی مرد کو ننگا کر دیتی ہے اور پیسہ عورت کو ——— دنیا میں سب سے زیادہ سچ شراب خانوں میں شراب پی کر بولا جاتا ہے ——— سب سے زیادہ جھوٹ عدالتوں میں پاک اور مقدس کتابوں پر ہاتھ رکھ کر بولا جاتا ہے ——— مجھے اردو زبان کی تہی دامنی پر بہت افسوس آتا ہے، کیوں کہ اس میں عورت کے لئے تو 'طوائف' کا لفظ ہے، لیکن مرد کے لئے کوئی معقول گالی نہیں۔''

ظاہر ہے، منٹو نے فلسفہ کی نہ تو کوئی کتاب لکھی ہے، نہ ہی اپنا کوئی مجموعہ اقوال ہمیں دیا ہے، بلکہ اس کے بیشتر اقوال، اس کی تحریروں اور اس کی کہانیوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ یہ اقوال چاہے کتنے ہی تلخ کیوں نہ ہوں اور ان میں خاص نظریہ کا اثر اور بیان کا کتنا ہی مبالغہ کیوں نہ ثابت کر دیا جائے مگر یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ منٹو ایک حقائق نویس فن کار تھا یقیناً اس نے جو کچھ لکھا ہے، اس کی معنویت اُس دن سے پہلے کالعدم نہیں ہوسکتی جو دن، اُن خرابیوں سے معاشرے کی مکتی کا دن ہوگا، جو ایسے اقوال کے لئے پشت کی دیوار بنی ہوئی ہیں۔ ❁❁

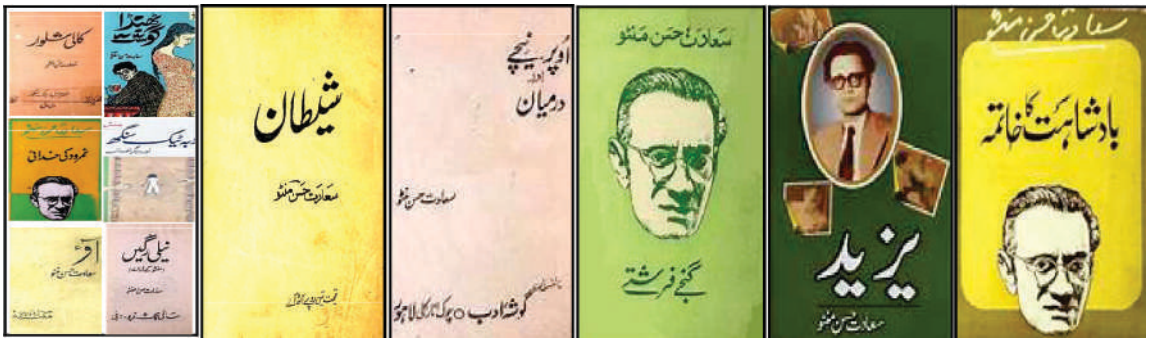

محمد اعظم
Deptt. of Urdu, Banaras Hindu University, Varanasi - 221005 (Mob. 9598939368)

چہرہ بہ چہرہ روبہ رو: ایک تجزیاتی مطالعہ

جمیلہ ہاشمی ایک ممتاز فکشن نگار ہیں۔ وہ ۱۹۲۹ء کو گوجرہ پنجاب میں پیدا ہوئیں اور ان کا انتقال ۱۹۸۸ء کو لاہور میں ہوا۔ ان کا ادبی سفر کم وبیش تین دہائیوں پر محیط ہے۔ وہ اردو ادب میں خصوصاً ناول، ناولٹ اور افسانہ نگاری کی وجہ سے اپنی الگ شناخت رکھتی ہیں۔ انھوں نے پنجابی طرز معاشرت کی نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ تصویر کشی کی ہے۔ مصنفہ نے اپنی بعض تصنیفات میں پاکستان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو خوب صورتی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ ان کی تخلیقات میں نوجوان نسل کی ذہنی الجھنوں اور کشمکش کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تصنیفات میں رومانی اور تاریخی ناول بھی شامل ہیں جو اپنے موضوع کے سبب بے حد مقبول ہوئے۔

اردو ادب میں تاریخی ناول نگاری کی جو روایت عبدالحلیم شرر سے لے کر نسیم حجازی تک رہی ہے، اس روایت کو جمیلہ ہاشمی نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ آگے بڑھایا ہے۔ ان کی نگارشات میں دو تاریخی ناول بھی موجود ہے۔ ایک ''دشت سوس'' اور دوسرا ناولٹ ''چہرہ بہ چہرہ روبرو''۔ ''دشت سوس'' کا تعلق حسین منصور ابن حلاج کی انقلابی تحریک سے ہے۔ یہ ناول تاریخی اعتبار سے منفرد اور یقیناً تاریخی اردو ناول کے سرمایہ میں ایک بیش بہا اضافہ ہے، جب کہ ''چہرہ بہ چہرہ روبہ رو'' جمیلہ ہاشمی کا ایک تاریخی ناولٹ ہے جو ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔

یہ ناولٹ دس ابواب پر مشتمل ہے، جس کا تعلق ایک تاریخی واقعہ سے ہے۔ ایران میں پیدا ہونے والا بابی فرقہ، بعد میں جسے بہائی فرقہ کہا گیا، اس کا بانی مرزا علی محمد باب تھا اور اس نے مذہب میں نئی نئی تبدیلیاں لا کر مذہب اسلام کو ایک نیا رخ دینے کی کوشش کی، جس سے اس کی مخالفت ہوئی، یہاں تک کہ شیراز میں جہاں اس نے اس فرقہ کی ابتدا کی، وہاں سے اسے جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ اس کے بہت سے شیدائی اور معتقد پورے ایران میں پھیل چکے تھے۔

جمیلہ ہاشمی نے اس ناولٹ میں فرقہ بہائی کی ابتدا اور تحریک و عوامل کی کشمکش کے ساتھ انسانی تفاوت، مذہبی نظریات، جنسی تعصّبات اور ملکی منافرت کے پیچ وخم کو ایک حقیقی اور تاریخی کردار قرۃ العین طاہرہ کی زندگی کے ذریعہ بڑے ہی مؤثر انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ قرۃ العین طاہرہ اپنے ملک اور سماج میں موجود جامد اور تنگ نظر لوگوں کے رہتے ہوئے ''امّ سلمٰی'' سے ''قرۃ العین'' پھر ''طاہرہ'' بالآخر ''امّ العالم'' کے مقام تک پہنچ جاتی ہے اور بھی کئی نام اس سے منسوب ہوئے، مگر وہ قرۃ العین طاہرہ کے نام سے زیادہ معروف ہوئی۔

امّ سلمٰی قزوین کے ایک مجتہد ملا صالح کی بیٹی ہے تو دوسرے مجتہد ملا تقی یعنی اپنے چچا کی بہو ہے۔ اس کا شوہر اس کا عم زاد ہے جو خود تعلیم یافتہ ہے۔ یہ سب ایران میں اجتہاد کرنے والوں کے نمائندہ کردار ہیں۔ امّ سلمٰی خود اعلیٰ پائے کی شاعرہ، موسیقی سے دلچسپی، فلسفہ سے شغف رکھنے والی، مراقبوں میں منہمک، الٰہیات کے مسائل پر مسلسل غور وخوض کرنے والی اور راہ حق کی تلاش میں مسلسل کوشاں رہنے والی خاتون ہے، مگر اس کی روح تشنہ ہے اور نہایت بے تابی سے ظہور آل محمد کی منتظر ہے۔ وہ ایک شخص کو جس کا چہرہ نقاب میں رہتا ہے مسلسل خواب میں دیکھتی ہے اور اس کے دیدار اور وصل کی چاہت میں اپنا سب کچھ لٹا دیتی

ہے، حد تو یہ ہے کہ اپنی زندگی بھی قربان کر دیتی ہے:

''وہ اس اندورنی کمرے کی طرف بڑھا۔ جہاں ناراض ہو کر وہ کبھی کبھی معتکف ہو جایا کرتی تھی یا نہات سوچ بچار کرنے کے لئے گویا مراقبے میں چلی جاتی تھی۔ جب اس پر شدید مایوسی کے دورے پڑتے تھے اور وہ مناجاتوں میں کھو کر اپنی گویا بیماری کا علاج کرتی تھی۔ قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے روتی رہتی، پھر اُٹھتی اور شعر کہتی ہوئی چلی جاتی اور آنسوؤں سے اس کا چہرہ بھیگا ہوا ہوتا تھا۔'' (چہرہ بہ چہرہ روبہ رہ، رائٹر بک کلب، لاہور)

مزید ڈاکٹر جمیل جالبی بھی اسی کردار کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''جمیلہ ہاشمی نے اپنے اس ناول میں ایک ایسی متنازعہ، لیکن عظیم ہستی کو موضوع بنایا ہے، جس کا نام آج تک خود ایک افسانہ ہے۔ امّ سلمٰی، جسے ہم قرۃ العین طاہرہ کے نام سے جانتے ہیں، ایک ایسی بے قرار روح کی مالک تھی جس کے پاس دل بھی بڑا تھا اور دماغ بھی، جو حق کی تلاش میں ساری عمر سرگرداں رہی اور حق کی تلاش ہی میں جان دے دی۔'' (ڈاکٹر جمیل جالبی، معاصر ادب، ناشر، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص ۲۹۷)

جمیلہ ہاشمی نے اس شخصیت کو کئی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ ایک تعلیم یافتہ اور پابند گھرانے میں پیدا ہو کر صرف اپنے گھر تک محدود نہ رہی بلکہ ایران میں رائج تمام روایتی دائروں کو توڑ کر آگے بڑھ گئی۔ قرۃ العین طاہرہ نہ صرف کتابوں کا مطالعہ کرتی ہے بلکہ شعر بھی کہتی اور انہیں سرود پر گاتی بھی ہے، اس سے اس کی شاعری کی شہرت دور دور تک پھیل جاتی ہے۔

یہ وہ دور تھا جب عورت کے لیے اس طرح کا کام کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا، مگر روایت پسند ہوتے ہوئے بھی اس نے وہ کام انجام دیا جو وہاں کی تہذیب و معاشرت اور تاریخ میں ناممکن تھا۔ رجعت پسند اور ضعیف الاعتقاد رسوم کے خلاف، اپنے متحرک اور فعال کردار سے ذہنی شعور کو بلند کیا۔ اسی وجہ سے ام سلمٰی کے مخالفین کی تعداد بڑھ گئی اور اسے طرح طرح کے مصائب بھی جھیلنے پڑے، لیکن وہ ان سب کا سامنا کرتے ہوئے آگے بڑھتی رہی اور محض بتیس سال کی زندگی میں اُس المیہ کا شکار ہو گئی جس کا شکار، ہر زمانے میں اس قسم کا کردار ہوتا رہا ہے۔ اسی وجہ سے اس کی شخصیت ایک مجسم المیہ ہے اور ایران کی ایک تاریخ ساز اور حیران کن شخصیت بن کر ابھری ہے۔ اس کہانی کے تناظر میں جمیلہ ہاشمی نے فیض احمد فیضؔ کا ایک شعر اپنے اس ناولٹ کے دوسرے صفحہ پر درج کیا ہے جو اس ذات کی بہترین ترجمانی کرتا ہے ؎

جس ڈھب سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی تو کوئی بات نہیں

جمیلہ ہاشمی نے اپنے ناولٹ کا عنوان قرۃ العین طاہرہ کی ایک غزل کے اس مطلع سے لیا ہے ؎

گر بہ تو افتدم نظر، چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو
شرح دہم غم تو را، نکتہ بہ نکتہ، مو بہ مو

تشریح: ''اگر تجھ پر میری نظر کچھ اس طرح پڑے کہ تو میرے بالکل سامنے ہو اور تیرا چہرہ میرے چہرے کے سامنے ہو تو پھر میں تیرے غم اور گہرے عشق کی تشریح بال برابر فرق کئے بغیر بیان کروں۔'' (علامہ اقبال، کلیات اقبالؔ فارسی، ترجمہ پروفیسر حمید اللہ شاہ ہاشمی، ناشر، مکتبہ دانیال لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۸۱۰)

قرۃ العین طاہرہ کی یہی غزل علامہ اقبالؔ نے اپنی شاہکار تصنیف ''جاوید نامہ'' میں ''نوائے طاہرہ'' کے عنوان کے تحت درج کی ہے۔ اقبالؔ نے قرۃ العین طاہرہ، حسین منصور ابن حلاج اور غالبؔ جیسی شخصیات کو ''ارواح جلیلہ'' کی صفت سے متصف کیا ہے۔ اقبالؔ کے بعد قرۃ العین طاہرہ کی شخصیت اور افکار پر اس کے عہد کے تناظر میں جمیلہ ہاشمی سے قبل اردو میں عزیز احمد نے ایک افسانہ ''زرّیں تاج'' کے نام سے لکھا تھا جس کا شمار اردو کے بہترین افسانوں میں ہوتا ہے۔ رسالہ ''نگار'' میں علامہ نیاز فتح پوری نے بھی اِس انوکھی شخصیت پر ایک مضمون لکھا ہے۔ اس کے علاوہ جمیلہ ہاشمی نے اس ناولٹ میں قرۃ العین طاہرہ کے واقعات اور کردار کو ایک فنکار کی نظر سے دیکھا اور اسی

حیثیت سے پیش بھی کیا ہے۔اقبالؔ کا ایک شعر جو ''زبورعجم'' میں ہے، اس کہانی کی تفسیر کے لئے مناسب ہے ۔

ذوق حضور در جہاں رسم صنم گری نہاد
عشق فریب می دہد جان امیدوار را

تشریح:''محبوب کی صورت کے نظارہ کی چاہت نے دنیا میں بت گری کی رسم پیدا کر دی ہے،لوگوں نے محبوب کے مجسمے تراش لیے ہیں ۔محبوب سامنے نہ سہی،اس کا خیالی مجسمہ ہی دل بہلانے کے لئے کافی ہے۔''

(کلیات اقبالؔ فارسی،حمیداللہ شاہ ہاشمی،لاہور۲۰۱۶ء،ص۵۴۱)

جمیلہ ہاشمی نے اس ناولٹ کے پلاٹ میں صفوی حکمرانوں کے عہد اور ایران کے قاچاری عہد کے مذہبی،معاشرتی،تہذیبی اور سیاسی ماحول کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔علی محمد باب (یعنی فرقہ کا بانی) کی کردار نگاری میں جمیلہ ہاشمی نے فنکارانہ مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ علی محمد باب کا یہ دعویٰ کرنا کہ وہ خود ایک دروازہ ہے جس سے لوگ گزر کر بارہویں امام کا علم حاصل کریں گے۔اس طرح کے اصلاحی اور تبلیغی پروگرام کو سنتے سنتے امّ سلمیٰ بھی اس سے ملنے کے لیے بیتاب ہو جاتی ہے۔علی محمد باب کا کردار قاری کی توجہ اپنی جانب مسلسل مبذول کراتا رہتا ہے۔مصنفہ نے شیخ احمد احسائی اور اس کے شاگرد کاظم رشتی کے خطوط کی تصویر کشی بعینہٖ اسی طرح کی ہے،جس طرح مکتوب میں عکاسی کی گئی ہے،یہ ان کی فنکارانہ صلاحیت کی دلیل ہے۔کاظم رشتی نے اپنے فلسفیانہ تعلیمات اور افکار کے ذریعہ ایسی راہ متعین کرنے کی کوشش کی، جو نئے مذہب اور جاندار قوم کی تخلیق کے باعث بنے۔ایک بڑا طبقہ اس عقیدہ کو تسلیم کر رہا تھا۔امّ سلمیٰ بھی اس اعتقادی ماحول سے نہ بچ سکی، یہاں تک کہ ملاقات کی غرض سے نجف اشرف پہنچتی ہے،وہاں جا کر معلوم ہوتا ہے کہ کاظم رشتی کا دس دن پہلے وصال ہو چکا ہے،جس سے وہ بہت مغموم ہوتی ہے اور وہیں رہ کر مناجات اور مراقبہ میں مشغول ہو جاتی ہے۔یہ سبھی کردار متحرک اور فعال کردار ہیں۔اس کہانی میں بعض ایسے کردار ہیں جو تھوڑی دیر کے لیے آتے ہیں مگر قاری کے دل و دماغ پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔مثلاً محمد علی بارفروش،حسین صادق اور امّ سلمیٰ کی خادمہ ہانی کا کردار.....

اس ناولٹ کے مطالعہ سے قاری کے ذہن میں عبدالحلیم شررؔ کے ناول ''فردوس بریں'' کی کہانی گردش کرنے لگتی ہے جو فرقہ باطنیہ سے متعلق ہے،جس میں حسن بن صبّاح اور شیخ علی وجودی اس فرقہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔

تاریخ ایران میں قرۃالعین طاہرہ آزادی نسواں کے حوالے سے بھی ایک آواز ہے۔بعض قلم کاروں نے تو قرۃالعین طاہرہ کو آزادی نسواں کا ایک بڑا علمبردار لکھا بھی اور بتایا بھی ہے۔وہ اس کا یہ قول بڑے ہی وثوق سے نقل کرتے ہیں:

''تم میری جان لے سکتے ہو،مگر عورتوں کی آزادی کو نہیں روک سکتے۔''

ناولٹ ''چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو'' جمیلہ ہاشمی کی تخلیقات میں یقیناً ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے،اس میں انھوں نے اپنے مخصوص اسلوب کے پیش نظر ایک تاریخی موضوع کا انتخاب کیا اور اپنے فن کو نئی وسعتوں سے ہم کنار کیا ہے۔مجموعی طور پہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جمیلہ ہاشمی کے یہاں فکشن اور تاریخ کا حسین سنگم نظر آتا ہے،اگرچہ انھوں نے صرف دو تاریخی ناول لکھے،لیکن اپنی ذہانت اور فنی بصیرت سے انھوں نے بخوبی تاریخی ناول نگاری کا حق ادا کیا ہے۔اردو کے تاریخی ناول نگاروں میں وہ بلاشبہ ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ ❁❁

اقوال حکمت

☆ اگر سچائی کو اصل ضرورت کے وقت پیش نہیں کیا جائے تو پھر اُس کے وجود کا اعتراف بیکار ہے، چراغ جلانے کا اصل وقت غروب آفتاب کے بعد آتا ہے نہ کہ پچھلے پہر

☆ قیدی وہ ہے جس کا دل اُس کے پروردگار کی طرف سے بند ہو جائے اور قیدوہ ہے جسے خواہشات ہر طرف سے گھیر لیں

☆ عصبیت یہ ہے کہ آدمی ظلم کے مقابلے میں اپنی قوم کا ساتھ دے

☆ انسانی زندگی کی سب سے بڑی غریبی کا نام بے عقلی ہے

☆ اصل کمال علم اور عمل دونوں کو جمع کرنے میں ہے

محمد معروف عالم
Research Scholar, L.N.M.U. Darbhanga - 846008 (Mob. 9572967338)

اردو کی تعمیر وترقی میں متھلا کا کردار

برصغیر ہندو پاک ہی نہیں، بین الاقوامی سطح پر اردو زبان و ادب کا اپنا ایک خاص مقام ہے۔ وطن عزیز ہندوستان اس کی جائے پیدائش ہے، لیکن اس کا دائرہ اس قدر وسیع ہو گیا ہے کہ سات سمندر پار یوروپ، امریکہ اور دیگر براعظموں میں اس کے بولنے اور لکھنے والوں کی تعداد روز بہ روز بڑھتی ہی جارہی ہے۔ اس زبان کے ادب کو پروان چڑھانے میں جہاں دبستان دہلی، دبستان لکھنؤ، دبستان دکن، دبستان عظیم آباد اور دبستان رامپور کا بھرپور تعاون وتناصر ملا، وہیں شمالی بہار میں متھلا کے ادبا وشعرا نے بھی اپنی تاریخی، ادبی، سیاسی اور لوک روایات و رسومات کے تناظر میں اس کے گیسوؤں کی آرائش کے لئے ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں اور ہر صنف ادب میں طبع آزمائی کر کے اس کو نئی قوت دینے اور جلا بخشنے کا کام کیا ہے اور ہر طرح کے امکانات کے دروازے کھول دیئے ہیں۔

علاقائی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کسی بھی مخصوص خطہ کی شناخت میں نمایاں رول ادا کرتی ہے۔ علاقائی پہچان قومی وملکی تشخص کے لئے تعمیری وتشکیلی خدوخال تیار کرتی ہے۔ ہر علاقہ اپنا مخصوص رنگ وآہنگ اور اپنی انفرادی پہچان کے باعث کم یا زیادہ مشہور ومعروف ہوا کرتا ہے اور اسی کے ذریعہ اس کی مربوط اور مکمل تصویر کشی ممکن ہو پاتی ہے۔ کسی بھی ملک کی تہذیبی وتمدنی روایات، رسومات، تیج تہوار اور دیگر مقامی تشخص کی افہام وتفہیم کے لئے علاقائی ادب کا مطالعہ ناگزیر ہوتا ہے۔

متھلانچل اردو زبان وادب کی آبیاری کرنے والا ایسا علاقہ ہے جو عوامی شناخت، ثقافتی پہچان، تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز، تخلیقی عظمت اور علم وادب کا سرچشمہ رہا ہے۔ یہ ویشالی، مدھیس، ترہت، انگ اور بدیہہ جیسے ناموں سے بھی جانا جاتا تھا۔ یہاں کی رائج زبان میتھلی ہے، مگر اس خطہ میں آباد مسلم آبادی عام طور پر اپنے گھروں، اجتماعی معاملات اور معاشی ومعاشرتی زندگی میں اردو زبان کا استعمال کرتی ہے نیز میتھلی بھی بولتی اور سمجھ لیتی ہے۔

اردو زبان وادب کے فروغ کے حوالے سے جتنی شہرت ہندوستان کے دوسرے ادبی مراکز کو حاصل ہوئی، اتنی متھلانچل کو نہیں ہوئی۔ اس کی متعدد وجوہات ہوسکتی ہیں، مگر یہ ایک سچائی ہے کہ شہرت کی پروا کئے بنا یہاں کے ادبا وشعرا نے ملکی، صوبائی اور علاقائی سطح پر گیسوئے اردو کو سنوارنے میں ہمہ تن مصروف ہونے کا ثبوت دیا۔ اسی روایت کی ایک کڑی ''تذکرہ شعرائے مدھوبنی'' ہے جو متھلا کے ایک حصہ مدھوبنی کی تخلیقی زرخیزی کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کتاب میں شائق یکہتوی نے ایسے چالیس شعرائے کرام کے احوال وآثار قلمبند کئے ہیں جن میں سے بعض ملکی سطح پر تو کچھ ریاستی اور ضلعی سطح پر مشہور ہیں۔ ان میں قدر مشترک یہ ہے کہ انہوں نے اردو شعر وادب سے بے پناہ محبت، والہانہ وابستگی اور یکساں دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اردو زبان وادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

شمالی بہار میں واقع متھلا کی عوامی بول چال کی زبان میتھلی ہے۔ یہاں اردو، ہندی اور میتھلی متوازی خطوط پر رواں دواں ہیں اور ارتقائی مراحل طے کر رہی ہیں، مگر اردو کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کو پروان چڑھانے میں یہاں کے چھوٹے بڑے ادیبوں اور شاعروں نے اہم رول ادا کیا، ہر طرح کی نگارشات سے اسے ثروت مندی بخشی اور اس خطہ زمین کو اردو زبان وادب کا گہوارہ بنا دیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جب کسی معاشرے میں دو یا دو سے زیادہ زبانیں بولنے والوں کا باہم اختلاط ہوتا ہے تو وہ ایک دوسرے کو کسی حد تک ضرور متاثر کرتے ہیں اور یہ اثر واضح طور پر اردو میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اردو سے متاثر ہو کر یہاں کے ادبا وشعرا نے اپنی تحریرات

اردو زبان وادب میں پیش کرنا شروع کیا اور ہر صنف ادب میں طبع آزمائی کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہترین غزلیں، قصائد، مراثی، افسانے اور ناول منصۂ شہود پر آنے لگے اور فروغ اردو کا یہ سلسلہ روز بہ روز مضبوط و مستحکم ہوتا چلا گیا۔ یہاں ایسے شعرا کی تعداد کم نہیں جن کے کئی کئی شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں اور ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جارہے ہیں۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہاں کے ادبا و شعرا جہاں بھی مقیم رہے وہاں فروغ اردو کے لئے اپنے طور پر خدمات انجام دیتے رہے اور وہاں کی شعری و ادبی محفلوں سے منسلک رہے اور اپنی بیش بہا اور عمدہ تخلیقات پیش کر کے ادبی فضا کو روشن و تابناک بناتے رہے اور اردو دنیا کو اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہے اور آج بھی دلا رہے ہیں۔

''ریاض ترہت''، ''آئینۂ ترہت''، ''تاریخ شعرائے بہار''، ''تذکرہ ہندو شعرائے بہار'' اور ''تذکرہ بزم شمال'' جیسی تصانیف کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس خطہ میں انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی شروعات میں اردو شعر و شاعری کا ماحول ساز گار بننے لگتا ہے اور یہاں کے ادبا و شعرا اس زبان کی آبیاری کا بیڑا اٹھاتے ہیں اور اس کی باریکیوں کے بارے میں جانکاری حاصل کر کے اس کی ترقی میں اپنی شعری و نثری تصانیف کے ذریعہ بیش بہا خدمات انجام دیتے ہیں۔ اس حوالے سے پروفیسر مشتاق احمد لکھتے ہیں:

> ''انیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی متھلانچل میں اردو شعر و شاعری کا ماحول ساز گار ہو جاتا ہے اور سیکڑوں غیر مسلم و غیر اردو داں ادبا اور شعرا اردو کی تعلیم سے آراستہ ہوتے ہیں اور پھر شعر و سخن کی دنیا آباد کرتے ہیں۔'' (مضمون، میتھلی زبان وادب پر اردو کے اثرات، مشمولہ سہ ماہی ''فکر و تحقیق'' جنوری تا مارچ، ۲۰۲۱، ص ۴۲)

اردو شاعری کے حوالے سے متھلانچل کا علاقہ سرسبز و شاداب نظر آتا ہے۔ ابتدائی دور کے جن شاعروں نے سب سے پہلے اس کے لئے راستہ ہموار کیا ان میں عبد المجید مضطرؔ مظفر پوری، ماسٹر محسنؔ دربھنگوی، ماسٹر آفاق پریشاںؔ، مطیع الرحمٰن احقرؔ وغیرہ اہم نام ہیں۔ بلاشبہ ان قلم کاروں کا اثر دور رس رہا اور رفتہ رفتہ ایسی فضا اور ایسا ماحول اس خطہ میں بننے لگا کہ یہ پورا علاقہ شعر و شاعری اور علم و ادب کا گہوارہ بن گیا۔ وقت اور حالات کے مطابق یہ سلسلہ جاری رہا اور اب اس کا رجحان اس قدر غالب ہو گیا ہے کہ اس خطہ میں جگہ جگہ مشاعرے اور دیگر شعری و ادبی مجالس منعقد ہونے لگی ہیں۔ ملک کے الگ الگ حصوں کے مشاہیر ادبا و شعرا کی طرح یہاں کے مشہور و معروف ادبا و شعرا بھی ادبی و شعری پروگرام میں اچھی خاصی تعداد میں مدعو کئے جاتے ہیں اور گیسوئے اردو کو سنوارنے میں مدد کرتے ہیں۔ یہ علاقہ گہوارۂ ادب ہے اور یہاں منعقد ہونے والی شعری محفلوں کا ہی اثر ہے کہ یہاں اردو شاعروں کی ایک بڑی کھیپ تیار ہو چکی ہے جو فروغ اردو میں اپنے اپنے حساب سے تعاون کر رہی ہے اور قدیم شاعروں کی شعری روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اسے توانائی بخشنے اور نئے نئے امکانات پیدا کرنے کی کوششوں میں مسلسل مصروف ہے۔

سرزمین متھلا نے بڑے بڑے ادیب، شاعر، مفکر، دانشور، وکیل اور ماہرین تعلیم وغیرہ کو پیدا کیا جنہوں نے اردو زبان وادب سے نہ صرف رشتہ استوار رکھا بلکہ ادبی ذوق کا ثبوت دیتے ہوئے متعدد گراں قدر تصنیفات کے ذریعہ اسے ثروت مند بنایا۔ اس طرح کے ادیبوں اور شاعروں میں حسن امام دردؔ، مظہر امام، شاداںؔ فاروقی، اویس احمد دوراںؔ، پروفیسر لطف الرحمٰن، ڈاکٹر کمال الدین، پروفیسر رئیس انور، ڈاکٹر امام اعظم، جمال اویسی، پروفیسر آفتاب اشرف، پرفیسر مشتاق احمد، ڈکٹر غلام سرور اور ڈاکٹر منصور خوشتر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان ادیبوں اور شاعروں کی کئی کئی کتابیں منظر عام پر آکر داد و تحسین وصول کر چکی ہیں، کچھ زیر ترتیب ہیں اور کچھ اشاعت کے مرحلے میں ہیں۔

متھلانچل میں ہندی، میتھلی کے علاوہ اردو زبان کا استعمال عوام و خواص اپنی روزمرہ زندگی میں کثرت سے کرتے ہیں اور یقیناً شمالی بہار میں فروغ اردو کے حوالے سے اسے مرکزی حیثیت حاصل ہے، جو اردو قارئین کے علاوہ ادیبوں اور شاعروں کی ایسی کھیپ تیار کر رہا ہے جس کے کارنامے ناقابل فراموش ہی نہیں، قابل داد و تحسین بھی ہیں۔ یہاں کے قلم کاروں کی نثری تخلیقات اور شعری مجموعوں کے سرسری مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تحریروں میں شعری و ادبی محاسن مدلل اور منطقی انداز میں موجود ہیں۔ انہوں نے اپنے احساسات، جذبات

اورافکاروخیالات کواپنی نگارشات میں روانی کے ساتھ بیان کردیا ہے۔ ان کی ادبی جودت،شعری صلاحیت،تخلیقی قوت اورفنی استقامت کو ان کے فن پاروں میں بخوبی ملاحظہ کیا جاسکتاہے۔فروغ اردو کے حوالے سے پروفیسرمشتاق احمدقمطراز ہیں:

''اٹھارہویں صدی کے آخراورانیسویں صدی کے آغاز میں اردو نہ صرف میتھلی زبان پراثر انداز ہوتی ہے بلکہ متھلانچل کےلسانی معاشرے کوبھی اپنی جادوئی گرفت میں لے لیتی ہے۔ متھلانچل کےغیراردوداں ادبااور شعرااردوکوتخلیقی ذریعہ اظہار بنانے لگتے ہیں۔ بالخصوص اردو میں نہ صرف شاعری کوفروغ دیتے ہیں بلکہ کئی ادبا اورشعراصاحب دیوان اورصاحب تصانیف کھڑے نظر آتے ہیں۔'' (مضمون،میتھلی زبان وادب پراردو کےاثرات، مشمولہ سہ ماہی'فکروتحقیق' جنوری تامارچ،۲۰۲۱،ص۴۲)

متھلا کےشعری افق پرنمودار ہونے والےشاعروں کی فہرست اگرچہ بہت طویل ہےاوراس کامفصل حال واحوال لکھنا آسان نہیں، پھربھی یہاں کچھ شاعروں کا ذکرمناسب معلوم ہوتاہےجن کا مجموعۂ کلام منظر عام پرآکرقارئین شعروادب سے پذیرائی حاصل کرچکا ہے۔ان میں پہلا نام مہؔرشکروی کا ہے۔ان کےشعری مجموعے''رحمت کے پھول''، ''عقیدت کے پھول''،''جنت کے پھول''،''مظلوم حسین''اور''شعاع مہر''موجود ہیں۔اسی طرح مولانااسلم آسی کا''گلدستہ آسی''،مطیع الرحمٰن احقؔر کا''آوازوانداز''ڈاکٹرغلام قدوس فہمی کا''آئینۂ گل''حافظ عبدالمنان طرزی کا''دیدہ وران بہار''اور''رفتگاں وقائماں''کلیم اللہ کا''گلدستہ کلیم''پروفیسرمشتاق احمد کا''نگاہ شوقؔ''ڈاکٹرمحمد سالم کا''درد کا سفر'' پروفیسرشاکرخلیق کا''احتساب جنوں''ڈاکٹرحلیمہ سعدیہ شگفتہ کا''غنچہ پھر لگا کھلنے''مقصود عالم رفعت کا''کربلائے زیست''ڈاکٹر پرویز انجم کا ''لفظوں میں زندگی''وغیرہ فروغ اردو کےحوالے سے ناقابل فراموش کارنامہ ہےاورمتھلانچل کی تخلیقی زرخیزی وشادابی کےشواہدبھی ان میں جابجاموجود ہیں۔

نثری اورصحافتی خدمات کےحوالے سےبھی متھلا کی کارگزاری لاجواب ہے۔نثری کارنامے میں سیداحمد جامعی کی کتاب ''لغات ابجد شماری''اختر الحسن پنڈولوی کی''عبد الغفور: حیات اور شاعری''پروفیسراظہاراحمدکی''مراثی شاؔد کافکری پہلو''پروفیسرسلطان احمدکی''میرانیسؔ بحیثیت رباعی نگار''عادل حیات کی''اختر انصاری اور ان کی غزل گوئی''ڈاکٹر ابراراحمد اجراوی کی''عربی ادبیات کے اردو تراجم''ڈاکٹرمحمد سالم کی''تنقیدی نظریے''پروفیسررئیس انورکی''بہار میں ناول نگاری ۱۹۸۰ء کے بعد''،''تحقیقی گوشے''اور''تنقیدی گوشے'' پروفیسرمشتاق احمد کی''سرسید کی نثری خدمات''اور''خوشبو جیسے لوگ'' ڈاکٹرذاکرحسین کی''تلاش ادب''اور''امام بخش صہبائی کی ادبی خدمات'' اورڈاکٹرسعود عالم کی''جزیروں کی بازیافت''وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

صحافت کےمیدان میں بھی عرصۂ دراز سے متھلا کا دبدبہ قائم ہے۔مولانا ابوالکلام آزاد کے رسالہ''الہلال''اور''البلاغ''کے نائب مدیرمولانا نورالہدیٰ نور تھےجنہوں نے مولانا آزادکی تجویز پراس کی مکمل ذمہ داری کچھ مدت کے لئےقبول کی اوراس کومقبول عام وخاص بنانے میں ان کے ساتھ برابر کےشریک رہے۔مطیع الرحمٰن احقؔر نے اخبار''دعوت'' سے منسلک ہوکرفکرونظر کےعنوان سے کالم لکھا۔مولانا نذرالحفیظ ندوی نےلکھنؤ سے نکلنے والاپندرہ روزہ رسالہ'تعمیرحیات'میں مدیر کے روپ میں کام کیا اورصحافت پرایک کتاب''مغربی میڈیا اور اس کےاثرات''لکھی جوادبی حلقوں میں بےحدمقبول ہوئی۔دربھنگہ سے تواتر کے ساتھ نکلنے والے موقر ومعیاری رسالہ''جہان اردو''کے مدیر پروفیسرمشتاق احمداس کے ذریعہ اردو کی توسیع وترقی میں نمایاں رول ادا کررہے ہیں۔اسی کڑی میں'تمثیل نو' اور''دربھنگہ ٹائمز''وغیرہ بھی شامل ہیں۔اس طرح متھلانچل کی بےشمار شخصیات نےصحافت کے حوالے سے اپنے کارنامے پیش کئے ہیں ان میں احمد جاوید، ڈاکٹرعطؔا عابدی،مولانا منورسلطان ندوی،مولانا غفران ساجد،مولانا عمرفاروق، ڈاکٹر امام اعظم ،مولانا ضیاء الحق اورڈاکٹر منصور خوشتر وغیرہ کے نام اہمیت کےحامل ہیں۔

فکشن کےحوالے سےمتھلا کاعلاقہ شاعری کے بالمقابل کم زرخیز رہاہے۔اس کی متعدد وجوہات میں مین اسٹریم سے دوری اور

وسائل کا بحران رہا ہے پھر بھی کوشش کر کے یہاں کے معدودے چند افسانہ نویسوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت کا ثبوت دیتے ہوئے نہ صرف اپنی موجودگی کا احساس دلایا بلکہ اچھے افسانے تحریر کئے اور فکشن کی دنیا میں مقبولیت بھی حاصل کی ۔ پروفیسر مشتاق احمد کا افسانہ ''انسان زندہ ہے'' ڈاکٹر سہیل احمد کا ''سونا پا خواب''، ڈاکٹر قیام نیر کا ''تحفہ''، سہیل جامعی کا ''ڈنک'' اور ڈاکٹر مجیر احمد آزاد کے افسانوی کارنامے ''دور بھنگہ میں اردو افسانہ نگاری''، ''جھکی ہوئی شاخ'' اور ''اندھیرے کا کرب'' وغیرہ اس سلسلے میں بطور نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس علاقہ میں اور بھی افسانہ نگار ہیں جن کا مکمل احاطہ یہاں ضروری نہیں معلوم ہوتا، البتہ طوالت سے بچتے ہوئے یہ نامناسب نہیں کہ یہاں متھلانچل کے چند ادبا و شعرا کا مختصر تعارف اور نمونۂ کلام پیش کر دیا جائے۔

مطیع الرحمن احقرؔ

مطیع الرحمٰن احقرؔ متھلا کی تاریخ میں ایک اہم نام ہے۔ جناب احقرؔ مختلف اوصاف و کمالات کے حامل تھے۔ وہ بیک وقت صحافی، شاعر، خوش کردار، اصول پسند اور حق گو انسان تھے۔ حکیم ظہور احمد وحشی کی قائم کردہ انجمن ''بزم ادب'' کی ادبی و شعری سرگرمیوں سے متاثر ہو کر انہوں نے صنف سخن میں طبع آزمائی شروع کی اور اس کے طرحی و غیر طرحی مشاعرے میں تواتر کے ساتھ شریک ہونے لگے اور رفتہ رفتہ ان کا جوہر سخن نکھرنے لگا۔ اس طرح انہوں نے قادر الکلام اور پیامی شاعر کی حیثیت سے اپنی پہچان بنائی ۔ ان کے مجموعۂ کلام میں حمد، نعت، نظم اور غزل جیسی اصناف سخن پر کامیاب طبع آزمائی کے نمونے موجود ہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ دیکھئے ۔

تری چوکھٹ پر جب جھکتی ہے یہ عاجز جبیں اپنی
تو دل میں ایک شان خسروی محسوس ہوتی ہے

ترے فیض کرم کی نورافشانی نہیں جاتی
مرے دل کی مگر تاریک سامانی نہیں جاتی

تری مفارقت میں میرا یہ حال ہوگا
جینا محال ہوگا ، مرنا محال ہوگا

پروفیسر رضوان احمد صدیقی

پروفیسر رضوان احمد صدیقی کو شعر و شاعری وراثت میں ملی تھی ۔ ان کے والد ایک اچھے شاعر، ادیب اور ناول نگار تھے۔ رضوان احمد صدیقی عام فہم زبان میں شاعری کرتے ہیں۔ ان کے اردو کلام میں ہندی الفاظ و محاورات کا استعمال بھونڈا نہیں معلوم ہوتا۔ وہ مزاح نگار بھی ہیں۔ ان کے اشعار اردو اور میتھلی دونوں زبان میں دستیاب ہیں۔ ان کی مزاحیہ نظم ''بھولا بابو'' میتھلی داں حلقہ میں بے حد مقبول ہے۔ میتھلی کا ایک شعر ذرا دیکھئے ۔

پانك پته بهيٹت يكهته
بيچت جتهه چلت يكهته

پروفیسر صدیقی کا شمار اردو کے مشہور شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں جھول اور ثقل پسندی بالکل نہیں ہے۔ ان کی قادر الکلامی اور شعری صلاحیت کا بخوبی اندازہ ان کے بیشتر اشعار سے ہوتا ہے ۔

تکبر کرنے والوں کو ہی شیطان کہتے ہیں
جو رکھ دے زخم پر مرہم اسے انسان کہتے ہیں

دشمنی کی دوستی ہی کاٹ ہے
دشمنی سے دشمنی بڑھتی رہے گی

منشی آشارام ذوقؔ

منشی آشارام ''نوادرات شوقؔ'' کے مطابق دربھنگہ کے باشندہ تھے۔ انہوں نے اپنے عہد کے نامور شاعروں کی زمین میں شاعری کی اور بے حد کامیاب رہے۔ علم عروض اور بلاغت کی فنی باریکیوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کا ذوق شعری اعلیٰ پایہ کا تھا جس کا احساس ان کے اشعار کے مطالعہ سے بخوبی ہوتا ہے۔ انہوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کر کے اردو دنیا میں ایک منفرد مقام حاصل کیا۔ ان کے کلام میں حسن زبان، حسن بیان اور حسن خیال کی عکاسی ان کی قادر الکلامی اور اردو سے لگاؤ کو ظاہر کرتی ہے۔ دربھنگہ راج میں فوجدار کے عہدہ پر فائز تھے باوجود اس کے، انہوں نے اردو کی آبیاری کی اور عمدہ کلام پیش کیا۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں ۔

دل تو کہے ہے آنکھوں نے مجھ کو کیا خراب
آنکھیں کہے ہیں دل ہی نے ہم کو ڈبا دیا
بگڑا کسی کا کچھ نہیں اے ذوقؔ مفت میں
دونوں کی ضد نے خاک میں ہم کو ملا دیا

مت نکل اشک مرے دیدۂ تر سے باہر
طفل آوارہ قدم رکھے ہے گھر سے باہر

منشی بہاری لال فطرتؔ

منشی بہاری لال فطرتؔ عربی اور فارسی کے علاوہ اردو کے ایک اچھے عالم تھے۔انہوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی اور کامیاب بھی رہے۔ وہ شعری خوبیوں اور خامیوں سے اچھی طرح واقف تھے اور زبان کو حسین بنا کر پیش کرنے میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔انہوں نے مہاراجہ لکشمی شور سنگھ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا جو قصیدہ کے فن پر کھرا اترتا ہے۔ اس میں ان کا مخصوص رنگ بھی جھلکتا ہے۔ قصیدہ کا ایک ٹکڑا بطور مثال پیش خدمت ہے ؎

محبت ہے گل رعنا کی جب تک دل میں بلبل کے
اثر ہے سرو کی الفت کا تا قمری کی طینت میں
الٰہی روزافزوں ہووے قدر و رتبہ دولت
ترقی ہو ہمیشہ عمر میں دولت میں حشمت میں
اب قصیدہ آج فطرتؔ ختم کرتا ہے
زہے قسمت اگر مقبول ہو بزم کرامت میں

متھلا کے دوسرے ادبا و شعرا میں منشی راجندر سہائے عشرتؔ، بابو پنجاب رائے طاہرؔ، اٹل بہاری لال اسیرؔ، پرتھی چند لال صباؔ، گلاب چند گلابؔ، منشی اجودھیا پرشاد بہارؔ، پدمانند افسرؔ، بھگوتی پرشاد ہمرازؔ، بندیشوری بسملؔ وغیرہ نے بھی اپنے محسوسات و جذبات کو اردو میں پیش کرنا شروع کیا اور اردو کو پروان چڑھانے میں کلیدی رول ادا کیا۔

متذکرہ بالا ادبا و شعرا کی تحریروں اور مختلف اصناف میں ان کی تخلیقات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ متھلانچل کے وسیع علاقہ میں اردو زبان و ادب کو فروغ دینے میں یہاں کے مسلم اور غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کا غیر معمولی رول رہا۔

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا، یہ ایک حقیقت ہے کہ جب دو یا دو سے زیادہ زبانیں بولنے والوں کا باہم اختلاط ہوتا ہے تو ایک دوسرے کو بڑی حد تک نہیں تو کسی حد تک ضرور متاثر کرتے ہیں۔اس کا حسین منظر میتھلی اور اردو زبان کے حوالے سے متھلانچل میں بخوبی دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔

اردو کے میتھلی زبان پر اثر نے یہاں کے متعدد غیر اردو داں طبقہ اور غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کو اس زبان میں اپنی تخلیقات پیش کرنے کی جانب ابھارا اور انہوں نے اردو شاعری اور فکشن کی سمت و رفتار اور روایات کی پیروی کرتے ہوئے اپنی توانا تخلیقات اور قیمتی نگارشات کے ذریعہ اردو شاعری اور ادب کو فروغ دینے کا کام انجام دیا اور اردو منظرنامے پر اپنا گہرا نقش چھوڑا۔اس طرح گراں قدر ادبی ذخیرہ جمع ہونے لگا اور اردو زبان و ادب کے فروغ کی تاریخ میں سرمایۂ افتخار ثابت ہوا۔مجموعی طور پر متھلا اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور یہاں کے ادبا و شعرا کی شعری و نثری خدمات ناقابل فراموش ہیں۔اردو زبان و ادب کی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر ناقص رہے گی۔(ریاض ترہت، اجودھیا پرشاد بہارؔ، آئینۂ ترہت، منشی بہاری لال فطرتؔ، بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا ۱۸۵۷ء تک پروفیسر اختر اورینوی، تذکرہ شعرائے مدھوبنی، شائق یکہتوی، تذکرہ بزم شمال، شاداںؔ فاروقی، دیدہ وران بہار، حافظ عبدالمنان طرزی اور انڈو آرین اینڈ ہندی، ڈاکٹر سنیتی کمار چٹر جی سے اخذ و استفادہ کے ساتھ) ❁❁

خریدار اور کرم فرما حضرات سے......

''زبان و ادب'' کی تازہ اشاعتیں، خریدار اور کرم فرما حضرات کے پتہ پر بروقت بھیج دی جاتی ہیں۔ پرچہ سادہ ڈاک سے روانہ کیا جاتا ہے۔ پرچہ کے تاخیر سے ملنے یا نہیں پہنچنے کی صورت میں، اپنے علاقہ کے ڈاکیہ اور مقامی ڈاک خانے سے رجوع کریں۔ادارہ ڈاک میں پرچہ کی گم شدگی کا ذمہ دار نہیں۔

شخصیات

مشتاق احمد نوری

"Hasan Apartment" Khalilpura Road, Phulwarisharif, Patna - 801505

سرسید احمد خاں: کٹہرے میں.....؟

سرسید احمد خان کا نام سامنے آتے ہی علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ یونیورسٹی کی مکمل تفصیل پھر کبھی سہی، فی الوقت میں دو چار نکتے پر ہی اپنی گفتگو مرکوز رکھنا چاہوں گا۔

سرسید احمد خاں نے بہت آسانی سے یہ سب نہیں کرلیا۔ ان کے راستوں میں تکالیف اور تنازع کے پہاڑ کھڑے کئے گئے جس کا مقابلہ کرنے کے بعد ہی وہ کامیاب ہوئے۔

سب سے بڑا روڑا وہ فتاوے تھے جو گورکھپور کے حاجی علی بخش خان نے مکہ اور مدینہ جاکر وہاں کے علما اور مفتیان سے حاصل کئے۔ سوالات بڑے عجیب تھے:

> ''کیا آپ حضرات ایک ایسے کالج کے قیام کی منظوری دیں گے جس کا بانی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج جسمانی کا قائل نہیں، جو آدم وحوا کے تذکروں پر یقین نہیں رکھتا اور جو مسلمانوں کو فرنگیوں کے طور طریقے اور بود وباش اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔''

مکہ کے چار مفتیان کا فتویٰ تھا کہ ایسا شخص شیطان کا تابعدار ہے اور نیک لوگوں کو گمراہ کرتا ہے۔ اگر وہ ایسے بدطینت کاموں کی ضد کرتا ہے تو اس کے خلاف جسمانی قوت کا استعمال کرنا چاہئے۔

مولوی علی بخش خان نے مدینے سے بھی ایک فتویٰ حاصل کیا جس میں کہا گیا تھا کہ اگر ایسا اسکول قائم ہوجائے تو سارے مسلمانوں کو مل کر اسے منہدم کردینا چاہئے۔

سرسید احمد خان دراصل ایک بہترین اسکول کا قیام چاہتے تھے جو انگریزوں کے قائم کردہ اسکول سے بہتر ہو۔

اصل معاملہ یہ تھا کہ سرسید نیچر پر یقین رکھتے تھے نیچر کے خلاف معاملے پر وہ یقین نہیں رکھتے تھے، اس لئے رسول پاک سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے جسمانی معراج کو نہیں مانتے تھے۔ ابراہیم علیہ السلام کا آگ میں نہ جلنا بھی نیچر کے خلاف تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کا دریائے نیل سے گزرنا بھی انہیں تسلیم نہیں تھا۔ یونس علیہ السلام کا مچھلی کے پیٹ سے زندہ بچنا بھی نیچر کے خلاف تھا۔ فتویٰ دراصل ان کے دینی عقیدے کے خلاف لینا تھا، لیکن چالاک اور بدخواہ لوگوں نے اسے ان کی مغربی تعلیم اور اس کے لئے کالج کے قیام سے جوڑ دیا، حالاں کہ بعد کے دنوں میں سرسید اپنے مذکورہ خیالات سے تائب بھی ہوگئے اور قرآن کی تفسیر بھی لکھی۔

کالج کے روڈ میپ کے لئے ۱۸۶۹ء میں وہ لندن تشریف لے گئے وہاں آکسفورڈ یونیورسٹی اور کیمبرج یونیورسٹی کی عمارت اور تعلیم کا جائزہ لیا۔ انگلستان میں شاید ہی ایسی کوئی رات گزری ہو جب کہ سرسید احمد خاں اور ان کے بیٹے سید محمود نے کالج کی اسکیموں پر غور نہیں کیا ہو۔ سچ پوچھا جائے تو ایم اے او کالج کا قیام ۱۸۷۰ء میں لندن ہی میں عمل میں آچکا تھا۔ کالج کی عمارت اور تعلیم کے نمونے کیمبرج یونیورسٹی کی طرز پر تیار کروائے گئے۔ انگریز انجینئر سے کالج کے نقشے بھی بنوالئے گئے۔

لندن سے واپسی پر کالج پر کام شروع کیا تو کچھ کٹھ ملاؤں کو یہ منظور نہ ہوا کہ انگریزی طرز کے کالج کا قیام عمل میں آئے اس لئے فطین ذہنیت کے لوگوں نے اسے روکنے کے لئے حاجی علی بخش خان کے ذریعہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے مفتیان سے فتوے حاصل کئے۔

سرسید احمد نے ہار نہیں مانی۔ کالج کے لئے چندے اکٹھے کئے گئے۔ اس کوشش کے نتیجہ میں ۲۶ مارچ ۱۸۷۳ء تک ۷۵ ہزار ۱۳۹ روپے، ۵/فروری ۱۸۷۵ء تک دو لاکھ اور ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء تک ساڑھے تین لاکھ روپے کا اثاثہ موجود تھا۔

سرسید احمد خان پر ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ وہ زیادہ تر

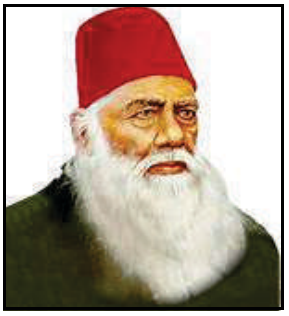

اشرافیہ طبقے کے لوگوں سے تعلق رکھتے تھے اور غیر اشرافیہ کو ترجیح نہیں دیتے تھے۔ سچائی یہ تھی کہ اس زمانے میں جو بھی امرا تھے، ان کا تعلق اشرافیہ طبقے سے تھا اور مالی اعتبار سے وہ مضبوط بھی تھے، سرسید کی مدد بھی کرتے تھے۔ چندہ دینے میں ہندو بھی پیش پیش تھے۔ سب سے زیادہ عطیہ وزیانگرم کے مہاراجہ نے چونتیس ہزار روپے دیا تھا۔ غیر اشرافیہ کے پاس دولت کی فراوانی نہ تھی اس لئے وہ سرسید کے رابطے میں کم آئے۔ ان پر ایک الزام یہ بھی تھوپا جاتا ہے کہ وہ انگریزوں سے بہتر قریب رہے۔ ان کی مصاحبت کرتے تھے۔

سرسید احمد خاں نے ۱۸۴۱ء میں منصفی کا امتحان پاس کیا اور مین پوری کے منصف ہوئے، ۱۸۵۸ء میں صدرالصدور ہوکر مرادآباد آئے۔ ۱۸۶۷ء میں بنارس تبادلہ ہوا اور ۱۸۷۶ء میں بنارس سے سبکدوشی اختیار کی۔ اس دوران انگریزوں سے ان کے اچھے تعلقات قائم ہوئے۔ جب علی گڑھ چھاؤنی کے پریڈ گراؤنڈ میں اسکول کی سنگ بنیاد رکھنے کا فیصلہ ہوا تو سرسید احمد نے اپنے اسی تعلقات کی بنیاد پر ۱۸۷۴ء میں ۷۴ بیگہ غیر زرعی زمین سرکار سے حاصل کی۔ ۴/اکتوبر ۱۸۷۴ء میں قلیل مدت کے لئے کلکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے تو سرسید کے دشمنوں کے اکسانے پر زمین کی مخالفت شروع کردی گئی، پھر سرسید احمد نے یوپی کے لیفٹننٹ گورنر مسٹر جان الفراڈ ایلیٹ کو خط لکھا کہ جب علی گڈھ کے کلکٹر مسٹر سی ایچ لارنس نے اپنے ۱۴ مارچ ۱۸۷۴ء کے خط کے ذریعہ زمین منظور کردی تو کالج کا کام بھی شروع ہوگیا، مگر اب رکاوٹ سے کام کرنا مشکل ہورہا ہے۔ گورنر نے مارچ ۱۸۷۵ء کو زمین کا باضابطہ معائنہ کرنے کے بعد زمین کی منظوری بحال کردی۔ یہ سب کچھ اسی لئے ممکن ہوا کہ سرسید کے تعلقات انگریز افسروں سے بہتر تھے۔ اس تعلقات کا فائدہ اپنے ذاتی کام کی بجائے قومی ادارے کے لئے اٹھایا گیا۔ جب ان پر اتنے سارے الزامات لگا کر کام نہ بنا تو ایک الزام یہ لگایا گیا کہ سرسید مسلم لڑکوں کو تو تعلیم یافتہ کرنا چاہتے ہیں، لیکن لڑکیوں کی تعلیم نہیں چاہتے۔ سچائی یہ تھی کہ وہ دور ہی مسلمانوں کی جہالت کا تھا۔ نیا نیا کالج کھلا تھا، لڑکے مشکل سے تعلیم کے لئے آگے آرہے تھے۔ لڑکیوں کو بھی آنا تھا۔ سرسید احمد نے پنجاب کی خاتون سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

> ''اے میری بہنو! میں اپنی قوم کی خاتون کی تعلیم سے بے پرواہ نہیں ہوں۔ میں دل سے ان کی تعلیم کا خواہاں ہوں۔ تم یقین جانو کہ دنیا میں ایسی کوئی قوم نہیں جس میں مردوں کی حالت درست ہونے سے پہلے عورتوں کی حالت درست ہوگئی ہو۔ ایسی کوئی قوم نہیں جس میں مردوں کی حالت درست ہوئی اور عورتیں محروم رہ گئیں۔ میں عورتوں کی تعلیم پر بھی غور کررہا ہوں۔ تم یہ نہ سمجھو میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں۔''

ان کی لمبی تقریر کا مقصد یہ باور کرانا تھا کہ وہ لڑکیوں کی تعلیم پر بھی غور کرنے والے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ اسی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے لڑکیوں نے بہت سے شعبوں میں لڑکوں سے بازی ماری۔

ہر دور میں بہتر کام کرنے والوں کی راہ میں روڑے اٹکائے جاتے ہیں۔ سرسید احمد خاں نے بھی بہت سی مخالفت کا سامنا کیا، مگر کبھی سرنگوں نہ ہوئے، یہی وجہ ہے وہاں کے فارغین آج بھی اپنے نام کے ساتھ علیگ لگانے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور سر اُٹھا کر، سینہ سپر ہوکر ہر میدان میں مستقل مزاجی سے موجود ملتے ہیں۔ ❁❁

ہم کو کیا سیکھنا چاہئے؟

ہم کو کیا سیکھنا چاہئے؟ یہی ایک سوال ہے جس پر ہندوستان کی ترقی اور تنزل کا مدار ہے۔ اگر ہم نے اس کا صحیح جواب سمجھ لیا اور اُس پر عمل کیا تو بلاشبہ ہم نے ترقی کا راستہ پایا اور اگر ہم نے اس کے جواب کے سمجھنے میں غلطی کی تو بلاشبہ ہم سیدھے راستے سے بھٹک گئے، مگر اکثر اس سوال کے جواب میں دھوکا پڑتا ہے..... دنیا میں اچھی اور بری سب چیزیں موجود ہیں، یہ ہمارا کام ہے کہ ہم اُن میں سے اُس کو منتخب کریں جو ہمارے لئے بہتر ہو اور اپنی اولاد کی تعلیم کے معاملے میں غور کریں اور سمجھیں کہ کون کا طریقہ اختیار کرنا اُن کے حق میں بہتر ہے۔

(سرسید احمد خاں)

حکیم رشاد الاسلام

"Shaafi Dawakhana" Matab Hakeem Ziauddin Zia, 123/138-A, Sabzi Mandi Chowk
Allahabad - 211003 (Mob. 9559669955)

فراقؔ: انسانیت کے اعلیٰ مدارج پر فائز

آنے والی نسلیں تم پر رشک کریں گی
جب ان کو دھیان آئے گا فراقؔ کو دیکھا ہے

فراقؔ گورکھپوری کی پیدائش ۲۸ اگست ۱۸۹۶ء کو شہر گورکھپور اتر پردیش میں ہوئی اور دہلی میں ان کا انتقال ۳؍مارچ ۱۹۸۳ء میں ہوا۔ فراقؔ گورکھپوری کا اصل نام رگھوپتی سہائے اور تخلص فراقؔ گورکھپوری تھا۔ فراقؔ صاحب نے بچپن سے والدین کے ذریعے تلسی داس کی رامائن کا پاٹھ سنا تھا، اسی لیے ان کے مزاج میں شائستگی سرائیت کر گئی تھی، جس کا وہ زندگی بھر نمونہ بنے رہے اور یہی وہ اصل وجہ تھی کہ خدمت خلق ان کا وطیرہ بنی ہوئی تھی، وہ تاحیات انسان کی عظمت وانسانیت کی تبلیغ کرتے رہے۔ ان کی موت کے بعد اگر چہ انہیں ملک کے اندر اور ملک سے باہر زبردست خراج عقیدت پیش کیا گیا، لیکن اس سے صرف نظر کرتے ہوئے یہاں اصلاً یہ ذکر مقصود ہے کہ اس عظیم شاعر نے جو اپنے خاندان والوں سے دور صرف اپنے ملازمین کے ساتھ رہا، ان خدمت گاروں پر کیا اثرات چھوڑے، اس کا پتہ لگانے کے لیے میں نے سوچا کہ کیوں نہ فراقؔ صاحب کے ملازموں سے ملا جائے، چنانچہ میں ان کے بنگلہ واقع بینک روڈ گیا۔ اس وقت ان کے بنگلہ پر بالکل سناٹا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے یہاں کبھی کوئی رہا ہی نہ ہو، لان پر دو ایک کرسیاں پڑی تھیں، جن پر کچھ اخبار والے بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔

آہ یہ مجمع احباب یہ بزم خاموشی
آج محفل میں فراقؔ سخن آرا بھی نہیں

یہاں سب سے پہلے میری ملاقات فراقؔ صاحب کے سکریٹری رمیش دیویدی سے ہوئی، رمیش فراقؔ کے ساتھ قریب تیس سال سے تھے، انہوں نے مجھے بتایا کہ:

''فراقؔ صاحب نے ہم لوگوں کے ساتھ ایک اچھے مالک کا برتاؤ کیا، وہ ایک اچھے رحم دل انسان تھے، وہ ہر کام مجھ سے پوچھ کر ہی کیا کرتے تھے۔ وہ ہم لوگوں کا بہت خیال رکھتے تھے، اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگائیے کہ جب ۱۹۷۳ء میں وہ روس جانے والے تھے تو انہوں نے سرکار سے صاف کہہ دیا تھا کہ ان کے ساتھ ان کے ملازم بھی جائیں گے، لیکن بعد میں وہ روس نہیں گئے اور پروگرام ختم ہو گیا۔''

رمیش نے آگے کہا:

''فراقؔ صاحب تو زندہ نہیں، اب صرف ان کی یادیں ہی باقی رہ گئی ہیں۔ میں فراقؔ صاحب کے ساتھ آخری وقت تک رہا ان کے چہرے پر وہی شاعرانہ انداز، آنکھوں میں وہی چمک تھی، ان کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ دہلی سے الٰہ آباد لے چلو۔''

رمیش نے بتایا کہ فراقؔ صاحب نے جوشؔ کی خبر سن کر ڈاکٹر سے کہا تھا:

''کیا ڈاکٹر صاحب آپ میرے دل میں جو درد اٹھا ہے اسے ٹھیک کر سکتے ہیں۔''

ان کی خواہش یہ تھی کہ ان کے مرنے کے بعد ان کے ملازموں کو کام پر لگا دیا جائے، یہ ملازم اِدھر اُدھر نوکری کے لیے نہ بھٹکیں۔

رمیش جی سے میں نے پوچھا فراقؔ صاحب کا سب اچھا شعر جو آپ کو پسند ہو، سنائیے انہوں نے یہ شعر سنایا ؎

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

رمیش نے روتے ہوئے کہا، لیکن موت کے ناپاک ہاتھوں نے فراقؔ صاحب کو معاف نہیں کیا۔ خدا کے سامنے کوئی کر بھی کیا سکتا ہے۔

رمیش کے بعد میں فراقؔ صاحب کے ایک بہت خاص ملازم پنا سے ملا جو فراقؔ صاحب کے ساتھ ۳۵ برسوں سے تھا۔ وہ فراقؔ صاحب کو کھانا کھلاتا، پاخانہ پیشاب کراتا، سگریٹ جلا کر دیتا غرض کہ وہ فراقؔ صاحب کا سبھی ذاتی کام کرتا تھا۔

پنا نے بتایا بابو جی ہم کو بہت مانتے تھے، ان کے چلے جانے کے بعد اب ہم کو یہاں اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ پنا نے کہا بابو جی کبھی بہت غصہ ہوتے، کبھی بہت خوش ہوتے، خوش اس دن مجھ سے بہت زیادہ ہوئے تھے جب دہلی میں اسپتال میں اندرا گاندھی فراقؔ صاحب سے ملنے آئیں۔ فراقؔ صاحب نے مجھ سے پوچھا کون آیا ہے میں نے کہا ''اندو'' (اندرا گاندھی کا گھر کا نام پہلے یہی تھا) آئی ہیں۔ فراقؔ صاحب نے کہا تم کو ابھی تک یہ نام یاد ہے، میں تو بھول گیا تھا۔

پنا نے مزید بتایا کہ فراقؔ صاحب سے اور مجھ سے مقدمہ بھی چلا، واقعہ یہ ہوا تھا کہ فراقؔ صاحب کے گھر سے ان کے بہت سے میٹل اور کچھ سامان چوری ہو گئے انہوں نے کچھ لوگوں کے ساتھ چوری میں میرا نام بھی لکھوا دیا، لیکن بعد میں جب ان کو پتہ چلا کہ میں بے قصور تھا تو انہوں نے مقدمہ واپس لے لیا، ایسے اچھے آدمی تھے فراقؔ صاحب۔

پنا نے فراقؔ صاحب کے بارے میں جانکاری دیتے ہوئے اور بہت کچھ بتایا، مثلاً یہ کہ جب میں پہلے پہلے کام کرنے فراقؔ صاحب کے گھر آیا تو میں بہت بور ہوتا تھا، کیونکہ میں جاہل اَن پڑھ اور یہاں پڑھے لکھے لوگ تھے، میری بوریت کو بھانپ کر فراقؔ صاحب ایک ریڈیو خرید کر لائے اور مجھ کو دیا اور کہا، پنا اس کو سنا کرو۔ فراق صاحب کے یہاں کوئی ضرورت مند آتا تو وہ خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا۔

پنا نے یہ بھی بتایا فراقؔ صاحب مذاق بھی بہت کرتے تھے، ایک بار ایک محفل میں کسی نے فراقؔ صاحب سے کہا کھڑے ہو کر شعر سنایئے فراقؔ صاحب بولے میرے پائجامہ کا آزار بند کھلا ہے۔ پنا نے کہا یہ ہمارا سو بھاگیہ ہے کہ ہم اتنے بڑے شاعر کے یہاں تھے، ان کا ایک شعر ہم کو بہت پسند ہے ؎

کسی کا کون ہوا عمر بھر مگر پھر بھی
یہ حسن وعشق تو دھوکہ ہے مگر پھر بھی

پنا کے بعد میں فراقؔ صاحب کے بستر کے خدمت گار طوفانی سے ملا، جو فراقؔ صاحب کے گھر کا سارا کام کرتا تھا، بازار سے سامان لانا، گھر کو صاف رکھنا، وغیرہ۔ طوفانی نے روتے ہوئے کہا کہ فراقؔ صاحب ایسا مالک ہم کو نہ ملے گا، وہ لوگوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ جب وہ کھانا کھاتے تو ہم لوگوں سے برابر پوچھتے، کھانا کھایا کہ نہیں؟ ہم نے بابو جی سے بہت کچھ سیکھا، بھگوان بابو جی کو جنت دے بابو جی نے جو احسان ہم لوگوں پر کیے ہیں، بھگوان اس کا پھل ان کو ضرور دے گا۔ بات چیت کے دوران طوفانی روتا رہا میں نے اس سے پوچھا فراقؔ صاحب کا کوئی شعر تم کو یاد ہے وہ بولا ہم جاہل ضرور ہیں، لیکن ایک شعر کا مطلب خوب سمجھ گئے تھے۔ فراقؔ صاحب اپنی زندگی میں ہی سمجھ گئے تھے کہ وہ بہت بڑے آدمی ہیں ؎

آنے والی نسلیں تم پر رشک کریں گی
جب ان کو دھیان آئے گا فراقؔ کو دیکھا ہے

پنا کے بعد میں فراقؔ صاحب کے آخری اور چوتھے خدمت گار مایا سے ملا۔ مایا دراصل ایک فقیر تھی جو کسی طرح مانگتے مانگتے فراقؔ صاحب کے گھر آئی اور فراقؔ صاحب نے اسے اپنے یہاں نوکر بنا کے رکھ لیا۔ مایا روتی ہوئی کہنے لگی:

ہمارا اب کا (کیا) ہوئی (ہوگا) بابو تو چلے گئے اب ہم کو کون کھانا دے گا۔''

فراقؔ صاحب اسے بہت مانتے تھے۔

میں ان سب سے ملنے کے بعد بنگلہ کے باہر بینک روڈ پر چل رہا تھا اور سوچ رہا تھا ایک شاعر بھی کیا ایک اچھا مالک ہو سکتا ہے، اپنے نوکروں کے دل پر اپنے نقش چھوڑ سکتا ہے، ان سوالوں کا جواب مجھے مل چکا تھا، اور مجھے اردو کے اس بلند فکر انسان اور انسانیت کے اعلیٰ مدارج پر فائز بے باک شاعر کا ایک شعر یاد آ گیا ؎

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تری رنجش بیجا بھی نہیں

فراقؔ صاحب کے انتقال پر اس وقت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے

انہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے جس طریقے سے اپنی ہمدردی کا والہانہ اظہار کیا تھا وہ بھی ایک نظیر ہے اردو ادب کے لیے:

''فراق گورکھپوری کی وفات سے چند روز قبل جوشؔ رخصت ہوئے، آج فراقؔ کی باری آ گئی۔ ادب کی دو قد آور شخصیتیں اُٹھ گئیں۔ اردو اور ہندوستان کو دو کاری ضربیں لگیں، موت ہمیشہ غمناک ہوتی ہے اور ایک شاعر کی وفات تو خاص طور پر تکلیف دہ ہوتی ہے، کیونکہ وہ پیام حسن دیتا ہے اور ہمارے شعور میں احساس پیدا کرتا ہے، اس کے ساتھ یہ اس بات کو یاد کرنے کا موقع ہے کہ شاعر نے ہم سب کو کس طور پر مالا مال کیا۔ فراقؔ کو شگفتگیٔ فن کا ملکہ حاصل تھا، انہوں نے انسان کے لاتعداد پہلوؤں مثلاً لطافت وقہقہہ و برہمی اور اخلاص کی کھوج کی اور ہمارے عوام کے تہہ در تہہ شعور کو متاثر کیا، میرے لیے فخر کی بات یہ ہے کہ میں ان کو برسوں سے جانتی تھی، وہ وقتاً فوقتاً مجھے خط لکھتے تھے، جس طرح میرے والد لکھا کرتے تھے۔''

غور کیجیے ملکی وزیر اعظم اپنے تعلق کی بات نہیں کر رہی ہیں ایک عظیم والمرتبت اور بلند و بالا ایسے شاعر کے بارے میں بات کر رہی ہیں جنہوں نے ہندوستانی عوا کا شعور بیدار کیا۔ انہیں اخلاص و ہمدردی کے معنی و مطالب بتائے، سچ پوچھیں تو یوں ہی فراقؔ کا شعر اور ادبا میں بلند و بالا مرتبہ نہیں تسلیم کیا گیا بلکہ ان کی انسانیت و اخلاقی قدروں کی فکر نے انہیں فراقؔ صاحب بنایا اور اپنے خادم کے سامنے ایک مرتبہ وہ اندرا گاندھی کو ''اندو'' کہتے ہیں تو اس میں ان کے خلوص کا بڑا دخل ہے۔

میں سمجھتا ہوں فراقؔ صاحب کے انتقال کے بعد جس طرح کے مضامین ان کی شخصیت اور فن پر لکھے گئے یا ان کے ساتھ کیے گئے انٹرویو کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا، وہ فراقؔ صاحب کے چاہنے والوں کے لیے یقینی فخر کی بات ہے۔ انگریزی اخبار کی خصوصی پیشکش ''سنڈے میگزین'' Sunday Magzine میں شائع ایک انٹرویو کے متعلق آپ کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کرتا ہوں۔ سندھیا سنگھل نے اپنے انٹرویو میں فراقؔ صاحب کو (Diligent and the man) ''دا لیجنڈ اینڈ دامین'' کی سرخی کے ساتھ یاد کرتے ہوئے لکھا:

''فراقؔ صاحب بین الاقوامی سطح پر اردو کے عظیم ترین شاعروں میں سے ایک کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی عیار عقل، سنکی طرز عمل اور حقارت یا قائم کردہ اصولوں نے ان کی پہلے سے ہی پراسرار شخصیت کو بدنامی کی ایسی چمک عطا کی ہے جو رنگا رنگ فراقؔ لیجنڈ کا حصہ اور پارسل بن گئی ہے۔ ان کی بول چال نے جب کہ کچھ کو ناراض بھی کیا، اسے بہت سے دوسرے لوگوں کے لیے جنہوں نے ان کی ذہانت کی جھلک دیکھی تھی۔''

سندھیا سنگھل نے ایک زندہ لیجنڈ فراقؔ گورکھپوری کا انٹرویو کیا جو چوراسی سال کی عمر میں اپنی الہ آباد رہائش گاہ پر عملی طور پر بستر پر پڑے زندگی گزار رہے ہیں۔

اس انٹرویو میں سندھیا سنگھل نے غیر معمولی باتیں سامنے لانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ سب فراقؔ صاحب سے دریافت کیا جس سے عام قاری محروم تھے، کسی کا سنکی طرز عمل، قائم کردہ اصولوں پر زور دیا جانا ضرور ان نکات کی طرف زشارہ کرتا ہے جس کی بنیاد شخصیت اور اس کے فن پر مبنی ہے۔ فراقؔ صاحب سندھیا سنگھل کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے جو کچھ کہتے ہیں، اسے سندھیا سنگھل نے من وعن نقل کیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ:

''فراقؔ کی ایک رنجش یہ ہے کہ لوگ ان سے ان کی زندگی، اس کی مقبولیت اور ان سے جڑی بے شمار افواہوں کے بارے میں پوچھتے ہیں، لیکن وہ ان سے ان کی شاعری کے بارے میں کبھی نہیں پوچھتے، جس کی وجہ سے وہ مقبول ہوئے اور ان کے بارے میں بہت چرچا ہوئی۔''

فراقؔ صاحب نے اپنی سگریٹ نوشی پر بھی اظہار خیال خود ہی کیا ہے، سندھیا سنگھل نے فراقؔ صاحب کی زبان سے ادا ہوا جملہ من وعن اس انٹرویو میں شامل کیا تھا:

''میں ابھی سگریٹ پی رہا ہوں، اور یہ میرے لیے جیل جانے سے کہیں زیادہ اہم ہے۔''

آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ اپنے خاص معاملات اور ذاتی زندگی کے بارے میں کس قدر سچے اور حق پرست انسان گزرے ہیں۔

فراقؔ صاحب سے نورالحسن ہاشمی کی ملاقات کا ذکر آپ کے سامنے لانے کا مقصد ان کی اردو نوازی اور اردو زبان کی طرف مائل ہونے کی وضاحت کرنا ہے۔نورالحسن ہاشمی سے ملاقات کے دوران ہوئی گفتگو میں ایک جگہ فراقؔ صاحب فرماتے ہیں کہ اٹھارہ یا اُنیس برس کی عمر میں یہ محسوس کیا کہ جانتا تو میں تھوڑی سی اردو تھا،لیکن میرے کان میں اور ہندوستان کی زبانوں میں بھنک تو پڑ جاتی تھی۔

فراقؔ صاحب کے بارے میں اس قدر تفصیل سے معلومات اپنے اس مضمون میں داخل کرنے کا ایک معقول جواز میرے پاس یہ بھی ہے کہ فراق صاحب کے حوالے سے ''قومی آواز'' اخبار کے ذریعے جو خبریں ومضامین میرے مطالعہ سے گزرے انہیں آج تک سنبھالا ہوا ہے۔ دوسری بات یہ کہ فراق صاحب سے چونکہ میری کئی ملاقاتیں رہی ہیں اس لیے میں نے انہیں جس قدر اور جن جن حالات میں جیسا پایا ویسا نقل کرنے کی کوشش کی ہے۔

فراقؔ صاحب کی شخصیت اور ان کی شاعری کے بارے میں آیئے میں بھی کچھ ذاتی طور پر بتاتا چلوں، تاکہ سخن فہمی کی بنیاد پر مجھے جو غلط فہمی خود کی ذات سے ہوئی ہے اس کا ازالہ ہو سکے۔ جہاں تک میرا خیال ہے فراقؔ صاحب بھی دیگر شعرا کی طرح اردو زبان کے گرویدہ ہوئے، ان کی شاعری کئی صدی کے تجربوں کی شاعری ہے۔ فراقؔ انگریزی شاعری کے رموز واسرار سے پوری طرح آشنا تھے۔

فراقؔ صاحب نے اردو میں عشقیہ شاعری اور ہندوستانی تصور جمال کی ترجمانی نہایت خوبصورتی اور کامیابی سے کی ہے۔ گویا کہ فراقؔ صاحب نے غزل کی مروجہ روایت سے کام لیا ہے۔ تاہم اردو

غزل کو ایک نیا مزاج دینے میں اور اس کی ساخت و برداخت میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ ان کی فنکارانہ عظمت کی وجہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے غزل کی روایت کو نئی بلندیاں عطا کی ہیں۔ جگہ جگہ ان میں ایک نئی فضا اور نئے عزائم کا احساس ہوتا ہے۔ فراقؔ صاحب کی شاعری کا میں ہی اکیلا طرفدار نہیں ہوں، بہت سے مداحوں میں ایک نام ندآؔ فاضلی کا بھی ہے، ندآؔ فاضلی نے ایک موقع پر اپنے ایک خط میں فراقؔ صاحب کے بارے میں لکھا تھا، جسے یہاں میں یادگار کے طور پر شامل تحریر کر رہا ہوں:

> ''فراقؔ بڑے دائرے کے بڑے شاعر ہیں۔ اسے اردو کی خوش قسمتی کہیے کہ فراقؔ نے اسی غزل کو اپنی شخصیت کی روشنی سے منور کیا جسے حالیؔ کے اصلاحی جنون نے بے عزت کر کے ادب بدر کیا اور بعد میں ترقی پسندوں نے اس کی گردن مارنے کا اعلان نامہ صادر فرمایا۔ غزل کی جاندار روایات کی نئی دریافت فراقؔ کا اہم کارنامہ ہے۔ انہوں نے غزل کو ہم عصر اکثر ذہنوں کی سطحیت سے ہی آزاد نہیں کیا، اسے ایک ایسا جیتا جاگتا ذہن بھی عطا کیا جو اپنے عہد میں ممتاز ہونے کے ساتھ آنے والے دَور کے امکانات کی بشارت بھی سناتا ہے.....غزل کے وہ جانے پہچانے کردار جو بڑی حد تک جنسی گھٹن کے چونچلوں اور دور دور کی مریضانہ عاشقی کے شکار تھے، فراقؔ کے یہاں سماجی شائستگی اور انسانی تہذیب کے مناظر میں زندہ علامتیں بن کر ابھرتے ہیں۔ یوں تو فراقؔ نے شعری زبان میں نظم کے اچھے شاعروں کی طرح کسی نمایاں اجتہاد کا ثبوت نہیں دیا، لیکن وہی الفاظ، تراکیب جو دیگر شاعروں کی غزلوں میں روایت زدہ اور فرسودہ محسوس ہوتے ہیں، فراقؔ کی غزل میں فراقؔ کی شخصیت کی طرح وسیع اور تہہ دار بن جاتے ہیں۔ فراقؔ کی غزل جذبہ کو ذہن اور ذہن کو احساس میں تبدیل کرنے کا ایک انوکھا تجربہ ہے، اسی تجربہ نے ان کی غزل کو ایک ایسے آفاقی مزاج سے روشناس کیا ہے جو غالبؔ ومیرؔ کے بعد اردو غزل کی تیسری غزل کہی جا سکتی

(بقیہ ص ۶۴ پر)

ڈاکٹر محمد محمود عالم
At.P.o. Sigori, Dist, Patna, Pin-801110 (Mob.8083837666)

آل احمد سرور کی شخصیت کے امتیازات

اردو نقد وادب میں آل احمد سرور کا نام بڑی ہی عزت سے لیا جاتا ہے اور ایسا کیوں نہ ہو کہ آل احمد سرور یقیناً ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی شخصیت کی تعمیر میں گھریلو ماحول کے علاوہ بلاشبہ علی گڑھ کی گہری چھاپ بھی موجود ہے اور ان کے ذہن کی تعمیر میں ابتدائی اساتذہ کے علاوہ رشید احمد صدیقی، ذاکر صاحب، اقبال، خواجہ غلام السیدین، خواجہ منظور حسین، سر راس مسعود کا فیضان بھی شامل ہے۔ مشہور افسانہ نگار وقار عظیم نے لکھا ہے کہ:

''سرور صاحب سے جو شخص بھی جیسے جیسے قریب ہوتا جاتا ہے ان کے مزاج کی نرمی اور دھیمے پن کا نقش اس کے دل پر گہرا ہوتا جاتا ہے۔''

سرور صاحب مصلحت پسندی اور موقع پرستی کے ہمیشہ مخالف رہے۔ وہ اس بات پر پوری طرح قدرت رکھتے تھے کہ جب کوئی کام آپڑے تو تن آسانی کو خیر باد کہہ کر پورے طور پر کام میں مصروف ہو جائیں اور اس کام کو اس طرح انجام تک پہنچائیں جیسا کہ اس کا حق ہے۔

سرور صاحب اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ ایک بہت ہی ذہین وفطین اور نہایت مخلص انسان، انہیں شروع ہی سے مضامین لکھنے کا شوق تھا۔ کالج کے میگزین کے لئے غزلیں اور نظمیں بھی لکھا کرتے تھے۔ لکھنے کے علاوہ کتب بینی کے شوقین تھے۔ انگریزی ناولوں کا مطالعہ شوق سے کیا کرتے ہیں تھے، انہوں نے خود ہی لکھا ہے کہ:

''اس زمانے میں ہارڈی کے بہت سے ناول پڑھے اور اب تک یاد ہے 'Jude Obseure' پڑھ کے بے اختیار رونے لگا۔''

آل احمد سرور کو کئی زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔ اس شوق کی وجہ سے انہوں نے مختلف زبان وادب کی خوشہ چینی کی۔ مشرقی اور مغربی ادب کی خوبیوں کو انہوں نے اپنی تحریروں میں اس طرح سمو لیا ہے کہ اس کا خود، اپنا ایک منفرد رنگ بن گیا ہے۔

سرور صاحب جب بی۔ ایس۔ سی کے آخری سال میں زیر تعلیم تھے، انہیں دیر تک جاگنے کی عادت پڑی اور ایک مستقل عادت بن گئی۔ سرور صاحب کو شروع ہی سے اخبار کے مطالعے کا شوق تھا۔ انگریزی اخبار کا مطالعہ بلاناغہ کرتے تھے۔ اردو اخبار ''مدینہ'' کا مطالعہ بھی برابر کیا کرتے تھے۔

زندگی میں جس طرح انہوں نے مرتبہ شناسی اور قدردانی کو اپنا مسکن بنایا ہے، اسی طرح تنقید میں بھی ان کا نقطہ نظر ادیب اور شاعر کے صحیح مرتبے کی پہچان ہے۔ ادب میں جہاں کہیں انہوں نے یہ محسوس کیا کہ کسی ادیب یا شاعر کو زمانے نے اس کا پورا حق نہیں دیا ہے تو انہوں نے اس کی بھرپور حمایت کی ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز نہیں کرتے اور نہ ان سے خوش ہوتے۔ وہ بڑے لوگوں کی بڑی بڑی باتوں سے بھی مرعوب ہونا نہیں جانتے تھے۔ آل احمد سرور کی شخصیت کے لازمی اجزا اصول پرستی صاف گوئی اور حقیقت پسندی ہیں۔ وہ تنگ نظری اور تعصب پرستی کے ہمیشہ خلاف رہے۔ آل احمد سرور نے اپنی ذات اور اپنے فن میں جس طرح اہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، ان کا وہ رویہ ایک مثالی رویہ کہلانے کا حقدار ہے۔

آل احمد سرور کا یہ ایک خاص وصف ہے کہ وہ جذبات سے کام نہیں لیتے۔ وہ جب کسی موضوع پر بات کرتے تو جذبات کو ہرگز پاس آنے نہیں دیتے اور نہ جذبات کی رو میں بہہ جاتے۔ گفتگو میں شگفتگی وتوازن کو وہ کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ دوست داری سے زیادہ غیر جانبداری ان کی شخصیت کا وصف رہا وہ کسی موضوع پر جب بھی اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہیں تو اس میں اعتماد کے ساتھ ساتھ ایک قسم کی

لچک اور دوسروں کے خیالات کا احترام بھی صاف محسوس کیا جاتا ہے۔ وہ دوستوں کی خوبیوں کا بڑی فراخ دلی سے اعتراف کرتے اور ان کی کمزوریوں پر بے باک انداز میں نکتہ چینی کرتے۔ صحیح نکتہ چینی کو وہ سچی دوستی کی کسوٹی سمجھتے تھے۔

آل احمد سرور کے احباب میں رضی چشتی، مسرت حسین زبیر، آنند نارائن ملا، رشید احمد صدیقی، قیصر حسین رضوی، افضل بیگ، خواجہ غلام محمد صادق اور عثمان احمد انصاری قابل ذکر ہیں۔ معاصرین میں اختر رائے پوری اور حیات اللہ انصاری شامل ہیں۔

آل احمد سرور کے کردار، سیرت کی تشکیل میں ''سینٹ جانسن کالج'' کا اثر بھی موجود ہے۔ اس کالج نے سرور صاحب کو دوسرے مذاہب کا احترام کرنا سکھایا۔ اس کالج کی بدولت وہ اخلاقی اور قومی درد سے آشنا ہوئے اور یہیں سے انہیں طلبا کے مسائل سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس کالج نے انہیں وطن سے محبت کرنا سکھایا، فرقہ پرستی سے نفرت دلائی اور سوشلزم سے ذہنی موانست پیدا کی۔

بچپن میں انسان پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ شخصیت کی تعمیر میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ بدایوں میں ان کے پڑوس میں ایک مولوی صاحب رہا کرتے تھے جن کی صحبت میں ان کو سینکڑوں اشعار زبانی یاد ہو گئے۔ مولوی صاحب کی بدولت انہیں شاعری سے لگاؤ پیدا ہوا۔ وہ خود کہتے ہیں:

> ''پڑوس میں ایک پرانے زمیندار مولوی احمد تھے، جو ہمارے دور کے عزیز بھی تھے۔ یہ بزرگوں کی شان میں قصیدے لکھتے اور کچہری جاتے اور گاؤں کے پھیرے کرتے رہتے تھے۔ شام کو دوستوں کے مجمع میں اپنے قصیدے سنایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی شعر اپر تنقید بھی ہوتی تھی۔ مجھے ان سب باتوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ سینکڑوں شعر یاد ہو گئے۔''

آل احمد سرور کی شخصیت کی تشکیل میں ان کے اساتذہ کا اثر شامل رہا ہے۔ وہ اپنے ایک استاد ماسٹر رام ناتھ سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ ماسٹر رام ناتھ اپنے شاگردوں سے محبت کرنے والے اور خاموش طبیعت کے انسان تھے۔ استاد کی ان خوبیوں نے آل احمد سرور کو بھی متاثر کیا۔ سرور صاحب نے اپنے استاد کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

> ''ماسٹر رام ناتھ مندروں کی کچھ رسموں پر اکثر اعتراض کرتے تھے۔ انگریزی کے بہت دلدادہ تھے۔ وہ مسلمانوں کی بعض باتوں سے بھی متاثر تھے۔ غرض بڑے وسیع القلب اور روادار آدمی تھے۔ میری شخصیت کی تعمیر میں ان کا خاموش اثر ضرور ہے۔''

ماسٹر رام ناتھ کی مہربانی اور محبت کی وجہ سے آل احمد سرور ہمیشہ تعصب اور ہر طرح کے نفاق سے دور رہے۔

ماسٹر رام ناتھ کے علاوہ پروفیسر آل احمد سرور نے جن اساتذہ کا اثر قبول کیا ان میں پروفیسر انتھونی، پروفیسر یانڈیا، حامد حسین قادری، پروفیسر فورڈ اور پروفیسر مہاجن قابل ذکر ہیں۔ آل احمد سرور ۱۹۳۳ء میں راس مسعود کی وائس چانسلری کے دور میں علی گڑھ آئے تھے۔ اس عہد میں خواجہ منظور حسین صاحب کی شخصیت نے بھی انہیں متاثر کیا۔ وہ انگریزی کے لکچرار تھے اور انگریزی ادب پر بہت گہری نظر رکھتے تھے۔ منظور حسین ادب کے رسیا، کتابوں کے عاشق اور انتہائی باذوق آدمی تھے۔ انہوں نے سرور صاحب کو ''جانسن'' اس طرح پڑھایا کہ انہیں ''جانسن'' کی شخصیت سے بھی لگاؤ پیدا ہو گیا۔ جانسن کی اہمیت پر لٹریری سوسائٹی میں ایک مقالہ بھی سرور صاحب نے پڑھا تھا۔ خواجہ منظور حسین کی صحبت میں ہی آل احمد سرور ''ترقی پسند تحریک'' سے آشنا ہوئے اور اس کا اثر قبول کیا۔ علی گڑھ میں رشید احمد صدیقی، سید حسین صاحب اور دوسرے اہل نظر سے ملنے کا شوق بھی خواجہ صاحب کی بدولت حاصل ہوا تھا۔ ڈاکٹر اشرف اور سجاد ظہیر وغیرہ سے ملاقات اسی زمانے میں منظور حسین صاحب کے توسط سے ہوئی تھی۔

سرور صاحب کی شخصیت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے میں رشید احمد صدیقی کا اثر بھی شامل ہے۔ رشید صاحب سے ان کی پہلی

ملاقات ایک مضمون کی فرمائش کے سلسلے میں ہوئی تھی اور یہ جان پہچان دھیرے دھیرے دوستی میں تبدیل ہوتی گئی۔سرور صاحب کے دوستوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین، حفیظ جالندھری، عابد حسین، مولانا عبدالماجد دریابادی، اصغر گونڈوی اور سید سلیمان ندوی بھی شامل ہیں۔سرور صاحب نے ان سبھوں سے کچھ نہ کچھ سیکھنے کی کوشش کی۔وہ اس کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

''منظور صاحب نے مجھے عالمی معیاروں سے آشنا کیا اور انگریزی ادب سے عشق سکھایا۔ رشید احمد صدیقی صاحب نے مجھے اردو ادب کی خدمت کی طرف مائل کیا۔ ذاکر صاحب نے ادب کو زندگی کی اعلیٰ قدروں سے ہم آہنگ کرنا سکھایا۔''

سرسید کی تحریک کا سرور صاحب کے دل میں بڑا احترام ہے۔ان کا خیال ہے کہ سرسید کی کوششوں کی وجہ سے مسلمان غفلت کی نیند سے بیدار ہوئے۔علی گڑھ تحریک کے متعلق سرور صاحب تحریر کرتے ہیں:

''سرسید کی تحریک کا میرے دل میں بڑا احترام ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس نے ہندوستان کے مسلمانوں میں ذہنی انقلاب برپا کیا اور انہیں اس قابل بنایا کہ وہ جدید دور کے تقاضوں کا ساتھ دے سکیں۔''

سرور صاحب نے علی گڑھ میں رہ کر نہ صرف پڑھنے، پڑھانے کا کام انجام دیا، بلکہ شعر وادب کے مطالعہ سے بھی اپنی جھولی بھر لی۔تدریس ان کی دانست میں ایک مقدس فریضہ رہا، وہ اس کو عبادت کا درجہ دیتے رہے۔ادب سے انہیں غیر معمولی لگاؤ تھا، ایک جگہ وہ خود کہتے ہیں:

''ادب میری محبت ہے اور ادب صرف میرا مشغلہ ہی نہیں میری عبادت بھی رہا ہے۔''

۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۵ء تک آل احمد سرور دو شخصیتوں سے بہت زیادہ متاثر رہے۔ان میں ایک مولوی عبدالحق دوسرے ڈاکٹر ضیاالدین ہیں۔

مولوی صاحب آل احمد سرور کو بہت چاہتے تھے۔انہوں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اگر میرے سامنے کسی جانشین کو پیش کرنے کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تو میں سوائے سرور صاحب کے کسی اور کا انتخاب نہیں کروں گا۔ بابائے اردو کی یہ بات بہرحال ایک وزن رکھتی ہے اور اس کی وجہ شاید اتنی نہیں کہ آل احمد سرور بڑی علمیت رکھنے والے آدمی تھے بلکہ یہ بھی ہے کہ ان کے اندر ذاتی خوش اخلاقی کے عناصر کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ وہ اپنے گھر آنے والوں کی پزیرائی کتنے خلوص اور کیسی خوش مزاجی سے کیا کرتے تھے، اس کا اندازہ وقار عظیم کے ایک بیان سے ہوسکتا ہے۔انہوں نے لکھا ہے کہ:

''ایک شام آل احمد سرور کے گھر گیا اور چند سکنڈ میں سرور صاحب ہمہ تن متبسم و شگفتگی بنے ہوئے باہر نکلے، آتے ہی نہ جانے کتنے سوال کر ڈالے، پھر بیٹھک کھولی گئی۔ سرور صاحب کی بیٹھک ایک کشادہ فراخ کمرہ تھا، لیکن ہر قسم کے تکلف سے بے نیاز، صرف چند کرسیاں اور ایک بڑی میز اس کا کل اثاثہ تھا۔ میز پر کچھ اردو اور کچھ انگریزی کی کتابیں اور بعض تازہ رسالے پڑے ہوئے تھے۔''

سرور صاحب کے واقف کاروں کا بیان ہے کہ انہیں بات کرنے کا طریقہ بالکل غیر رسمی ہوتا تھا۔وہ بیٹھ کر بہت ہی سکون سے بات کی ابتدا کرتے۔ چند منٹوں میں گھنٹوں دنوں اور ہفتوں، مہینوں کی ساری منزلیں طے کر لیتے، بات کرنے والے کو ایسا محسوس ہونے لگتا کہ وہ اپنے مخاطب کو بہت زمانے سے جانتا ہے اور بغیر تکلف اور حجاب کے انہیں ہم راز بنا سکتا ہے۔

بلاشبہ آل احمد سرور کی شخصیت ہمہ گیر تھی۔ وہ عالم بھی تھے اور ادیب و نقاد بھی منطقی تجزیہ فکر و احساس کا توازن اور شگفتگی سرور صاحب کی شخصیت اور کردار کے اہم اجزا رہے۔ ایک نقاد کی حیثیت سے بھی انہیں جو مقام و مرتبہ حاصل ہوا ہے اس میں بھی ان عناصر کا یقینی طور پر بڑا اثر موجود ہے۔ ❁❁

☆ نظریہ اصل میں تجربے اور جذبات کے مرکب کا نام ہے
☆ عقلمند آدمی وہ ہے جو کم بولے اور زیادہ سنے
☆ سب سے بڑی معصیت کسی کی دل آزاری اور بے حرمتی ہے
☆ اصل میں آنکھ والا وہی ہے جو اپنے آپ کو دیکھے
☆ حکمت اور دانائی وہ نعمت ہے جو مفلس کو بادشاہ بنا دیتی ہے

ہندی : ڈاکٹر شوبھا مشرا
اردو : محمد شوکت جمال
Sabzibagh, Patna - 800004

اودا دیوی: ایک جانباز خاتون

۳۰ جون ۱۸۵۷ء کو لکھنؤ کے چنہٹ کے پاس اسماعیل گنج علاقہ میں ہینری لارنس کی قیادت میں برٹش فوجیوں اور مولوی احمد اللہ شاہ کی قیادت میں ہندوستانی انقلابیوں کے درمیان بھیانک جنگ ہوئی۔ مہابیر جی کا مندر اس جنگ کا گواہ بنا۔ اس جنگ میں انگریزوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور پناہ لینے کے لئے ریزیڈنسی میں چھپ کر جان بچانی پڑی۔ اس جنگ میں انگریزی فوج کے دوسو سپاہی مارے گئے تھے۔ انقلابیوں نے انگریزوں کے پانچ توپ اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ بیگم حضرت محل کی اعلیٰ درجہ کی قیادت نے انقلابیوں کے حوصلوں کو بہت بلند کر دیا تھا۔

اسی جنگ میں ایک ہندوستانی انقلابی مکا پاسی کو شہادت نصیب ہوئی۔ جانباز خاتون اودا دیوی انہیں مکا پاسی کی شریک حیات تھیں۔ ۲؍جولائی ۱۸۵۷ء کو انقلابیوں نے ریزیڈنسی پر حملہ کر دیا، اس جملہ میں ہینری لارنس زخمی ہو گیا اور زخموں کی تاب نہ لا کر ۴؍جولائی کو چل بسا۔ اس کے بعد بیگم حضرت محل نے نواب واجد علی شاہ کے گیارہ سالہ بیٹے کو جس کا نام برجیس قدر تھا، نواب بنا کر حکومت کی باگ ڈور خود سنبھال لیا۔ انقلابیوں اور انگریزوں کے درمیان جھڑپ ہوتی رہی۔ ان جھڑپوں میں دونوں طرف فتح اور شکست کا سلسلہ جاری رہا۔

۱۸۵۷ء کے ماہ نومبر کی ۱۶۔۱۷ اور ۱۸ تاریخ کو لکھنؤ کی گلیاں قتل عام کی گواہ بن گئیں۔ عالم باغ، قیصر باغ، شاہ نجف روڈ، دلکشا اور سکندر باغ جنگ اور مد بھیڑ کا خاص مرکز بنا رہا، انگریزی فوج لکھنؤ میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی، مگر عالم باغ کی طرف سے داخل ہونے میں ناکام ہونے پر وہ دلکشا میں جمع ہو گئی۔

انگریز فوجی چنہٹ کی شکست سے بوکھلائے ہوئے تھے۔ جب انہیں خبر ملی کے سکندر باغ میں لگ بھگ دو ہزار انقلابی جمع ہیں تو انہوں نے دلکشا سے سکندر باغ کی طرف کوچ کیا۔ اسی دلکشا باغ میں انگریز فوجیوں کا سامنا جانباز خاتون اودا دیوی سے ہوا جس کی جانبازی اور ہمت کو برٹش حکمرانوں نے بھی سلام پیش کیا۔

اودا دیوی کی قربانی کے ذکر سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ برٹش فوجیوں نے جب سکندر باغ پر حملہ کیا تو سب سے پہلے اس کا سامنا اسی جانباز اودا دیوی سے ہوا جو ایک مرد سپاہی کے لباس میں کھڑی تھیں۔ اودا دیوی بندوق اور گولہ بارود کے ساتھ ایک اونچے درخت پر چڑھ گئیں اور اپنی جنگی مشاقی اور بے خطا نشانے سے انہوں نے برٹش فوجیوں کو سکندر باغ میں داخل نہیں ہونے دیا۔ جب تک اودا دیوی کے پاس گولہ بارود رہا، انہوں نے مقابلہ کیا اور ۳۰ سے زیادہ انگریز سپاہیوں کو موت کے گھاٹ پہنچا دیا۔

اودا دیوی کا خزانہ جب گولہ بارود سے خالی ہو گیا تو درخت پر سے اترتے ہوئے انگریزوں نے ان کو گولی کا نشانہ بنایا اور دلکشا باغ میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے اور ایک بار پھر ظالم انگریز فوجیوں نے ان کے مردہ جسم پر گولیوں کی بوچھار کی جب قریب آئے تب انہیں پتہ چلا کے یہ لاش ایک عورت کی ہے۔

انگریز بھی اودا دیوی کی بہادری کے قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، سارجنٹ فاربس مشیل نے اپنی رپورٹ میں سکندر باغ کی اس جانباز بہادر خاتون اودا دیوی کا ذکر کیا ہے، یہاں تک کہ ''لندن ٹائمز'' کے مدیر ویلیم ہاورڈ نے بھی مردوں کی وضع قطع والی جانباز اودا دیوی کو پیپل کے درخت پر چڑھ کر برٹش فوج پر فائرنگ کر کے زبردست نقصان پہنچانے کا ذکر کیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ حیران کر دینے والی اس انقلابی جانباز سے

مرعوب یا متاثر ہوکر برٹش کمانڈر کولن کیمپبل نے اپنا بیٹ اتار کر اودا دیوی کو خراج عقیدت پیش کیا تھا۔

اودھ اپنی خوشحال وراثت کی وجہ سے جانا جاتا ہے، یہاں کے لوگ عموماً امن پسند تھے اور اپنے نواب واجد علی شاہ سے مطمئن بھی تھے، یوں تو نواب واجد علی شاہ آرٹ کے قدر دان تھے، لیکن وقت اور حالات کے مدنظر انہوں نے اپنی کئی بیگمات کو فوجی تربیت سے آراستہ کروایا اور اپنی فوج میں مردوں کے ساتھ خواتین کی بھی ایک بٹالین بنائی اور بیگم سکندر محل کو اس کا رسالدار بنایا۔ فوج کی ان ٹکڑیوں کو نواب صاحب نے ''رسالدار داؤدی''، ''رسالدار زعفرانی'' جیسے پھولوں کا نام دیا۔ ان کی وردیاں اسی پھول کے رنگ کی ہوا کرتی تھیں۔

اودا دیوی اپنے شوہر مکا پاسی کی ترغیب پر فوج میں شامل ہوئیں اور شوہر کے شہید ہو جانے کے بعد وہ بیگم حضرت محل کی چہیتی ہوگئیں۔ بیگم نے انہیں خواتین دستے کا کمانڈر بنایا۔

سچائی یہی ہے کہ اودا دیوی جیسی خاتون کے تعاون کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بیسویں صدی میں جو قوم پرست انقلاب آیا اس کی زمین ۱۸۵۷ء کے اسی انقلاب نے ہموار کیا تھا۔ اس انقلاب میں اودا دیوی کو حصہ داری واضح کرتی ہے کہ ہندوستان کی عورتیں کبھی کسی کے آگے جھکی نہیں بلکہ اپنی بہادری اور جانبازی سے انہوں نے سبھوں سے اپنا احترام حاصل کیا۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت میں ہندستانیوں نے دنیا کی سب سے طاقتور شہنشاہیت کو للکارا تھا۔ اس فریضہ میں خواتین کی مادری قوت بھی پیچھے نہیں رہی۔ شروع سے آخر تک انہوں نے پرامن تحریک اور انقلابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اودا دیوی کے قومی شعور نے یہ واضح کر دیا کہ وہ بھی ملک کی خودمختاری اور ملکی وقار کے لئے ساری بندشوں کو توڑ سکتی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت آزادی کی جدوجہد کا پہلا مسلح دھما کہ تھا جس کی قیادت کئی مقامات پر خواتین نے کیا اور اپنی حیرت انگیز جانبازی اور بہادری کے ثبوت پیش کئے، بیگم حضرت محل کی فوجی بٹالین میں سبھی عورتیں شامل تھیں جن کی قیادت رحیمن کر رہی تھیں وہ فوج کی کمانڈر تھیں۔

اودا دیوی کا ذکر مصنف امرت لال ناگر نے اپنی تصنیف ''غدر کے پھول'' میں بھی کیا ہے۔ ❁❁

فراقؔ..... (ص ۵۹ سے آگے)

ہے اور جو ہم سے، ہمارے عہد سے زیادہ قریب اور مانوس ہے۔ فراقؔ نے صرف غزل کہہ کر ہی اردو شاعری پر احسان نہیں کیا بلکہ صنف غزل کی مجموعی فضا کی نئی تعمیر میں جو ان کا رول رہا ہے وہ بھی کم اہم نہیں ہے۔ نئی غزل کو بنانے سنوارنے میں یگانہؔ کے ساتھ فراقؔ کا نام بھی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔''

فراقؔ صاحب کے فن کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اس فضا کو نئی جمالیات کے رنگ و بو کے ساتھ غزل کے مزاج کا جزو بنا دیا ہے۔ ان کی اپنی منفرد آواز ہے۔ ان کا اپنا الگ اسلوب ہے اور اپنا الگ لہجہ ہے جس کی وجہ سے وہ اردو میں جانے و پہچانے شاعر ہیں۔

فراقؔ صاحب کو اس تعلق سے اپنا خون جگر صرف کرنا پڑا ہے۔ ان کی شاعری نئی صدی کے تجربوں کی شاعری ہے۔ فراقؔ صاحب چونکہ تعلیم یافتہ تھے، اس لیے اکتسابی عمل سے جو فیض و عرفان انہیں حاصل ہوا اس کا بھی بھرپور استعمال انہوں نے اپنی شاعری میں کیا۔ جس مسئلہ یا معاملہ نیز کشمکش کے المیہ پر انہوں نے شاعرانہ نظر کی اس کا تدارک اپنی فکر اور شعور کی بنیاد پر پختگی کے ساتھ پیش کیا۔ فراقؔ صاحب نے شاعری کو صرف دل بہلانے دوسروں کو رجھانے کا ذریعہ نہیں بنایا، اسی لیے میری نظر میں زندگی کے مسائل کا حل ان کی شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے، اور وہ مجھے انسانیت کے اعلیٰ مدارج پر فائز نظر آتے ہیں۔ ❁❁

خصوصی توجہ طلب

اکادمی مجلّہ ماہنامہ ''زبان وادب'' کے بارے میں ساری معلومات کے لئے انچارج جناب محمد شاہد سے ان کے موبائیل 9897958115 پر نیز مسودات اور کتابوں پر انعامات کے سلسلے میں انچارج جناب محمد تمنا سے ان کے موبائیل 9931606459 پر رابطہ کریں۔ شکریہ! (ادارہ)

افسانے

فخرالدین عارفی
Mohammad Pur, Shahganj, Patna - 800006

ایثارِ محبت

''یادیں تو چاند ہوتی ہیں، جو گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں، لیکن فنا نہیں ہوتیں ـــــ'' یہ بات ایک دن گفتگو کے دوران مجھ سے شہناز نے کہی تھی۔ وہ ہمیشہ ایسی ہی خوب صورت اور دل کی گہرائیوں میں اُتر جانے والی باتیں کیا کرتی، اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ پیار کی مٹھاس میں ڈوبا ہوا اور اپنائیت کی خوشبوؤں میں بسا ہوا ہوتا تھا۔ اس کی جھیل جیسی آنکھیں اتنی خوب صورت اور پیاری تھیں کہ دیکھنے والوں کے من کے شانت ساگر میں طوفان پیدا کر دیتی تھیں، ٹھیک اسی طرح، جس طرح چاندنی راتوں میں کبھی کبھی چاند کی کرنوں سے سمندر و یاکل ہو اٹھتا ہے۔

''یادوں کو چاند سے تشبیہ..... شہناز تم واقعی بہت ذہین اور باشعور ہو'' ـــــ میرے منھ سے بالکل غیر ارادی طور پر یہ جملہ نکل گیا تھا اور نہ جانے کن جذبوں سے مغلوب ہو کر میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ ایسے کرنے کے بعد مجھے ڈر بھی لگا تھا کہ کہیں شہناز کے ذہن پر اس کا کوئی برا اثر نہ ہو، لیکن میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا اور وہ پہلے ہی کی طرح پرسکون تھی۔ ہاں اس نے آنکھیں اٹھا کر ایک مرتبہ مجھے کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھا ضرور تھا، جس میں نہ جانے پیار تھا کہ غصہ..... لیکن نہیں، شہناز کے دل میں میرے لئے غصے کے جذبات بھلا کیسے ہو سکتے ہیں؟ میں نے فوراً اپنے ذہن کے دامن سے اس خیال کو جھٹک دیا تھا اور تب اس دن پہلی مرتبہ میں نے اپنے دل کے کسی گوشے میں شہناز کے لئے بھی تھوڑی سی جگہ کا احساس کیا تھا، پھر شہناز سے بہت دنوں تک ہماری ملاقات نہیں ہو سکی تھی اور وقت کے گرد و غبار نے میرے دل کے کسی گوشے میں آویزاں شہناز کی تصویر کو دھندلی کر دیا تھا، لیکن آج بہت دنوں کے بعد ایک مرتبہ پھر میرے ذہن و دل کے آسمان پر شہناز کی یادیں چاند بن کر جگمگانے لگی ہیں اور اس کی کرنیں میرے دل کے خاموش سمندر میں ہلچل مچا رہی ہیں۔

''آپ کہاں کہاں کھوئے ہیں بھیا؟ چائے کب سے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔'' اور اس آواز پر میں چونک اٹھتا ہوں، یہ میری چھوٹی بہن سلمیٰ کی آواز ہے جو ایم اے کی طالبہ ہے اور ساتھ ہی ایک ذہین افسانہ نگار بھی۔ میں مسکرانے لگتا ہوں اور میری مسکراہٹ کی بے بسی پر میری چھوٹی بہن سلمیٰ کے ہونٹوں پر بھی ایک طنزیہ مسکراہٹ رینگنے لگتی ہے اور پھر شاید اس کے وجود میں کہیں چھپی ہوئی ایک نٹ کھٹ سی لڑکی جاگ اٹھتی ہے اور وہ مجھے چھیڑنے لگتی ہے:

''بھائی جان! یہ بھی خوب ہے کہ کہانیاں میں لکھتی ہوں اور ہر پل تھینکنگ موڈ میں آپ ڈوبے رہتے ہیں، جب دیکھو کسی گہری فکر میں غرق..... میں پوچھتی ہوں کہ آخر بات کیا ہے بھائی جان؟ ضرور کوئی خوب صورت سی صورت دل میں اتر گئی ہے، کون ہے وہ خوش قسمت لڑکی؟ مجھے بھی بتایئے نا بھائی جان.....؟''

سلمیٰ کی ایسی شوخ گفتگو کا میں عادی ہو چکا ہوں۔ وہ ہمیشہ ہر کسی کو چھیڑتی رہتی ہے، شرارت تو جیسے اس کے وجود میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اس کے کمرے سے چلے جانے کے بعد میں چائے کی ایک چسکی لے کر سگریٹ سلگانے لگتا ہوں۔ اب پھر میں ہوں اور میرا کمرہ .....اور ہمارے بیچ تنہائی..... کمرے میں ہر طرف سگریٹ کا دھواں بکھر چکا ہے اور مجھے یہ دھواں دھواں سی فضا بہت اچھی محسوس ہو رہی ہے۔ میں پل بھر کے لئے ایک خاص قسم کے سکون کا احساس کرتا ہوں اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ ساری دنیا ہی دھواں دھواں ہے۔ جہاں کچھ بھی صاف صاف اور واضح طور پر نظر نہیں آتا ہے اور جو کچھ نظر آتا ہے وہ فریب ہوتا ہے، دھوکا اور سراب..... حقیقت نہیں..... اب میں پھر شہناز کے متعلق سوچنے لگا ہوں اور میرے ذہن کے آکاش پر اس کی یادوں کا چاند آہستہ آہستہ ابھرنے لگا ہے۔

شہناز میرے محلے میں رہنے والی ایک ایسی لڑکی ہے جس کے والدین بہت غریب تو ضرور ہیں، لیکن نیک اور شریف ہیں۔ وہ بی اے کی ایک طالبہ ہے، ہم دونوں ایک دوسرے کو بچپن سے جانتے، ایک ہی جگہ بڑھے پلے ہیں۔ شہناز ایک ایسی لڑکی ہے جو ہمیشہ خوش رہا کرتی ہے اور بات بات میں مسکرانے کی اس کی عادت تو اب بہت پرانی ہو چکی ہے۔ مجھے اس کے ساتھ گزارے ہوئے ان گنت لمحے یاد آنے لگتے ہیں اور پھر اس کی حسین مسکراہٹ کا تصور کر کے میں اپنے اندر ایک نامعلوم سی بے چینی کا احساس کرنے لگتا ہوں اور شاید کہ میرے دل کے کسی کونے میں آویزاں شہناز کی تصویر پر سے بے حسی کی گرد چھٹنے لگتی ہے۔ میں فیصلہ کر لیتا ہوں کہ اسی وقت شہناز سے ملاقات کروں گا اور اس فیصلے کے بعد میرے قدم خود بخود شہناز کے گھر کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ دروازے پر پہنچ کر میں دستک دیتا ہوں تو فوراً اندر سے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے، پھر دروازہ کھول دیا جاتا ہے اور دروازہ کھولنے والی شخصیت کوئی اور نہیں خود شہناز تھی، لیکن میں تو اسے دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے پہچان بھی نہ سکا تھا۔

''شہناز، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

میری زبان سے اچانک نکل گیا تھا اور میرا یہ معمولی سا سوال جیسے اس کے دل میں بہت گہرائیوں تک اتر گیا تھا۔ وہ بہت دیر تک تو صرف مجھے گھورتی رہی تھی اور کسی گہری فکر میں ڈوبتی جا رہی تھی، جسے میرے سوال کے ایک ایک لفظ پر ہر طرح سے غور و فکر کے بعد مجھے کوئی جواب دینا چاہتی ہو۔

''شہناز..... بولو نا..... کیا بات ہے؟''

میں اس کو خاموش پا کر دوبارہ پوچھ بیٹھا تھا۔ اس مرتبہ میری آواز پر جیسے وہ کسی گہری فکر سے چونکی تھی:

''ارے میں تو واقعی جانے کہاں گم ہو گئی تھی، معاف کیجئے گا۔ آیئے اندر چلیں۔'' اور پھر وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آئی تھی اور قبل اس کے کہ میں کوئی اور سوال کر دیتا وہ خود ہی مجھ سے مخاطب تھی:

''دراصل امی جان کی طبیعت خراب ہے، جس کی وجہ سے ہم لوگ بہت پریشان ہیں۔''

''کیا ہو گیا ہے ان کو.....؟''

میں نے بے قراری ظاہر کی۔

''کیا بتاؤں جب مصیبت آتی ہے تو چاروں طرف سے آتی ہے، گزشتہ دنوں ڈیڈی کی طبیعت بہت زیادہ خراب تھی، مرتے مرتے بچے ہیں۔ دل کا دوسرا دورہ پڑا تھا اور اب امی جان کی حالت روز بروز بگڑتی ہی چلی جا رہی ہے، ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ان کا ایک پھیپھڑا بالکل خراب ہو چکا ہے۔''

مجھے شہناز سے یہ سب معلوم کر کے بہت ہی دکھ ہوا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی، ہر طرح سے سمجھایا کہ گھبرانے کی کوئی نہیں ہے آج کل اس بیماری کا علاج بہت عام اور آسان ہو گیا ہے اور یہ کہ وہ جلد ہی صحت یاب ہو جائیں گی۔ میری باتیں سن کر وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگی تھی، لیکن پھر بھی اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر، جو کبھی کنول کی طرح کھلتے رہتے تھے، مجھے کہیں کوئی شادابی نظر نہیں آئی تھی۔ ہمیشہ خوش رہنے والی شہناز سے میں بہت کم باتیں کر سکا تھا اور جلد ہی اس سے اجازت لے کر لوٹ آیا تھا۔ وہ مجھے چھوڑنے دروازے تک آئی تھی اور اس نے مجھ سے کہا تھا۔

''امی کی طبیعت قدرے سنبھل جانے دیجئے پھر میں آپ سے اطمینان سے ملاقات کروں گی.....'' اور تب میں لوٹ آیا تھا، لیکن گھر آ کر تمام رات یہی سوچتا رہا تھا کہ آخر شہناز مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہے۔

اُس رات، اس کے بارے طرح طرح کے خیالات میرے ذہن کے اُفق پر ڈوبتے اور اُبھرتے رہے تھے۔ میں نے شہناز کو پہلی مرتبہ اتنا اُداس اور مغموم دیکھا تھا، اس کی جھیل جیسی آنکھوں میں جیسے دور دور تک ہولناک ویرانی تھی، خزاں کا تسلط اور تند جھونکوں کی چبھن..... وہ اب بھی بات بات پر مسکرانے کی ناکام کوشش کرتی تھی، لیکن کتنا کھوکھلا پن تھا اس کی مسکراہٹوں میں اب.....

میرے دل میں ایک خیال آیا کہ شاید اپنے والدین کی بیماری کے سبب اس کا یہ حال ہے، لیکن فوراً ہی پھر جیسے میرے اس خیال کی تردید میں ہزاروں زخم خود مجھے اپنے سطح وجود پر سلگتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور میں ویاکل ہوا اٹھتا ہوں، پھر یہ فیصلہ کر کے سونے کی

کوشش کرتا ہوں کہ کل ہی شہناز سے مل کر حقیقت جاننے کی کوشش کروں گا، لیکن لاکھ کوشش کے باوجود میری پلکوں کو چین نصیب نہیں ہوتا ہے اور ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے گزر جاتی ہے۔

دوسری صبح میں بستر سے اٹھ کر شہناز کے یہاں جانے کی تیاریوں میں مشغول ہو چکا تھا اور ناشتے کی میز پر تھا کہ میرے نوکر نے آ کر یہ اطلاع دی کہ ایک لڑکی آپ سے ملنا چاہتی ہے، اس کا نام شہناز ہے۔ میں نے فوراً شہناز کو اپنے کمرے میں بلوالیا تھا اور جب وہ آ گئی تو اس سے ناشتے میں شرکت کی درخواست کی، لیکن اس نے یہ کہتے ہوئے معذرت کا اظہار کر لیا تھا کہ وہ گھر سے ناشتہ کر کے آ رہی ہے۔ میں نے نوکر کو جب اس کے لئے چائے لانے کو کہا تو وہ خاموش رہی، تھوڑی دیر کے بعد میں ناشتے سے فارغ ہو چکا تھا اور وہ بھی چائے نوش کر چکی تھی اور ہم دونوں خاموش بیٹھے تھے اور پھر اس سے پہلے کہ میں سلسلۂ گفتگو شروع کرتا وہ خود مجھ سے مخاطب تھی:

''آج مجھے آپ اس طرح تعجب خیز نگاہوں سے کیوں گھور رہے ہیں؟ کیا پہلی مرتبہ دیکھا ہے؟''

اس نے اپنے اس سوال میں قصداً اپنی پرانی شوخی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تھی، مگر قطعی طور پر ناکام ثابت ہوئی تھی۔ اس کی آواز سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ جیسے میں نے کچھ سنا ہی نہ ہو..... مجھے خاموش پا کر وہ کسی حد تک پریشان نظر آنے لگی تھی جیسے میں نے اس کے دل کی ساری باتوں کو جان لیا ہو، پھر قدرے توقف کے بعد وہ دوبارہ مخاطب ہوئی:

''شاید اس وقت میرا یہاں آنا آپ کو اچھا نہیں لگا ہے۔''

''نہیں شہناز ایسی کوئی بات نہیں۔''

''پھر گم سم کیوں ہیں؟''

وہ یہ کہہ کر میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی تھی۔

''شہناز میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے اندر ان دنوں نمایاں تبدیلیاں آ گئی ہیں۔ جانے کیوں اب ہر لمحہ تم بہت اُداس اور فکرمند رہنے لگی ہو۔ بات بات میں وہ ہنسی، جو تمہاری ذات کا ایک حصہ تھی اب نہ جانے کہاں غائب ہو گئی ہے۔''

''اُف.....تو میری فکر میں آپ دبلے ہو رہے ہیں۔ کمال ہو گیا۔ میں نے سمجھا کہ (خاکم بدہن) جناب کو کچھ ہو تو نہیں گیا ہے..... میری مراد ہے.....وہ جو.....ایک چیز ہوتی ہے نا۔ بہت اچھا سا نام ہے اس کا.....ہاں ہاں خیال آ گیا.....عشق.....''

اور پھر وہ زور سے ہنس پڑی تھی، ہنستی ہی چلی جا رہی تھی .....لیکن اُف.....اب اس کی رس گھولتی ہوئی مدھر ہنسی کتنی تلخ ہو چکی تھی۔

''شہناز تم یوں ہنس کر مجھے حقیقت جاننے سے روک نہیں سکتی ہو، تمہاری اس ہنسی میں مجھے تو درد ہی درد محسوس ہو رہا ہے۔ خدا کے لئے مجھ سے کچھ نہیں چھپاؤ اور مجھ پر بھروسہ کر کے مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دو۔''

میرے لہجے میں شاید التجا تھی، فریاد تھی اور کچھ ایسی کیفیت تھی کہ شہناز کا دل پگھلنے لگا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں اٹھا کر میری طرف غور سے دیکھا۔ اس کی گہری نیلی آنکھوں کی پلکیں اس طرح اٹھیں جیسے گلاب کی چھوٹی چھوٹی کنواری پنکھڑیاں عالم شباب میں کھلنے کے بعد ایک مرتبہ اپنی بچھڑی ہوئی سکھیوں سے ملنے کی کوشش کر رہی ہوں، لیکن ہوا کا کوئی تیز جھونکا بے دردی سے انہیں الگ کر دے۔ اس کی نگاہیں ایک دم میرے چہرے پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ مسکرانے کی اس نے ناکام کوشش کی تو اس کے پتلے پتلے لب کانپے جس طرح ببول کی پتیاں ہوا میں تھرتھراتی ہیں، مگر وہ منھ سے کچھ نہ بولی، پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے اپنے خوب صورت یاقوتی ہونٹ وا کر کے سکوت توڑا:

''آپ کو شاید وہم ہو گیا ہے، کوئی خاص بات نہیں ہے۔ دیکھئے میں تو اب بھی مسکرا رہی ہوں'' اور اس نے مسکرانے کی ایک مرتبہ پھر ناکام کوشش کی تھی۔

''نہیں شہناز مجھے وہم ہرگز نہیں ہو سکتا ہے، تمہیں میری قسم ہے، مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دو۔'' اور جذبات سے مغلوب ہو کر میں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا تھا، لیکن جلد ہی مجھے صورت حال کا احساس ہو گیا اور خجل ہو کر میں نے اپنی نظریں جھکا لی تھیں۔

اب میری نگاہ اس کی کلائی پر بندھی ہوئی ایک خوبصورت سی رسٹ واچ پر مرکوز تھی.....نو بج کر.....لیکن یہ کیا؟ گھڑی کے ڈائل پر آنسوؤں کی ایک موٹی سی بوند گر کر زمین پر پھیل گئی تھی۔

''تم رو رہی ہو شہناز.....؟''

اور میری ہلکی سی آواز کے اس نشتر پر وہ بالکل پھوٹ پڑی تھی:

''ہاں.....!'' اس کی نحیف سی آواز اس طرح ابھری تھی جیسے دور کے کسی ویرانے سے آئی ہو۔ اس دوران اس کے چہرے پر تفکرات کے بے شمار نقوش اُبھر آئے تھے۔

''کہو شہناز کیا بات ہے؟ مجھ پر بھروسہ کرو شاید میں تمہارے کسی کام آسکوں۔''

میں نے ہمدردی کے الفاظ ادا کئے تھے اور تب وہ کہنے لگی تھی:

''میری کہانی بہت دردناک ہے، میں نہیں چاہتی تھی کہ آپ کو سب کچھ بتا کر ذہنی پریشانیوں میں مبتلا کردوں، لیکن جب آپ کی ضد ہے تو پھر سنئے.....میری شادی آج سے تقریباً ایک سال قبل اشرف نام کے ایک وکیل کے ساتھ بالکل پکی ہوچکی تھی۔ ڈیڈی اس رشتے سے بہت خوش تھے اور اکثر وہ اپنی خوشیوں کا اظہار گھر میں کیا کرتے تھے۔ شاید میرے ڈیڈی کو اُمید نہیں تھی کہ وہ مجھے اشرف جیسا جیون ساتھی دے سکیں گے۔ وہ خوبصورت تھا، تعلیم یافتہ اور اچھے دل و دماغ کا مالک.....لیکن نہیں، وہ اچھے دل و دماغ کا مالک ہرگز نہیں تھا، میں اس کو کبھی تسلیم کرسکتی ہوں۔''

اور تھوڑی دیر کے لئے شہناز نہ جانے جن خیالوں میں بالکل کھوسی گئی تھی، وہ بالکل خاموش ہوکر فضا میں گھورتی رہی تھی، جیسے اپنی کھوئی ہوئی بہت قیمتی چیز تلاش کرنے کی کوشش کررہی ہو۔

''کہو شہناز آگے کہو۔ تمہاری دردبھری داستان سننے کے لئے میں اپنے اندر بہت بے قراری محسوس کررہا ہوں۔''

میں نے شہناز کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا اور تب وہ شاید اپنے منتشر احساسات کو بڑی مشکلوں سے سمیٹ پائی تھی اس کے نازک اور خوب صورت ہونٹ کانپے تھے اور پھر آہستہ آہستہ وہ دوبارہ کہنے لگی تھی:

''ایک کمی اس میں اور تھی اور وہ یہ کہ اشرف کا تعلق اعلیٰ ذات سے نہ تھا، لیکن یہ کمی میری نگاہ میں اور خود میرے ڈیڈی کی نظر میں بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ ہڈی اور خون کا معیار کوئی اہمیت نہیں رکھتا ہے اور اس سماجی برائی کو تو ہمارے سماج سے ختم ہونا ہی چاہئے..... ہاں، میری ممی کو اس سلسلے میں تھوڑی سی شکایت ضرور تھی، لیکن ڈیڈی کے سمجھانے بجھانے سے یا پھر شاید اپنی غربت کا خیال کرکے ممی نے بھی بعد میں حامی بھرلی تھی.....اب ڈیڈی یہ چاہتے تھے کہ جلد از جلد کسی طرح سے میری شادی انجام پاجائے اور وہ ایک عظیم مگر دشوار اور کٹھن فرض سے سبکدوش ہوجائیں..... وہ ہر روز اس سلسلے میں اشرف کے والد سے ضروری باتیں کرتے اور جلد کسی مثبت نتیجے پر پہنچ جانا چاہتے تھے، لیکن اشرف کے والدین کی طرف سے معاملہ بہت سست رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا اور وہ لوگ ہمیشہ کسی فیصلہ کن نتیجے تک پہنچنے میں ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے۔ تاہم ایک روز کسی طرح سے یہ دشوار مرحلہ بھی طے پا گیا اور میری شادی کی باضابطہ تاریخ مقرر کردی گئی۔''

یہ کہتے کہتے شہناز کا گلا رندھ گیا تھا اور آواز بھرا گئی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی تھی، مگر وہ اپنے آنسوؤں کے سیلاب کو روکنے میں ناکام ثابت ہوئی تھی، روتے روتے اس کی آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں۔ وہ اس وقت بہت جذباتی بھی ہوگئی تھی اور جذبات کی رَو میں وہ کہتی چلی گئی:

''یوں تو لڑکے والوں کی طرف سے کوئی فرمائش نہیں کی گئی تھی، لیکن شادی تو شادی ہوتی ہے، جس میں قدم قدم پر روپے پانی کی طرح بہتے ہیں، گھر کے لوگوں کا خیال تھا کہ لڑکے والوں کی طرف سے کوئی فرمائش نہ سہی، لیکن ہمارا کیا فرض ہوتا ہے؟ کیا ہم اپنی بیٹی کو بالکل خالی ہی وداع کردیں گے؟ جب کہ آج کل لڑکوں کی عام نیلامی ہوتی ہے، جو لڑکا بھی پڑھ لکھ گیا وہ نیلام پر چڑھ گیا۔

میرے ڈیڈی کے پاس روپے بالکل نہیں تھے۔ چنانچہ انہوں نے وہ مکان ہی فروخت کردینے کا فیصلہ کیا جو ہم لوگوں کے سر چھپانے کا واحد سہارا تھا اور جس کے بارے میں ممی اکثر کہا کرتی تھیں کہ کیا ہوا جو ہم غریب ہیں، ایک دن ایسا ضرور آئے گا کہ ہماری اولاد اس جھونپڑی کو محل میں تبدیل کردے گی اور تب ہم بھی سر اٹھا کر سماج میں جی سکیں گے، لیکن ہماری ممی کا یہ خواب خواب ہی رہا اور ان کے مستقبل کی امیدوں کا شیش محل حال کے بے رحم سنگ ریزوں کے ذریعہ پاش پاش ہوگیا۔

مکان فروخت ہونے کے بعد میری شادی کی تیاریوں میں

غیر معمولی تیزی آ گئی تھی اور سارے مرحلے زور وشور سے انجام پا رہے تھے۔ ہم لوگوں کا مکان جس نے خریدا تھا وہ ایک شریف انسان تھا اس نے ہم لوگوں کو شادی تک اسی مکان میں رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ میری شادی کی تمام تیاریاں لگ بھگ مکمل ہو چکی تھیں اور قریب تھا کہ مجھے مانجھے بیٹھا دیا جاتا کہ ایک روز اشرف کے والد آئے، ڈیڈی سے باتیں ہوئیں اور میری شادی کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر دی گئی۔ ان لوگوں نے یہ شرط لگادی تھی کہ لڑکی کو کم از کم بی اے ضرور پاس کر لینا چاہئے۔ میرا بی اے کا آخری سال تھا، چنانچہ میں پوری یکسوئی کے ساتھ امتحان کی تیاریوں میں جٹ گئی تھی۔

ڈیڈی لڑکے والوں کے اس فیصلے سے شروع میں بہت پریشان تھے اور ان کی شرط ڈیڈی پر بہت شاق گزری تھی، لیکن وہ لوگ مصر تھے اور بالآخر ڈیڈی کو ان کی شرط تسلیم کر لینی پڑی تھی، یوں بھی ڈیڈی نے اپنی غربت کے باوجود میری تعلیمی سرگرمیوں پر کبھی پابندی عائد نہیں کی تھی اور میری تعلیم پر حسب حیثیت روپے خرچ کئے تھے، ان کی خود بھی یہ دلی تمنا تھی کہ کم از کم مجھے گریجویشن ضرور کر لینا چاہئے۔

اب میری پڑھائی پر خاص طور سے توجہ دی جا رہی تھی، پروفیسر آزاد صاحب اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود میری پڑھائی پر اپنا قیمتی وقت صرف کر رہے تھے۔ شاید وہ ڈیڈی سے اپنی دوستی اور رفاقت کا حق ادا کرنا چاہتے تھے یا پھر ہمارے حالات سے انہیں ہمدردی رہی ہوگی۔ ڈیڈی نے جب کبھی ان سے روپے پیسوں کا ذکر کیا تو وہ خفا ہو کر کہتے:

''کیا آپ لوگ مجھے بالکل ہی غیر تصور کرتے ہیں، شہناز اگر آپ کی بیٹی ہے تو میری بھی تو بیٹی ہے'' اور تب ڈیڈی خاموش ہو جاتے۔

میں اب ہمہ تن امتحان کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ اس درمیان کبھی کبھی اشرف میرے گھر بھی آ جاتا تھا، ایک دو مرتبہ اس کی ضد پر اس کے ساتھ فلم دیکھنے بھی گئی۔

وہ مجھ سے جب بھی ملتا تھا مجھے ہر طرح سے اپنی محبت کا یقین دلاتا تھا۔ بڑے بڑے وعدے کیا کرتا، لیکن میں اس کی طرف کم اور اپنے امتحان کی طرف زیادہ توجہ رہی تھی، جس کا نتیجہ بھی خاطر خواہ برآمد ہوا اور جب ریزلٹ نکلا تو میں نے اپنی یونیورسٹی میں ٹاپ کیا تھا۔

یہ میری زندگی کا ایک خوشگوار واقعہ اور ہماری بہت بڑی فتح تھی۔ میں بہت خوش تھی اور میرے گھر کے تمام افراد میری کامیابی پر شاید مجھ سے زیادہ ہی خوش تھے کہ پھر اچانک میری زندگی میں ایک طوفان آیا، ایک ایسا طوفان کہ جس نے میری زندگی کی خوب صورت عمارت کی بنیادوں کو بالکل کھوکھلا کر دیا، اس کے بہاؤ میں میرا تو سب کچھ بہہ گیا ہے، میرا سارا سکھ چین مجھ سے چھن گیا ہے۔ یہاں تک کہ محبت کی جھوٹی قسمیں کھانے والا اشرف بھی مجھ سے بچھڑ گیا، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے..... میرے دسترس سے دور اور بہت دور..... مجھے تو زندگی میں پہلی مرتبہ اس روز احساس ہوا تھا جب ایک دن اُس نے مجھ سے صاف صاف یہ کہہ دیا تھا کہ:

''شہناز، میں تم سے شادی نہیں کر سکتا ہوں، اس لئے کہ میں بہت مجبور ہوں۔ انسان کو جینے کے لئے اور اپنے تابناک مستقبل کے لئے بہت کچھ نہ چاہتے ہوئے بھی کرنا پڑتا ہے، چنانچہ میں نے بھی اپنے دل پر جبر کر کے تم سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور اب میں یاسمین سے شادی کر رہا ہوں۔ ہاں، اسی یاسمین سے جو تمہاری سہیلی ہے.....''

میں، جو اس کی زہر میں ڈوبی ہوئی ساری باتوں کو اپنے دل پر جبر کر کے سن رہی تھی، اس کی زبان سے یاسمین کا نام سن کر خود پر قابو نہیں رکھ پائی تھی اور میرے صبر کا پیمانہ بالکل لبریز ہوا اٹھا تھا، ضبط کا بندھن اچانک ہی ٹوٹ گیا تھا اور میں بہت زور سے چیخ پڑی تھی، شاید اتنے زور سے پہلے میں کبھی اپنی زندگی میں نہیں چیخی تھی۔ میں چیخ چیخ کر اشرف سے کہہ رہی تھی:

''تم نے مجھے فریب دیا ہے..... تم دھوکے باز ہو..... نیچ اور ذلیل ہو.....''

اس وقت میری آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہو رہی تھی اور میں آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی مسلسل بڑبڑا رہی تھی:

''تمہاری اوقات آج مجھے معلوم ہو گئی ہے، اشرف تم میری نظر سے فوراً دور ہو جاؤ..... کاش مجھے یہ پہلے معلوم ہو گیا ہوتا کہ تم ایک بکاؤ مال ہو، تمہاری بھی کوئی قیمت مقرر ہے۔ اشرف تم شوق سے یاسمین سے شادی رچاؤ، لیکن جاتے جاتے مجھے اتنا تو بتا دو کہ اگر تمہیں صرف دولت ہی درکار تھی تو پھر تم نے مجھ سے پیار کیوں کیا تھا؟ کیوں مرے

ارمانوں کو جگا کر آج تم ان کا گلا گھونٹ رہے ہو؟ تم میری غربت کا مذاق اڑا رہے ہو؟ اشرف، ٹھیک ہے دل بھر کر میرا مذاق اڑالو، لیکن تم یقین جانو کہ میری آنکھوں سے ٹپکے ہوئے آنسو کا ایک ایک قطرہ کل تم سے حساب لے گا اور تمہاری خوشیوں کا دشمن ثابت ہوگا.....''

اور نہ جانے جذبات میں اور کیا کیا میں بک گئی تھی، اس وقت میں جن کیفیتوں سے دوچار تھی اس کا اظہار الفاظ کے ذریعے ممکن ہی نہیں ہے، لیکن میرے لئے جو بات سب سے زیادہ حیرت ناک ثابت ہوئی تھی وہ یہ کہ میری اتنی تلخ باتوں کو سننے کے بعد بھی اشرف پر اس کا کوئی ردعمل نہیں ہوا تھا اور اگر ایسا ہوا بھی تھا تو اس نے بڑی فن کاری کے ساتھ کسی بھی طرح سے اپنے اندر کے ردعمل کو ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ میری ساری باتوں کو سننے کے بعد پہلے تو کچھ دیر بالکل جامد وساکت کھڑا رہا تھا اور کچھ عجیب سی نظروں سے مجھے گھورنے لگا تھا، تادیر گھورتا رہا تھا۔ میرے دل میں ایک خیال پیدا ہوا تھا کہ شاید وہ اپنے فیصلے پر اب شرمندگی محسوس کر رہا ہے، لیکن جب اس نے اپنی زبان کھولی تھی تو میری امیدوں کا محل ریت کے گھروندے کی طرح پل بھر میں مسمار ہو چکا تھا۔ وہ بہت ہی پرسکون تھا اور اپنے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہہ رہا تھا:

''شہناز، دنیا میں وہی انسان ہمیشہ کامیاب ثابت ہوتا ہے جو اپنا ہر قدم بہت سوچ سمجھ کر اٹھانے کا عادی ہوتا ہے اور جوش کے ساتھ ہوش اور جذبات کے ساتھ دانشمندی کے دامن کو کبھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیتا..... شہناز تم خود بھی ذرا حقیقت پسند ہو کر سوچو، کہ کیا تمہارے ساتھ شادی کر کے میں خوش رہ سکتا ہوں؟ بھلا کیا ملے گا مجھے تم سے شادی کر کے.....؟ اس دنیا میں کامیاب زندگی گزارنے کے لئے قدم قدم پر دولت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ دولت جس کو جہاں سے حاصل ہو سکے حاصل کرنے سے گریز نہیں کرنا چاہئے، مجھ کو اگر یاسمین سے شادی کر کے اپنے مستقبل کو تابناک بنانے کے لئے تھوڑی سی دولت مل جائے گی تو اس میں تمہیں کیا اعتراض ہے؟ تمہیں تو میرے خیال میں خوش ہونا چاہئے تھا..... بلکہ میں تو تم سے بھی یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی ایسا شخص تمہاری نگاہ میں ہو جو مالی اعتبار سے مستحکم ہو تو تم فوراً اس کے ساتھ اپنی شادی کر لو۔ یہی وقت اور حالات کا تقاضہ ہے شہناز.....'' اور اشرف کی زبان سے ایسی باتیں سن کر مت پوچھئے میرے دل کی کیا حالت ہوئی تھی، میرا دل ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا تھا، مجھ پر وہ لمحہ پہاڑ بن کر ٹوٹا تھا۔ آج بھی جب کبھی میں اشرف کی ان باتوں کی چبھن اپنے دل میں محسوس کرتی ہوں تو مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس کی وہ آخری بات تو ہمیشہ ہی میرے دل میں نشتر لگاتی رہتی ہے جو جاتے جاتے اس نے مجھ سے کہی تھی، اس نے مجھ سے کہا تھا:

''شہناز، میں نے شادی کا تو صرف ایک ناٹک کیا تھا، اس لئے کہ میں تمہارے قریب آنا چاہتا تھا، تمہارے خوب صورت جسم کو پانا چاہتا تھا، لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب نہیں ہو سکا، تم دنیا کی دوسری بہت ساری لڑکیوں سے یکسر مختلف ہو اور شاید تمہاری یہی انفرادیت تمہاری زندگی میں ہمیشہ تمہارے لئے سکھ کا کانٹا ثابت ہوگی۔''

اور پھر شہناز پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی، ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی آنکھوں کی برسات سارے زمانے کو جل تھل کر دے گی۔ مجھ سے اس کا غم سہا نہیں جا رہا تھا اور اس وقت میں اپنے پر ایک بھاری بوجھ محسوس کر رہا تھا میں نے بہت کوشش کی کہ جذبات کو قابو میں رکھوں، لیکن کامیاب نہیں ہو سکا اور زبان پر وہ ساری باتیں آنے لگیں، جو شاید مجھے اپنے دل ہی میں رکھنی تھیں۔ میں شہناز سے کہہ رہا تھا:

''شہناز! اشرف نے تمہارے ساتھ ایک ناٹک تو ضرور کیا ہے، لیکن اس نے تمہاری زندگی کے ساتھ کوئی مذاق ہرگز نہیں کیا ہے، اس نے تمہیں دھوکہ بھی نہیں دیا ہے۔ مذاق تو تمہارے ساتھ تمہاری قسمت نے کیا ہے، اسی نے تمہیں دھوکہ دیا ہے۔ اشرف تو آج بھی تمہیں اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے چاہتا ہے، آج بھی اس کے ہونٹوں پر تمہارا ہی نام مچلتا ہے، لیکن اس کے ساتھ بھی قسمت نے ستم ظریفی کی ہے، وہ چاہتے ہوئے بھی تمہیں اپنا نہیں سکا اور ایسا اس نے صرف اس لئے کیا ہے کہ اُسے ہر حال میں تمہاری خوشیاں مطلوب ہیں، اگر اس کا جرم ہے تو صرف اتنا ہے کہ اُس نے اپنی مٹھی بھر خوشیوں کے لئے تمہاری زندگی کی قیمتی مسرتوں کو قربان کر دینا گوارہ نہیں کیا اور اسے ناٹک کرنا پڑا، اپنی بے وفائی کا ناٹک.....''

(بقیہ ص ۷۳ پر)

محمد طارق

Inamdar House, P.o Kholapur, Dist- Amravati-444802 (Mob.8055503366)

پٹاری کا سانپ

گاندھی چوک کے قریب، ایک میدان میں سپیرے نے پٹاری رکھی۔ بغل میں لٹکا ہوا پنجرہ نکالا اور اسے بھی زمین پر رکھ دیا۔ پنجرے میں سرخ منھ والا نیولا بند تھا۔ پھر دوسری بغل سے لٹکا ہوا تھیلا نکالا، جس میں نہ جانے کیا کیا بھرا تھا۔ تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولا اور ایک میخ نکال کر اسے زمین میں گاڑ دیا۔ اس کے بعد شتر مرغ کی طرح گردن لمبی کر کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

پل، دو پل بعد ہی راہ گیر اس کے گرد جمع ہونے لگے، جن میں بچے بھی تھے، جوان بھی اور بوڑھے بھی۔

''آؤ بھائیو! تماشا دیکھو! دور کھڑے رہو.....دور.....''

دور! سپیرا اپنے گرد کھڑے لوگوں کو پیچھے ہٹانے لگا کچھ لوگ پیچھے ہٹے، مگر بچے اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔

سپیرا اپنے مخصوص انداز میں بولا: ''قدر دانو! میں جس سانپ کا تماشا دکھانے والا ہوں وہ دنیا کا سب سے زہریلا سانپ ہے۔'' سپیرے کے یہ جملے سن کر لوگ پیچھے کھسکنے لگے۔

''یہ سانپ بجلی کی طرح پلک جھپکتے ہی ادھر کا اُدھر ہو جاتا ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے پکڑا ہے۔ یہ سانپ بین پر ڈولنے والا نہیں، پھنکارنے والا ہے۔ یقین مانئے صاحبان، قدر دان! آپ نے ایسا سانپ کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔ پھر نیلا، چمکیلا سانپ بے قابو ہو جاتا ہے تو کسی طرح پکڑ میں نہیں آتا۔'' سپیرا پٹاری اٹھا کر لوگوں کے قریب جا کر چیختے ہوئے بولا۔ لوگ پیچھے کھسکے۔

سپیرے نے پٹاری اسی جگہ رکھ دی جہاں سے اٹھائی تھی۔

پٹاری رکھنے کے بعد سپیرے نے مجمع پر طائرانہ نظر ڈالی، کمر پر ہاتھ رکھا اور مجمع سے مخاطب ہوا:

''دوستو بھائیو! سانپ دکھانے سے پہلے ایک وِنتی ہے، گزارش ہے، عاجزانہ درخواست ہے.....یہ سامنے بیٹھے ہوئے بچہ لوگ کو پیچھے کر دیجئے۔ سانپ بہت ہی خطرناک ہے بھائیو!''

سپیرے نے اپنے لہجے میں لرزش پیدا کی۔

لوگ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے بچوں کو پیچھے کھسکانے لگے، مگر کچھ ڈھیٹ قسم کے بچے بازوؤں کو جھٹک کر سامنے ہی ڈٹے رہے۔ سپیرے نے تھیلی سے بین نکالی اور پٹاری کے پاس جھوم جھوم کر بین بجانے لگا۔ تھوڑی دیر بین بجانے کے بعد اس نے پٹاری کا ڈھکن تھوڑا سا کھولا، ادھ کھلے ڈھکن سے پٹاری میں جھانکا اور ایسے اچھلا جیسے بہت زیادہ خوف زدہ ہو گیا ہو۔ پھر جیسے اپنی سانس پر قابو پاتے ہوئے بولا:

''صاحبان! قدردان، سانپ پٹاری میں بل کھا رہا ہے، یہ بین سے مست ہونے والا نہیں، مگر میں بھی معمولی سپیرا نہیں ہوں۔ میں نے اس سے بھی زیادہ خطرناک سانپوں کو سدھارا اور اُنہیں اپنی بین پر نچایا ہے۔ یہ سانپ میں تمہیں ضرور دکھاؤں گا، یہ میری بین پر ناچے گا۔''

سپیرے نے پینترا بدلا اور نیولے کا پنجرہ کھولا، نیولا اپنے انداز میں پنجرے سے نکلا۔ اس کے گلے میں چھوٹا پٹا تھا، جس میں زنجیر بندھی ہوئی تھی۔ سپیرے نے فوراً زنجیر زمین میں گاڑی ہوئی میخ میں اٹکا دی۔ نیولا سپیرے کے اس فعل سے بے فکر حسب عادت آس پاس کی زمین کرید کر سونگھنے میں مشغول ہو گیا۔

''صاحبان! قدردان'' سپیرا پھر اپنے مخصوص انداز میں تقریباً چلاتے ہوئے بولا ''آپ لوگوں نے کتوں کی لڑائی دیکھی ہوگی۔ بلیوں کی لڑائی دیکھی ہوگی۔ انسانوں کو لڑتے ہوئے دیکھا ہوگا، ہندو مسلمان کا، اونچی نیچی ذات والوں کا جھگڑا دیکھا ہوگا ذات دھرم کا دنگا دیکھا ہوگا، لیکن کبھی آپ نے سانپ نیولے کی لڑائی دیکھی ہے؟ بولو بچہ لوگ''

''نہیں.....!''

بچے زور سے چلائے اور بڑوں نے نفی میں سر ہلائے۔

''ہاں میں جانتا ہوں۔ میں تمہیں سانپ اور نیولے کی لڑائی دکھاؤں گا..... یہ نیولا، سانپ کا دشمن ہے اور پٹاری کا سانپ، دنیا کا سب سے زہریلا اور خطرناک سانپ ہے۔ دیکھنا قدردانو! یہ چھوٹا سا نیولا اتنے بڑے سانپ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ سانپ بھی اسے ڈستا ہے، لیکن اس پر سانپ کے زہر کا اثر نہیں ہوتا۔ میں آپ لوگوں جیسا انسان ہوں، لیکن مجھ پر سانپ کے زہر کا اثر نہیں ہوتا۔ کئی بار مجھے زہریلے سانپوں نے ڈسا ہے۔ یقین نہیں آتا تو دیکھو!''

سپیرے نے اپنی میلی کچیلی قمیص کی آستین کہنی تک چڑھالی اور گھوم گھوم کر تماشائیوں کو دکھانے لگا۔ اس کی کلائی سے کہنی تک جا بجا دانتوں کے نشانات تھے۔

''مگر صاحبان! مجھ میں کوئی شکتی نہیں..... کوئی طاقت نہیں، یہ کرشن بھگوان کی کرپا ہے، تاج الدین بابا کا کرم ہے..... ہندو مسلم بھائیو!..... یہ اس تعویذ کا کمال ہے۔''

سپیرے نے اپنے گلے میں لٹکا ہوا تعویز دکھایا۔ ''دیکھو تعویذ میں ایک طرف کرشن بھگوان ہے، ایک طرف تاج الدین بابا..... تعویذ کی کوئی قیمت نہیں، ہندو بھائیو! کرشن بھگوان کے نام پر مسلمان بھائیو، تاج الدین بابا کے صدقے میں اس سپیرے کی جھولی میں صرف دس روپے ڈال دیجئے اور یہ مبارک تعویذ لے جایئے!'' سپیرے نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے تھیلا ٹٹولا اور اس میں سے تعویذ نکالے۔ ''یہ تعویذ زہر کا اثر دور کرتا ہے۔ بھوت پریت کو بھگاتا ہے۔ جادو ٹونے، بری نظر سے بچاتا ہے۔ آفتوں اور بلاؤں سے حفاظت کرتا ہے۔ صرف دس روپے۔''

ایک بوڑھے نے جیب سے دس روپے نکالے اور تعویذ لیا۔ دوسرے ادھیڑ نے بھی دس روپے تھمائے اور سپیرے نے اسے تعویذ دیا..... پھر کچھ نوجوانوں نے تعویذ خریدے..... تعویذ خریدنے والوں کی تعداد بڑھتی گئی..... سپیرا دس دس روپے وصول کر کے تعویذ دیتا رہا۔ کچھ ہی دیر میں اس کے پاس جتنے تعویذ تھے سب کے سب بک گئے۔

''بھائیو! سمئے بیت رہا ہے۔ سورج ڈھل رہا ہے۔ شام ہونے والی ہے۔ مجھے اندھیرا ہونے سے پہلے گھر پہنچنا ہے، کیوں کہ میرے چھوٹے چھوٹے بچے گھر میں اکیلے ہیں۔ ان کی ماں مر گئی ہے، اس لیے مجھے جلدی گھر پہنچ کر ان کے لیے کھانا بھی بنانا ہے، میں آپ سب سے معافی چاہتا ہوں کہ آج آپ لوگوں کو سانپ نیولے کی لڑائی نہیں دکھا سکا..... لیکن میں وعدہ کرتا ہوں، اس ڈوبتے سورج کی قسم میں کل ضرور آؤں گا اور آپ لوگوں کو اس جگہ سانپ، نیولے کی لڑائی دکھاؤں گا..... بچہ لوگ! ایک بار زور سے بجاؤ تالی۔''

اس بار کسی نے تالی نہیں بجائی، دھیرے دھیرے مجمع چھٹنے لگا۔ سپیرے نے نیولے کو پنجرے میں بند کیا اور ایک بغل میں تھیلا، دوسری بغل میں پنجرہ لٹکا کر، سر پر پٹاری رکھ کر چل پڑا.....

سپیرا شہر کی رونقوں سے بے نیاز، اپنی ہی دھن میں مست تیز تیز قدموں سے شہر کی آبادی سے دور نکل گیا۔

سڑک سنسان تھی، لیکن اس کا ذہن آباد ہو گیا۔ ذہن میں اس کی بیوی جھونپڑی کے سامنے بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے دونوں بچے کالو اور گلابو جھونپڑے کے سامنے کھیل رہے تھے۔

''آج کتنی کمائی ہوئی؟'' بیوی جیسے اس کے کانوں میں پوچھنے لگی۔ وہ ذہن میں حساب کرنے لگا۔ ''پندرہ تعویذ بکے، ایک تعویذ دس روپے کا..... پندرہ تعویذ..... وہ انگلیوں پر گننے لگا۔ ایک سو پچاس روپے۔'' اس نے خود کلامی کی ''آج بہت کمائی ہوئی۔'' کل کیا بیچو گے؟ بیوی پھر اس کے کانوں میں دریافت کرنے لگی۔

وہ کچھ سوچتے ہوئے دل ہی دل میں مسکرانے لگا، لوگ تو پیسے کے لیے اپنا ایمان، دھرم سب کچھ بیچ دیتے ہیں، میں کل چولھے کی راکھ بیچوں گا۔ اجمیر شریف کی ''عودی'' بنے گی چولھے کی راکھ، غوثِ پاک کی عودی، ہاں میں کل چولھے کی راکھ بیچوں گا۔ اجمیر شریف کی ''عودی'' بنے گی چولھے کی راکھ، غوث پاک کی عودی، ہاں میں کل چولھے کی راکھ ہی بیچوں گا۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا۔

بیوی کہے گی: ''برتن مانجھنے کو تھوڑی سی راکھ رہنے دو۔''

میں کہوں گا: ''آج مٹی سے مانجھ لے برتن۔''

سپیرا سوچتے ہوئے سنسان سڑک پر قدم بڑھا رہا تھا کہ اس کے ذہن کی دہلیز میں اس کا بڑا لڑکا کالو آیا اور وہی سوال پوچھنے لگا جو اکثر پوچھا کرتا تھا:

''ابالوگوں نے پٹاری کے سانپ کے بارے میں پوچھا ہوگا؟''

''ہاں بیٹا..... میں نے کہہ دیا، دنیا کا سب سے زہریلا سانپ ہے، سب سے خطرناک سانپ۔''

''پھرابا، لوگوں نے کہا ہوگا دکھاؤ ہم کو وہ سانپ!''

''ارے نہیں بیٹا..... میں ایسا موقع آنے ہی نہیں دیتا کہ لوگ سانپ دکھانے کی فرمائش کریں۔''

مگر کبھی ایسا موکا آ گیا تو.....تب کیا ہوگا ابا؟''

''نہیں بیٹا..... میں ایسا موقع آنے ہی نہیں دیتا کہ لوگ سانپ دکھانے کی فرمائش کریں۔''

''مگر کبھی ایسا ''موکا'' آ گیا تو.....تب کیا ہوگا ابا.....؟

''ایسا موقع میں آنے ہی نہیں دیتا۔ دنیا جھکتی ہے، جھکانے والا چاہئے سمجھا بیٹا.....''اس نے اپنے بیٹے کو سمجھایا، لیکن باپ کی یہ بات بیٹے کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس نے پھر دریافت کیا:

''مگر ابا کبھی ایسا 'موکا' آ ہی گیا تو؟''

''کچھ ہونے والا نہیں تو چنتا مت کر۔''

.....''میرے بڑے چھوکرے کو بہت فکر رہتی ہے میری!''

سپیرا خود کلامی کرنے لگا۔

سپیرا سنسان سڑک پر اپنے خیالوں کی آباد دنیا میں بیوی اور بچے سے بات چیت کرتے ہوئے اپنی بستی میں پہنچ گیا، جو شہر کی آبادی سے دور گندے نالے کے کنارے بسی ہوئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں والی مفلسوں کی بستی۔

جیسے ہی سپیرا اپنے جھونپڑے کے قریب پہنچا اس کے پاؤں تلے سے زمین کھسکنے لگی، اس کے جھونپڑے کے سامنے لوگ جمع تھے۔ اس کی بستی کے لوگ، مرد، عورتیں اور ننگ دھڑنگ بچے۔

سپیرے کی بیوی سینہ کوبی کر کے دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ چھوٹا بیٹا گلا بوبھی ہچکیاں لے رہا تھا اور اس کا بڑا لڑکا کالو..... وہ زمین پر بے حس وحرکت پڑا تھا۔

''کیا ہوا میرے بیٹے کو.....؟ میرے کالو کو کیا ہوا؟''

سپیرا حواس باختہ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں جسم کا رواں رواں کانپ اٹھا۔ پٹاری اس کے سر سے گر پڑی۔ بے ساختہ اس نے بغل میں لٹکا ہوا پنجرہ اور تھیلا ایک طرف ڈالا اور زمین پر پڑے ہوئے اپنے بیٹے کی طرف لپکا۔

''کیا ہوا اسے؟ کوئی تو بولو..... کیا ہوا میرے کالو..... کیا ہوا؟''اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئی تھیں وہ گلوگیر آواز میں چیخا:

''کیا ہوا میرے کالو کو!؟''

''کیا ہونا تھا.....''ایک آدمی بولا:

''کالو تمہاری خالی پٹاری کے لئے نالے پر سانپ پکڑنے گیا تھا۔ سانپ نے اسے ڈس لیا۔''

''نہیں .....نہیں! یہ کیا کر بیٹھا تو میرے کالو! میں دنیا کو دھوکا دیتا رہا تھا۔ آج تو نے یہ کیا کر لیا.....آں.....آں''سپیرا کالو کی لاش سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا..... ❁❁

ایثار محبت (ص ۷۰ سے آگے)

''یہ سب آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے.....''اور شہناز حیرت کی تصویر بنی میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، اس کی آنکھیں جیسے مجھ سے کہہ رہی تھیں، خدارا مجھے جلد از جلد سب کچھ سچ سچ بتا دیجئے مجھ میں اب ضبط کی قوت بالکل نہیں ہے۔

میرے دل کا بھی اس وقت عجیب عالم تھا، جذبات کی شدت سے میری زبان جیسے گنگ ہو کر رہ گئی تھی، آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے، تاہم اپنے جذبات پر قابو پانے کے لئے اپنے اندر کی قوتوں کو میں نے کسی طرح سے سمیٹا تھا اور پھر بڑی مشکلوں سے میں شہناز سے صرف اتنا کہہ سکا تھا:

''شہناز! اشرف تمہیں آج بھی ٹوٹ کر چاہتا ہے، لیکن حالات نے اسے بہت بے بس کر دیا ہے، وہ آج بھی بمبئی کے ایک اسپتال کے کینسر وارڈ میں موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا شاید دن رات تمہارا ہی خواب دیکھا کرتا ہے..... ہاں شہناز، اشرف کو خطرناک قسم کا کینسر ہو گیا ہے اور شاید اب وہ بہت دنوں تک زندہ نہ رہ سکے۔ ❁❁

امتیاز غدر

C/o Salim House, Shahid Gaddah, Pani Tanki, Purana Bazar, Gomoh,
Dhanbad - 828401 (Jharkhand) (Mob. 7654507122)

غم کے سائے میں خوشی

جیسے ہی ٹرین پلیٹ فارم پر آ کر کھڑی ہوئی، اس کے انتظار میں کھڑے مسافر بھوکے شیر کی مانند اس پر ٹوٹ پڑے۔ اترنے والوں سے زیادہ اس پر چڑھنے والوں کی ہوڑ لگ گئی۔ بڑی مشکل سے آگے سے آرہے ایک مسافر کی خوشامد کرنے پر عابد حسین کو بیٹھنے کے لئے سیٹ نصیب ہوئی۔ جب عابد حسین کی سانسیں دُرست ہوئیں، تب ان کا دھیان اپنے پرس اور موبائل کی جانب متوجہ ہوا۔ دونوں ایشا کو اپنی جگہ محفوظ پا کر انہیں قدرے اطمینان ہوا۔

ایسی بھیڑ بھاڑ والی لوکل ٹرینوں میں اکثر جیب کتروں کی چاندی ہو جایا کرتی تھی۔ ویسے تو عابد حسین اپنے پرس، جس میں ٹکٹ اور موبائل بھی تھا، کو لے کر خاصا احتیاط برت رہے تھے، لیکن سچائی یہی تھی کہ ٹرین میں سیٹ پانے کی دُھن میں کچھ لمحوں کے لئے وہ ان چیزوں کو فراموش کر گئے تھے۔ خیر اب سب کُچھ اپنی جگہ درست تھا۔

ٹرین کچھ وقفہ ٹھہرنے کے بعد آہستہ آہستہ اپنی منزل کی جانب روانہ ہونے لگی۔ اب عابد حسین نے ایک سرسری نگاہ ڈِبے میں سوار مسافروں پر دوڑائی۔ پورا ڈِبہ مسافروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جتنے مسافر سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے، تقریباً اتنے ہی مسافر کسی نہ کسی چیز کا سہارا لے کر کھڑے تھے۔ کچھ پہیے کی کھٹر کھٹر، تو کچھ مسافروں اور ہاکروں کی چیں چاں سے ایک شور سا ماحول تھا۔

اب عابد حسین نے اپنے ہم سفر افراد کا معائنہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ذہنی طور پر مطمئن ہو لینا چاہتے تھے کہ اُن کے ہم سفر کس لیبل کے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ ان کی شکل وصورت سے بھی متعارف ہو لینا چاہتے تھے، تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی۔ اُنہیں یہ عادت کالج کے زمانے میں جاسوسی ادب بہت زیادہ پڑھنے کی وجہ سے لگ گئی تھی۔ ایسے ادب میں اکثر یہ بتایا جاتا تھا کہ اگر آپ ٹرین یا بس میں سفر کر رہے ہیں، تو اپنی سیٹ پر بیٹھنے سے قبل اس کے اِرد گرد رکھی اشیا کا اچھی طرح سے معائنہ کر لیں کہ کہیں کوئی اعتراض والی چیز تو نہیں رکھی ہوئی ہے۔ ساتھ ہی آزو باز و بیٹھے ہوئے اشخاص کے چہروں اور ان کی شکل وصورت کا بھی معائنہ کر لیں۔ ہو سکے ان میں سے کوئی غلط حرکت کرنے والا ہو اور بھیڑ میں کوئی اُلٹی سیدھی حرکت کر کے فرار ہو جائے، تو بعد میں پولیس کو اُس کا حلیہ بتانے میں دِقت نہ ہو۔ اُن کے اس طرح کے معائنہ کرنے کی عادت نے ایک دفعہ دو ایسے اشخاص کو پکڑوانے میں پولیس کی مدد کی تھی، جو ٹرینوں میں مسافروں کو نشہ آور ایشیا کھلا کر ان کے سامانوں کو غائب کرنے کا کام کرتے تھے۔

ہوا یوں تھا کہ ایک دفعہ وہ ایک ایکسپریس ٹرین کے جنرل ڈِبے میں سفر کر رہے تھے۔ اُس کے باز و میں ہی دو جنٹل مین ٹائپ کے مسافر بیٹھے ہوئے تھے۔ باقی مسافر مہاجر مزدور لگ رہے تھے، شاید کسی بڑے شہر سے کمائی کر کے اپنے اپنے گاؤں واپس لوٹ رہے تھے۔ ایسا اُن کے درمیان ہو رہی گفتگو سے اُنہیں اندازہ ہوا تھا۔ وہ ان کے درمیان رہتے ہوئے کئی اسٹیشن گزار چکے تھے۔ اس وجہ سے ان کے حلئے سے وہ اچھی طرح واقف بھی ہو گئے، لیکن کسی سے ان کی کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی، ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ ہاں، ان دونوں جنٹل ٹائپ آدمیوں نے ان مزدوروں سے کافی دوستی بڑھالی تھی اور ایسا معلوم پڑ رہا تھا کہ وہ دونوں بھی ان مزدوروں کے گرد و نواح کے گاؤں کے ہی رہنے والے ہیں۔ اُن کے درمیان انسیت اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ ایک دوسرے کو کھانے پینے کی ایشیا لینے دینے لگ گئے تھے۔ ان دونوں جنٹل مین نے عابد حسین کو بھی چائے اور بسکٹ لینے کا آفر کیا تھا، جسے

اس نے مسکرا کر منع کر دیا تھا۔

اسی درمیان عابد حسین کو رفع حاجت کی ضرورت پڑ گئی۔ ٹوائلٹ کے قریب پہنچے تو پایا کہ وہاں پہلے ہی سے کئی لوگ رفع حاجت کے لئے کھڑے ہیں۔ انہوں نے ایک ٹوائلٹ کے دروازے کے باہر انتظار کرنا بہتر سمجھا اور تقریباً آدھے گھنٹے بعد جب وہ اپنی سیٹ پر واپس لوٹے۔ تب وہاں کا منظر دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے۔ دونوں جنٹل مین اپنی جگہ سے غائب تھے۔ شاید کسی اسٹیشن پر اتر چکے تھے۔ باقی مسافر اپنی اپنی سیٹوں پر گہری نیند سو رہے تھے۔

انہوں نے سوچا، شاید یہ سب تھکے ماندے تھے، اس وجہ سے آرام فرما رہے ہیں۔ وہ اپنے موبائل میں مصروف ہو گئے، لیکن اگلے اسٹیشن سے گاڑی روانہ ہونے کے بعد جب ٹکٹ چیکر ٹکٹ مانگتے مانگتے ان کے قریب پہنچا، تب جا کر راز عیاں ہوا۔ وہ دونوں جنٹل مین مہاجر مزدوروں کو نشہ آور اشیا کھلا کر ان کے روپے پیسے اور قیمتی سامانوں کو لے کر فرار ہو چکے تھے۔

ٹکٹ چیکر کی مدد سے ان سارے متاثرہ مسافروں کو اگلے اسٹیشن پر اتارا گیا۔ اتفاق سے عابد حسین کو بھی اسی اسٹیشن پر اُترنا تھا۔ سب سے پہلے سارے مسافروں کو ہوش میں لانے کی کوشش کی گئی، پھر پولیس کاروائی شروع ہوئی۔ پولیس کو عابد حسین کے ذریعے بتائے گئے بدمعاشوں کے حلئے سے کافی مدد ملی اور پولیس کی فوری کاروائی سے دونوں بدمعاش پکڑے گئے۔

عابد حسین اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اچانک چونک پڑے اور ٹھیک سامنے کی سیٹ پر کونے میں بیٹھے داڑھی والے شخص کو جو اپنے موبائل کے ساتھ مصروف تھا، غور سے دیکھنے لگے۔

''بھائی صاحب، اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں، تو کہیں آپ کا نام سہیل احمد تو نہیں ہے؟'' آخر ان سے نہیں رہا گیا۔ اپنے دماغ میں ہلچل مچا رہے شک کو اطمینان بخشنے کے لئے اسے ٹوک ہی دیا۔ اپنی جانب کسی کو مخاطب پا کر پہلے اس شخص نے اپنی ناک پر سرک آئے چشمے کو درست کیا۔ پھر اپنی آنکھیں بڑی بڑی کر کے ان کی جانب متجسس نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ کچھ لمحے غور سے نہارنے کے بعد وہ شخص بھی مانو کہ اپنی سیٹ پر اُچھل پڑا۔

''ارے، عابد حسین.....!''

دونوں بچپن کے ہم پیالہ، ہم نوالہ تھے۔ اُن کا بچپن ایک جگہ گزرا تھا، وہ دونوں آسنسول ریلوے کالونی میں ساتھ کھیلے کودے۔ ساتھ ساتھ ایک ہی اسکول میں پڑھے لکھے۔ ہائر سیکنڈری تک دونوں ساتھ ساتھ رہے۔ دونوں کے والد محترم ریلوے میں ملازم تھے اور اتفاق سے دونوں کو ایک ہی کالونی میں کوارٹر بھی ملا ہوا تھا۔ جہاں دونوں کے خاندان والے آپس میں گھل مل کر رہ رہے تھے۔ بڑی ہی مستی بھرا بچپن گزرا تھا دونوں کا۔ دونوں ساتھ ساتھ کالج بھی جوائن کرنے والے تھے، لیکن بدقسمتی سے دونوں ویسا کر نہیں سکے۔

ایک دن اچانک ڈیوٹی کے دوران سہیل احمد کے والد محترم بس دیکھتے دیکھتے چل بسے۔ ایک مصیبت تھی جو خاندان پر آ گئی، مگر ایسا ہوا کہ اس کا ایک حل نکل آیا۔ خاندان میں سب سے بڑا ہونے کی وجہ کر انہیں والد کی جگہ نوکری مل گئی پڑ گئی۔ دوسری جانب اُسی سال عابد حسین کے والد کا درگاپور تبادلہ ہوا تو دونوں ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔

شروع شروع میں دونوں خاندان والوں کے درمیان تعلقات بنے رہے، لیکن آہستہ آہستہ دونوں جانب کے افراد اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف ہوتے چلے گئے اور ایک دوسرے کو بھولتے گئے۔ آج اتفاق سے دونوں دوست ایک بار پھر مل گئے تھے۔

''اور سناؤ سہیل، سب کچھ خیریت سے تو ہے؟''

عابد حسین نے گفتگو کی شروعات کی۔

''جی، الحمدللہ، سب بہتر ہے۔ تم سناؤ، کیسی چل رہی ہے، بال بچے کیسے ہیں؟'' اب دونوں آپ سے تم پر آ گئے تھے۔

''جی، سب خیریت سے ہیں!''

عابد حسین نے گرم جوشی سے جواب دیا۔

اس رسمی گفتگو کے بعد دونوں کے درمیان مختلف موضوع پر ایک لمبی گفتگو ہوئی۔ اور بات چیت کا یہ سلسلہ سہیل احمد کے آسنسول اسٹیشن پہنچنے تک جاری رہا۔ ان کے درمیان ہوئی گفتگو سے یہی جانکاری نکل کر سامنے آئی کہ سہیل احمد کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ بیٹیوں کی

شادی ہو چکی ہے۔ سب اپنے اپنے سسرال میں خوش ہیں۔ دونوں لڑکے کنوارے ہیں اور اپنے حساب سے لکھ پڑھ رہے ہیں۔ بڑے بیٹے ریحان کی شادی کرنی ہے۔ دونوں بیٹیوں کے رُخصت ہو جانے کی وجہ کر گھر کے سارے کاموں کا بوجھ اکیلے بیگم کے کندھوں پر آ پڑا ہے اور مصیبت یہ ہے کہ اب عمر ہو جانے کی وجہ سے وہ اکثر بیمار رہنے لگی ہیں۔ ریحان کے لئے کوئی معقول رِشتے کی تلاش میں ہیں وہ۔

دوسری جانب، عابد حسین کے دو بیٹے ہیں اور ایک پیاری سی بیٹی اُم ماریہ ہے، جواب سیانی ہو چلی ہے۔ بیگم روزانہ اس کے رشتے کے لئے رشتے داروں میں بات چلانے کو کہتی ہے، لیکن وہ چاہتے ہیں کہ اپنی اکلوتی بیٹی کا رشتہ ایسے خاندان میں کریں جہاں عیش وعشرت کی چیزیں کم ہی ہوں، لیکن لوگ مہذب اور طریقے والے ہوں۔

دونوں ایک دوسرے کی اولادوں کو دیکھنے کی تمنا دل ہی دل لئے اور ''انشاء اللہ پھر ملیں گے'' کے واعدے کے ساتھ رخصت ہوئے، لیکن رُخصت ہونے سے قبل دونوں ایک دوسرے کا موبائل نمبر لینا نہیں بھولے۔ سہیل احمد آسنسول اسٹیشن پر اُتر گئے اور عابد حسین دُرگاپور کے لئے گاڑی پر بیٹھے رہے۔

اس کے بعد چار پانچ مہینے تک دونوں خاندان والوں کے درمیان موبائل کے ذریعے بات چیت جاری رہی۔ اس کے ساتھ ہی وہاٹس ایپ کے ذریعے دونوں خاندان کے افراد کی مختلف اقسام کی تصاویر کا لین دین ہوتا رہا، پھر ایک دن دونوں خاندان والوں نے ایک جگہ بیٹھ کر آپس میں رِشتے دار بننے کی بات پر مہر لگا دی۔

اُم ماریہ سہیل احمد کی بہو بن کر کافی خوش تھی۔ عابد حسین کی خوشی کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس کی لختِ جگر، اس کی جان، اس کی اکلوتی بیٹی محفوظ ہاتھوں میں گئی تھی۔ لڑکا بے روزگار ہی سہی، مگر تھا وہ اپنے بچپن کے دوست کا فرزند اوّل۔ خوب تربیت پائی تھی اس نے اپنے والدین سے وہ اس کی بیٹی ام ماریہ کو خوش رکھے گا، اس کا اُسے پورا یقین تھا۔

وقت پر لگا کر پرواز کرتا رہا۔

ایک دن خبر آئی کہ عابد حسین نانا بن گئے ہیں۔ اُم ماریہ نے ایک خوبصورت سے بچے کو جنم دیا تھا۔ دونوں خاندان والے ایک بار پھر خوشی سے جھوم اُٹھے تھے۔ دونوں جانب سے مختلف اقسام کے تحفے تحائف کا خوب تبادلہ ہوا، دعوتوں کا دور چلا۔ یعنی ان سب کے لئے ایک تہوار سا ماحول بن گیا تھا، لیکن عابد حسین کے دل میں ایک خلش تھی جو رہ رہ کر انہیں بے چین کر رہی تھی۔ ان کے داماد کے علاوہ سہیل احمد کے باقی دونوں بیٹے کہیں نہ کہیں جاب میں لگ چکے تھے اور ابھی سے ہی کام کے بہانے خاندان والوں سے علیحدہ رہنے لگ گئے تھے۔ ان کا داماد ریحان بھی نوکری کے لئے خوب ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، لیکن اس کی تقدیر کہئے یا پھر اس کی محنت میں کہیں کمی رہ جا رہی تھی کہ ابھی تک وہ کہیں سیٹل نہیں ہو پایا تھا۔ ابھی تک والد کی کمائی پر ہی گزارہ کر رہا تھا۔

اس بات کی فکر عابد حسین سے زیادہ سہیل احمد کو تھی۔ انہوں نے ریحان کو کئی دفعہ سمجھانے کی بھی کوشش کی تھی کہ بیٹا نوکری کے پیچھے مت بھاگو۔ تم کہو تو تمہارے لیئے کوئی تجارت کا انتظام کر دیتا ہوں، لیکن ریحان کو نہ کسی تجارت میں کوئی دلچسپی تھی اور نہ اس کا اسے کوئی تجربہ ہی تھا۔ عابد حسین نے بھی ایک نہیں، کئی دفعہ اشاروں ہی اشاروں میں اسے کوئی مناسب تجارت شروع کرنے کی صلاح دی تھی، لیکن ہر دفعہ ''سوچتے ہیں'' کہہ کر بات ٹال جاتا تھا۔ بیٹے کے تولد ہونے کے بعد اُم ماریہ بھی اسے سمجھانے لگی تھی۔

''کیوں نہ بازار میں کوئی دوکان ہی ڈال لیتے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے کچھ کمائی بھی ہو جائے گی اور جب گاہک نہ رہیں، تب جاب کی تیاری بھی جاری رہے گی۔''

''دوکان ڈالنے کے لئے ساری عمر پڑی ہوئی ہے ماریہ۔ ابھی نوکری پانے کی عمر باقی ہے۔ ابھی تو کوشش کر لینے دو۔''

وہ اپنی اہلیہ کو دوٹوک جواب دے دیتا تھا۔ وہ لاجواب ہو جاتی تھی۔ اب دونوں خاندان والے اس کی نوکری کو لے کر طرح طرح کی منتیں بھی مانگنے لگ گئے تھے۔

ایک دن عابد حسین صبح کی نماز کے بعد خدا سے خوب گڑگڑا کر ریحان کے لئے دُعا مانگنے لگے۔ آخیر اس کی اکلوتی بیٹی کا مستقبل بھی ریحان کے مستقبل کے ساتھ منسلک تھا۔ ابھی وہ دُعا کر کے اٹھے ہی تھے کہ پاس رکھا ہوا موبائل گھنگھنا اُٹھا۔ ایک منحوس خبر تھی۔ لاسٹ نائٹ

ڈیوٹی کرتے ہوئے کام کے دوران ہی سہیل احمد حادثے کا شکار ہوگئے تھے۔ انہیں نزدیکی اسپتال میں بھرتی کرایا گیا تھا، جہاں ان کی حالت نازک بنی ہوئی تھی۔ اس خبر سے عابد حسین کو بہت تکلف پہنچی۔ آخر رشتے دار کے ساتھ ساتھ وہ بچپن کا دوست تھا وہ۔ اس کے ہمراہ بچپن میں گزارے بہت سارے خوشنما لمحے انہیں یاد آنے لگے اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپک پڑے۔

ابھی آفتاب صبح سے طلوع بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ اس سے قبل وہ اپنی اہلیہ کے ہمراہ اسپتال پہنچ گئے، لیکن ان کی بدقسمتی کہ وہ سہیل احمد کو زندہ منھ نہیں دیکھ پائے۔ دو خاندانوں کی ہنستی کھیلتی زندگی میں اچانک غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

گھر پر سہیل احمد کو غسل دینے اور کفنانے کا عمل جاری تھا۔ قریبی رشتے دار اور محلے کے کچھ لوگ اس کام میں مستعدی سے لگے ہوئے تھے۔ عابد حسین ایک گوشے میں بیٹھے کچھ بزرگ رشتے داروں کے درمیان ہو رہی گفتگو کو بھی سن رہے تھے۔

''بڑے بیٹا ریحان کو اب والد کی جگہ ریلوے کی جانب سے نوکری مل ہی جائے گی۔ سہیل جاتے جاتے بیٹے کے حق میں بھلا ہی کر گیا۔'' اور جب عابد حسین اپنے بچپن کے دوست کو مٹی کے حوالے کر کے واپس لوٹ رہے تھے، تب تک ان کے ذہن میں آرہے خیالوں میں کافی تبدیلی آ چکی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے ذہن میں بزرگوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کے الفاظ آ ہی جا رہے تھے کہ والد کی جگہ اب ریحان کو نوکری مل ہی جائے گی۔ یعنی ان کی بیٹی کا مستقبل اب محفوظ ہو ہی جائے گا، انشاءاللہ۔

گھر پہنچتے پہنچتے وہ اپنے دوست کی جدائی کے غم سے کب اور کیسے خود کو ہلکا محسوس کرنے لگے، اس کا انہیں بھی علم نہ ہو پایا۔ ❁❁

جنوںؔ اشرفی اور اُن کا نمونۂ کلام

چند برسوں پہلے گزرنے والا ''کرونائی'' وبا کا دور نہ جانے کتنے ہی ارباب شعروادب کو اپنے ساتھ لے گیا۔ انہیں شاعروں میں جنوںؔ اشرفی بھی شامل ہیں۔

ان کا اصل نام احمد درویش تھا، لیکن شعروادب کی دنیا میں وہ اپنے قلمی نام سے ہی جانے پہچانے جاتے تھے۔ وہ ایک موقر سادات خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والدین کا نام سید عبدالباری اشرفی اور بی بی ولی فاطمہ ہے۔ تعلیمی سند کے بموجب جنوںؔ اشرفی کی تاریخ ولادت ۳۰ ستمبر ۱۹۴۲ء اور جائے ولادت گورگاواں، چھوٹی کھگول، داناپور ہے۔ ریلوے ہائی اسکول داناپور سے میٹرک، بی ایس کالج داناپور سے انٹر اور پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ سے اردو میں بی اے آنرس کی ڈگری لینے کے بعد بحیثیت آڈیٹر، محکمہ ڈیفنس میں ملازمت سے انہوں نے عملی زندگی کا آغاز کیا اور اسسٹنٹ اکاؤنٹس آفیسر کی حیثیت سے اپنی مدت ملازمت پوری کر کے سبکدوش ہوئے۔ جنوںؔ اشرفی کی شاعری کا سال آغاز ۱۹۶۳ء ہے۔ انہیں منظور تسکینؔ، نواب غضنفر دانشؔ اور قیصر شمیمؔ سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ جنوںؔ اشرفی کے مجموعہ ہائے سخن ''شجر خزاں رسیدہ'' (۲۰۰۶ء) ''تشنہ لب'' (۲۰۱۷ء) اور ''متاع جنوںؔ'' (۲۰۱۸ء) اشاعت یافتہ ہیں۔ جنوںؔ اشرفی ''د-احمد'' کے نام سے نثر میں بھی ''ادبی پوسٹ مارٹم'' لکھا کرتے تھے۔ جنوںؔ اشرفی کی وفات ۲۸ مئی ۲۰۲۱ء کو ہوئی۔ نمونۂ کلام ؎

آپ کی ذات مقدس ہے ضیا — آپ کے سارے حوالے روشنی
نور سے جن کے منور ہے جہاں — آپ ہیں وہ کملی والے روشنی
اس شہر بے نوا میں جو عالی جناب ہے — اخلاص کی ڈگر یہ وہ خانہ خراب ہے
فانوس اپنے ہاتھ میں تقدیس کا لئے — یوں جرم کر رہا ہے بشر جیسے ہو ثواب
جہاں سفید کبوتر اُڑائے جاتے ہیں — وہیں چراغ لہو کے جلائے جاتے ہیں
مانا مرے آنگن میں اجالا نہیں اترا — دیوار پہ آثار سحر دیکھ رہا ہوں

گاہے گاہے...

ریاض احمد*

اسلوب

کیا جانے دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میرؔ کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

اسلوب، طرز، ادا، انداز وغیرہ کم وبیش ایک ہی معنی میں ہمارے ہاں مدت سے رائج ہیں، لیکن ان کا مفہوم ابھی تک تعین سے آزاد ہی رہا ہے، مثلاً جب سعداللہ گلشن نے ولیؔ کو مشورہ دیا تھا کہ یہ مضامین کے ذخیرے جو فارسی میں بے مصرف پڑے ہیں، انہیں اپنے تصرف میں لاؤ تم سے کون تعرض کرے گا اور اس کے بعد ولیؔ نے اردو شاعری کو ایک نئی طرز، ایک نیا اسلوب دیا تو بظاہر کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ اسلوب کی تبدیلی یا اسلوب کا امتیاز مضامین سے وابستہ ہے یا پھر فورٹ ولیم کالج کی تحریک پر غور کیجئے تو محسوس ہوگا کہ اسلوب کا دارومدار زبان کے استعمال پر منحصر ہے۔ سرسید تحریک نے بیک وقت زبان کی سادگی پر بھی زور دیا اور ساتھ ہی مضامین کی نوعیت بھی متعین کرنے کی کوشش کی، چنانچہ یہ بات واضح طور پر سمجھ میں نہیں آتی کہ جب ہم اسلوب کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد مصنف کے مضامین کی خاص افتاد ہوتی ہے یا زبان کے استعمال میں اس کی کوئی تخصیص۔

یوں دیکھئے تو ابھی الجھاؤ کی اور بھی کئی صورتیں باقی ہیں، مثلاً ہم جانتے ہیں کہ اردو زبان کا اسلوب بحیثیت مجموعی انگریزی اسلوب یا چینی زبان کے اسلوب سے مختلف ہے۔ عربی زبان کی فصاحت وبلاغت ضرب المثل ہے جس کے مقابلے میں فارسی کے پاس ایک شیرینی ہے اور اردو کا خاصہ شاید یہ ہو کہ اس میں ایک پگھلے ہوئے مواد کی سی خاصیت ہے جو ہر سانچے کو قبول کر لیتا ہے اور ہر نئی آمیزش کو اپنے اندر سمو سکتا ہے۔ یہ کچھ زبان کے مزاج اور لہجے کی بات ہوئی۔ پشتو میں کسی کو باتیں کرتے سنئے تو اس کے ہر لفظ سے ایک کرختگی، ایک مبارز طلبی کی سی کیفیت ٹپکتی ہے۔ یہ کرختگی اصوات کی حد تک پنجابی کی بعض صورتوں میں بھی نظر آتی ہے، لیکن ساتھ ہی لہجے کا اکھڑ پن کسی قدر گھلاوٹ سے آشنا ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ اکھڑ پن ایک دفعہ پھر ہریانہ کی زبان میں اُبھرتا ہے اور آہستہ آہستہ دہلی اور لکھنؤ کی شائستگی، نزاکت اور لوچ میں ڈھل جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ زبان کی یہ خصوصیت، لہجے کی یہ مخصوص افتاد کچھ نہ کچھ تحریر میں ضرور جھلکتی ہوگی۔ زبان اور لفظ دوسرے فنون کے ذریعہ اظہار کے مقابلے میں گویا ایک تشخیص کے حامل ہیں۔ دوسرے ذرائع مثلاً رنگ، صوت، پتھر وغیرہ کی حیثیت بے جان، غیر جانب دار مواد کی سی ہے جسے جس طرح چاہئے ڈھال لیجئے، لیکن زبان اور لفظ کا معاملہ مختلف ہے، یہ سانچے میں ڈھلنے سے پہلے اس امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ ذرا سانچہ ہمیں بھی دکھا لیجئے۔ شاید یہی وجہ ہو کہ مضامین کے اختلاف کے ساتھ ساتھ کچھ زبان بدلتی رہتی ہے، ورنہ سنگ تراش تو اسی ایک پتھر سے ایک زہد فریب نازنین کا بت بھی تخلیق کر سکتا ہے اور ایک نہایت نفرت انگیز چڑیل کا بھی۔ مترادفات میں باہم ایک نازک فرق ہوتا ہے۔ یہ فرق اسی تشخص، اسی انفرادیت کا مظہر ہے۔

زبان کی مجموعی خصوصیت سے قطع نظر ہر شخص کا بات کرنے کا ڈھنگ علیحدہ ہوتا ہے۔ کسی کے لہجے میں گنوار پن پایا جاتا ہے۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بعض اوقات ایک ایسے انداز میں بات کرنے کے

---

* ریاض احمد، حلقہ ارباب ذوق، لاہور کے اہم ناقدین میں محسوب ہوتے ہیں، ان کی تاریخ ولادت ۲۰/اکتوبر ۱۹۲۰ء ہے اور جائے ولادت گوجرانوالہ، پنجاب (موجودہ پاکستان) انہوں نے اپنے گاؤں میں ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۳۹ء میں مرے کالج، سیالکوٹ سے گریجویشن اور ۱۹۵۲ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے کی سند حاصل کی۔ ۱۹۴۲ء فنانشل کمشنر لاہور کے دفتر میں انہوں نے ملازمت اختیار کی تھی اور اسی زمانے سے تحریر کی دنیا میں بھی اُن کے فکری وفنی جوہر نکھر کر سامنے آنے لگے۔ وہ حلقہ ارباب ذوق لاہور سے منسلک تھے۔ ان کے تنقیدی مضامین اپنا ایک منفرد رنگ رکھتے ہیں جن میں نفسیات کا پہلو بہت خاص ہے۔ ان کا مضمون ''اسلوب'' حلقہ ارباب ادب کے ترجمان ''نئی تحریریں'' لاہور، نومبر ۱۹۵۷ء میں (ص ۶۷ تا ص ۷۳) اشاعت یافتہ ہے اور اسی حوالے کے ساتھ یہاں اسے شامل کیا گیا ہے۔

عادی ہوتے ہیں جس سے جہالت ٹپکتی ہے، بعض کے ہاں روانی ملتی ہے، بعض کے ہاں ایک اکھڑا اکھڑا بے ربط انداز، بعض کی زبان میں شائستگی، لطافت جھلکتی ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کے اعلیٰ خاندان اور ان کے مقابلے میں اسی شہر میں بسنے والے عامیوں کو دیکھ لیجئے۔ لہجے کے فرق کی ایک عمومی صورت واضح طور پر سامنے آجاتی ہے، لیکن پھر بھی ان خاندانوں کے مختلف افراد میں بھی تو کچھ نہ کچھ اختلاف ہوگا۔ دراصل یہ اختلاف، مزاج اور شخصیت کا اختلاف ہوتا ہے۔ ایک صحت مند شخصیت جو نفسیاتی اور ذہنی الجھاؤ سے آزاد ہو، ظاہر ہے کہ لہجے میں ایک کھلا کھلا نکھرا ہوا انداز اختیار کرے گی۔ اس کے مقابلے میں ایک مجرمانہ ذہن تملق چاپلوسی اور کچھ اخفا کا حامل ہوگا، چنانچہ زبان کے لہجے کا مجموعی امتیاز ایک ہی زبان کے مختلف روپ اور اُن کی خصوصیات، پھر شخصیت کے داخلی پہلوؤں کا پرتو، ایک تحریر میں یہ تین قوتیں باہم دست وگریباں ہوتی ہیں، کہیں ان میں ہم آہنگی پیدا ہوگئی تو بات بن گئی، ورنہ انمل، بے جوڑ سی صورت پیدا ہوگئی۔

تو پھر کیا یہ فرض کرلیا جائے کہ اسلوب عبارت ہوتا ہے زبان کے مخصوص استعمال سے؟ لیکن زبان کو آپ محض زبان کی خاطر تو کبھی استعمال نہیں کرتے، بات کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو بات کہی جاتی ہے۔ یہ ضرورت بھی تو آخر کوئی حیثیت رکھتی ہوگی۔ اس ضرورت کی دو حیثیتوں پر سرِدست غور کیجئے۔ ایک سائنسدان اپنی معمل میں کچھ تجربات کرنے کے بعد ایک خاص نتیجے پر پہنچتا ہے اور پھر اس نتیجے کو دوسرے لوگوں کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے۔ اس کام کے لئے وہ زبان کو استعمال کرتا ہے، اس کے پاس اشیا کی ایک فہرست ہے۔ ان اشیا کے لئے کچھ اسما پہلے سے وضع ہیں۔ وہ ان اسما کو قواعد اور منطق کے سہارے ایک مربوط سلسلے میں پرو دیتا ہے اور جب یہ سلسلہ سامنے آتا ہے تو ہم اس کی بات سمجھ لیتے ہیں اور جب اس کی تحریر سے بحث کرتے ہیں تو اس کی دلیل کی خامی یا خوبی اور موضوع کی ضرورت، اہمیت، صحت یا عدم صحت پیش نظر رہتی ہے (اور یہاں) زبان کی حیثیت محض ثانوی ہوتی ہے۔

زبان کے متعلق ہم صرف یہ تقاضا کرتے ہیں کہ قواعد کی رو سے درست اور ابلاغ کے اعتبار سے ناقص نہ ہو۔ اس کے مقابلے میں ایک اور شخص ہے کہ اسے اس قسم کی کوئی ضرورت درپیش نہیں ہے، لیکن وہ شعر کہتا ہے یا افسانہ لکھتا ہے۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ افسانہ نویس یا شاعر کے پیش نظر کوئی ایسے معانی نہ ہوں جنہیں وہ دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہو یا جن کے اظہار سے اسے آسودگی حاصل ہوتی ہو۔ یہ بحث کہ ادیب کا مقصد ابلاغ ہے یا نہیں، معانی کے وجود یا عدم وجود سے تعلق نہیں رکھتی۔ اس کا علاقہ قاری یا مصنف کا باہمی تعلق ہے یعنی مصنف کا مقصود محض قاری تک کسی بات کا پہنچانا ہوتا ہے یا نہیں۔ اسے ابلاغ کہہ لیجئے۔

دوسری اصطلاح یعنی اظہار کا مطلب یہ ہے کہ کیا مصنف کے لئے قاری کا وجود اور اس کی بات کا قاری تک ابلاغ کسی اہمیت کا حامل ہے یا نہیں۔ سائنسداں کی مثال میں صرف ابلاغ ہی مقصود ہے، لیکن شاعر یا ادیب بات کہنے سے خود اپنی شخصیت کے کسی تشنہ پہلو کو آسودہ کرتا ہے، اس لئے ابلاغ ثانوی حیثیت کا مالک ہے۔ اصل مقصد یہ ہے کہ اس کی شخصیت کا کوئی پہلو جو عملاً تشنہ رہ گیا تھا، وہ تحریر میں آسودگی چاہتا ہے اور اس کا ابلاغ تب جا کر مکمل ہوتا ہے جب اس کی تخلیق قاری میں اس تشنگی اور اس تشنگی کی آسودگی کا احساس پیدا کرتی ہے۔ اس حالت میں زبان کی حیثیت ثانوی نہیں رہتی، کیونکہ زبان کا انداز اس بنیادی اُلجھن یا تشنگی کے انداز سے ہی تشکیل پاتا ہے اور زبان کے استعمال کو سمجھے بغیر بنیادی الجھن یا تشنگی یا جذباتی تحریک کا انداز سمجھ میں نہیں آتا۔ زبان کی اسی اہمیت کے پیش نظر ایک دوسری زبان کی شاعری کو کماحقہٗ سمجھنا مشکل ہوجاتا ہے۔

گویا اسلوب ادب میں تخلیق پاتا ہے بنیادی احساس کے اس اظہار سے جو لفظ اور زبان کی معنوی اور اشاراتی کیفیت سے قطع نظر زبان کے مخصوص طریق استعمال سے مترشح ہوتا ہے، جس کی مثال اوپر یوں پیش کی گئی ہے کہ تملق، چاپلوسی یا اخفا کا اثر کسی شخص کے لہجے میں اس کی مجرمانہ ذہنیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مشکل صرف یہ ہے کہ تحریر میں لہجے کی احانت حاصل نہیں ہوتی اس لئے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اسلوب کیوں کر پیدا ہوا ہے اور اس نے مخصوص تاثر کیوں کر پیدا کیا ہے۔

تحریر میں یہ کام سرتاسر مجاز سے لیا جاتا ہے۔ مجاز زبان کے استعمال کے اس طریق کا نام ہے جس میں لفظ کی دلالتیں تلازمات سے وضع کی جاتی ہیں۔ تلازمہ تشبیہ، استعارہ، کنایہ، رمز وغیرہ کی تشکیل کرتا

ہے۔تلازمات ازخود حسی مماثلات سے ظہور پاتے ہیں،مگر منطق تلازمات کی تخلیق پر قادر ضرور ہے اور جب تلازمات منطق کے ذریعے وجود میں آتے ہیں تو ادب میں ایک ایسا رنگ پیدا ہوجاتا ہے جسے تفنن سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، یعنی زبان کا استعمال زبان کی خاطر۔ علمائے بیان و بدیع نے صنعتوں کو سائنسی تجربوں یا منطقی استقرا اور استخراج کے ذریعے معلوم نہیں کیا تھا، ان کا منبع علم ادب میں ان صنعتوں کا استعمال تھا۔ انہوں نے صرف ان صنعتوں کی ترتیب اور تنظیم کا کام سرانجام دیا،لیکن جب کوئی شخص ان صنعتوں کو شعوری طور پر استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے تو گویا وہ خود اپنے آپ سے زور آزما ہے۔اس کے سامنے کوئی حریف نہیں ہے۔اس کے سامنے کوئی مقصد بھی نہیں ہے۔وہ سرف برسبیل تفنن اور اپنی قوتوں کے امتحان کے لئے ایک بے مصرف عمل میں مصروف رہتا ہے۔یہ عمل بہرحال اس لحاظ سے بامعنی ہوجاتا ہے کہ وہ ادیب کے احساس کمتری پر دلالت کرتا ہے اور اس کی خامی بھی یہی ہے کہ وہ احساس کمتری جو نتیجہ تھا مصاف زندگی میں شکست کا، اظہار کے لئے کوئی ایسی صورت اختیار کرنے کی بجائے جس سے احساس کا نفسیاتی حل ممکن ہوسکتا، مزید الجھنوں کا باعث بنتا ہے۔ایک بے وجہ تفاخر اور حماقت کی حمایت میں وہ اپنا سارا زور صرف کرڈالتا ہے۔

البتہ تفنن کا ایک تعلیمی پہلو ضرور ہے جس کی مثبت مثال ناسخ اور ذوق کے ہاں ملتی ہے اور منفی انشاء کی بعض اختراعات میں، چنانچہ اسلوب کی ان صورتوں سے اکثر مغالطہ کا خدشہ رہتا ہے، جن کی تہہ میں ادبی اظہار کی بجائے کوئی اور مخفی عامل کارفرما ہوتا ہے، مثال کے طور پر ''باغ و بہار'' اور ''فسانہ عجائب'' کا مقابلہ کر لیجئے۔''باغ و بہار'' کے مصنف نے قصہ کہیں سے اخذ کیا تھا۔اس کے سامنے ایک شعوری مقصد تھا۔ایک ایسی درسی کتاب کی تصنیف جو انگریزوں کو اردو زبان سکھا سکے، لیکن ہوسکتا ہے کہ قصہ کا انتخاب ہی میر امن کی کسی بنیادی الجھن کا حل ہو، مثلاً سیلانی فقیروں سے اپنی ذات کا انطباق یا ملک ملک کی سیر میں اپنے ماحول سے فرار کی خواہش کی آسودگی یا قصے کے انجام میں جہاں سب فقیر اپنی الجھنوں کا حل پالیتے ہیں، وہاں شیخ چلی کے منصوبوں کی طرح اپنی مشکلات کے حل کی تلاش وغیرہ۔

بہرحال یہ سب محرکات ایک حد تک تخریبی نہیں ہیں۔اس کتاب کی تصنیف عملاً بھی میر امن کے لئے ایک آسودگی کا ذریعہ اپنے اندر رکھتی تھی۔اس کے مقابلے میں ''فسانۂ عجائب'' کا مصنف ایک حریفانہ جذبے سے میدان میں اترا ہے اس کا نصب العین منفی ہے۔اپنی طرف سے کچھ پیش کرنے کی بجائے اس کے پیش نظر میر امن کے جادو کا توڑ پیش کرنا ہے، چنانچہ اس نے منطقی اور شعوری طور پر ان تمام ذرائع کو استعمال کرنے کی کوشش کی جنہیں علما نے اس کام کے لئے موزوں قرار دیا تھا۔نتیجہ یہ ہے کہ وہ کوئی ایسا اسلوب وضع نہیں کرسکا جو اس کی بنیادی تحریک کے اظہار کے لئے اس کی اپنی ذات تک کارآمد ہوتا یا قاری کے لئے اس اظہار کا احساس ممکن بنا سکتا۔

اس کی دوسری مثال ابوالکلام آزاد سے پیش کی جاسکتی ہے۔ ایک پرجوش شخصیت ہے جس نے دنیا میں قدم رکھا تو ذہنی صلاحیتوں کی فطری فراوانی نے اسے عروسِ کامرانی سے ہمکنار کردیا۔چھوٹی سی عمر میں علم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد یہ تصور اس کی طبیعت میں جگہ پکڑ گیا کہ ہر میدان میں اس کے لئے ایک انفرادیت مقدر ہوچکی ہے۔یہ احساس چونکہ حالات کے ہاتھوں مجروح نہیں ہوا تھا، اس لئے طبیعت کی کمزوری نہ بنا۔''تذکرہ'' میں اس احساس کی نوعیت کچھ اس منہ زور گھوڑے کی سی ہے جو ابھی باقاعدہ تربیت سے محروم تھا، لیکن جوہر ذاتی سے عاری نہ تھا، چنانچہ اس نے اپنی منہ زوریوں کا خوب خوب اظہار کیا اور جب اس اظہار سے اپنے پاؤں میں بیڑیاں اور ہاتھ میں ہتھکڑیاں دیکھیں تو اپنے آپ کو پیغمبروں کی صف میں لا کھڑا کیا۔یہ احساس برتری جب عام قویٰ کے اضمحلال کے ساتھ ذرا سرد ہوا تو ''غبارِ خاطر'' میں ظاہر ہوا۔''غبار خاطر'' کے عنوان ہی میں کچھ شکست آمادگی کا انداز مضمر ہے، لیکن پھر طبعی ذات پرستی یا خودمستی نے اپنا رنگ جما ہی لیا۔اس رنگ میں بھی ابتدائی سرمستی کا بہک جانے والا انداز موجود ہے، لیکن جارحانہ پن کچھ نرم پڑ گیا ہے۔اس کے بعد علامہ مشرقی کے ''تذکرے'' پر نظر ڈالئے، نام کو تو خیر چھوڑیئے کہ اس سے بھی حریفانہ للکار کا انداز ٹپکتا ہے، لیکن اندازِ بیان سے بھی تو اس کی تصدیق ہوتی ہے۔خطیبانہ زورِ بیان کو پوری کوشش کے ساتھ استعمال کیا ہے اور بات پھر بھی نہیں بنی۔

تفنن سے بعض اوقات بات نبھ جاتی ہے کہ تفنن بھی ایک طرح سے طبعی الجھنوں کا حل پیش کرتا ہے۔ تفنن فاضل قوت کے اخراج کا ذریعہ ہے اور فاضل قوت کا اخراج شخصیت کو اعتدال پر لے ہی آتا ہے۔

تفنن کے سلسلے میں ایک مثال تو ''رانی کیتکی'' کی ہے۔ انشا نے التزام یہ رکھا تھا کہ عربی فارسی کے الفاظ اس کی تحریر میں دخل نہیں پائیں گے، لیکن سرور کی طرح یہ تحریک کسی منفی ردِعمل پر مشتمل نہیں تھی اور ایک دلچسپ اسلوب اپنی نشانی کے طور پر چھوڑ گئی۔ احساس برتری کے ابتدائی ناپختہ مراحل ایک قسم کی شوریدہ سری یا شورش پسندی کے حامل ہوتے ہیں جس کا انداز احساسِ کمتری کی جھنجھلاہٹ اور جھلاہٹ سے ملتا ہے، مگر کسی قدر آسودگی کے بعد اس میں ایک خود اعتمادی نمو پانے لگتی ہے۔

یہ خود اعتمادی ایک خوشگوار انداز طبع کو جنم دیتی ہے، اس کی مثال غالب کے خطوط میں ملتی ہے۔ مشکل پسندی نے کبھی ''رنگ بہار ایجادی بیدل'' کو اپنے لئے نشانِ راہ اور طغریٰ امتیاز قرار دیا تھا، لیکن بعد میں نہ صرف شعر میں ایک سہل ممتنع کا رنگ آتا چلا گیا بلکہ فارسی نثر کی دقت آزما مشقت سے پنجہ آزمائی کے بعد جب اس کی داد پچاس روپلی کی صورت میں پائی۔ سرکار دربار میں نام ونمود کی جو خواہش تھی، وہ کسی قدر تسکین سے بہرہ ور ہوئی، نوابی ٹھاٹ اور لاکھوں روپے کی جاگیر کی ہوس جب واضح طور پر خام خیالی نظر آنے لگی تو طبیعت نے کچھ سمجھوتے کی راہیں تلاش کرنی چاہیں اور روح القدس سے داد پانے کی بجائے اس نے اپنے ہم جنسوں سے داد قبول کر لینے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ اس آمادگی نے اردو نثر میں ایک ایسے اسلوب کی داغ بیل ڈالی جو آج بھی قابل تقلید ہے۔

اس اسلوب میں وہ چیز جسے نقادوں نے مزاح کی ہلکی چاشنی قرار دیا ہے، دراصل خود اعتمادی سے پیدا ہونے والی خوش طبعی ہے جو جلی کٹی، طعن تشنیع، طنز، رونے بسورنے کی بجائے ایک دلچسپ اور قابل قبول اندازِ تفاخر کے ساتھ اہل محفل سے داد طلب کرتی ہے۔ اس اعتماد اور خوشگوار احساس برتری کی ایک مثال ''اعمالنامہ'' میں بھی ملتی ہے۔ مصنف کی طبیعت میں کامرانی کا ایک احساس یوں معلوم ہوتا ہے گویا وہ زمانے کے پست وبلند کو ایک نسبتاً اونچے مقام سے دیکھتا ہوا کمال آسانی سے بغیر کسی کاوش وکاہش کے گزرتا چلا جاتا ہے اور یہ مثال ایک ایسے مصنف کی ہے جسے ادیب ہونے کا دعویٰ بھی نہیں ہے۔

اس مثال سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اسلوب کی تراوش کسی ادبی مسلک کی تقلید وتتبع کی بجائے براہ راست شخصیت کے انداز سے تشکیل پاتی ہے اور ہر اچھے اسلوب کے پس پشت شخصیت یا ان کا ایک توانا، مثبت اور پر اعتماد احساس کارفرما ہوتا ہے۔ جہاں یہ اعتماد مجروح ہوا، وہاں اسلوب بھی مجروح ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

ایک ڈانواڈول یا اکھڑی اکھڑی شخصیت کسی طور پر بھی ایک مستقل اور منفرد رنگ طبیعت اختیار نہیں کر سکتی۔ تقلید میں اسی باعث الجھن پیدا ہوتی ہے جب تقلید کرنے والا ایک توانا شخصیت کا حامل ہو تو آلی کی طرح تقلید میں بھی شانِ اجتہاد کو برقرار رکھتا ہے اور تقلید میں بھی ایک طرح نو کا خالق قرار پاتا ہے۔ اس عہد میں میر کا تتبع کچھ جنوں کی صورت اختیار کرتا جاتا ہے، لیکن مختار صدیقی نے اس تتبع میں بھی نئی بات پیدا کی ہے۔ جب دو شخص مل کر گا رہے ہوں تو آواز اور سر کی ہم آہنگی کے باوصف دونوں آوازیں ایک دوسرے سے تمیز کی جا سکتی ہیں اور یہ امتیاز آواز میں ایک گمبھیر حسن پیدا کرتا ہے جو مجرد تقلید میں ظاہر نہیں ہو سکتا۔ مختار صدیقی کی اپنی آواز میر کے آہنگ میں صاف سنائی دیتی ہے۔

تقلید وتتبع میں خلوص اہم چیز ہے۔ اس خلوص کا مرجع دوہرا ہوتا ہے ایک طرف تو یہ اس چیز سے دلی اور جذباتی لگاؤ کا تقاضا کرتا ہے جس کی تقلید مقصود ہو، لیکن ساتھ ہی خود اپنی ذات سے خلوص کے بغیر کام نہیں چلتا۔ حالی نے ایک واضح نصب العین کو اپنے سامنے رکھا اور اس نصب العین سے اس کے خلوص کو جھٹلانا ممکن نہیں۔ اس خلوص کو ''مسدس'' میں ایک جذباتی رچاؤ حاصل ہو گیا تھا، لیکن اس کی خالصتاً ادبی اصلاحی شاعری میں یہ خلوص نمونہ پا سکا۔

سہل اور سادہ اسلوب حالی کے لئے کوئی اجنبی چیز نہ تھی۔ اس کی غزل اس امر کی شاہد ہے، لیکن یہ سادگی حالی کی مثنویات میں اس جذباتی ردعمل کو اپنے ساتھ نہ لا سکی جو اس کی طبیعت کا اقتضا تھا۔ یہاں حالی اپنے مقصد، اپنی ذات سے باہر ایک خارجی وجود سے اخلاص کا مظاہرہ تو کرتا رہا، لیکن خود اپنی ذات اپنی افتادِ طبع سے اسے ہم آہنگ نہ کر سکا۔ خلوص کا ایک زاویہ تو درست تھا، لیکن دوسرا زاویہ کچھ زیادہ پھیل

چلا تھا، اس لئے بالآخر ایک متوازن اور باہم مربوط صورت کی تخلیق ممکن نہ ہوسکی، حالانکہ حالؔی کی ادبی صلاحیتوں سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

زبان اور لفظ، مجاز اور شخصیت کے تال میل سے اسلوب کا ڈھانچہ اخذ کرنے کی اس کوشش میں ایک بات رہی جاتی ہے، وہ یہ کہ آخر صاحب طرز سے ہماری کیا مراد ہوتی ہے۔ اسلوب کو جن معنوں میں یہاں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس سے تو کچھ یوں نظر آتا ہے کہ وہ ایک غیر جانبدار اصطلاح ہے۔ ایک تحریر کے اسلوب کا ذکر کرتے وقت ہم نہ اس کی خوبی کی طرف اشارہ کرتے ہیں نہ اس کی خامی پیش نظر ہوتی ہے اور نہ یہ کہ وہ تحریر یا مصنف کو کوئی امتیازی نشان بخشتی ہے یا نہیں۔ مثلاً ولؔی کو تو شاید صاحب طرز کہہ بھی لیا جائے۔ میر امنؔ اور غالبؔ کے متعلق بھی یہ بات سننے میں آئی ہے، لیکن حالؔی کو تو آج تک کسی نے صاحب طرز قرار نہیں دیا اور ''اعمالنامہ'' تو کسی شمار و قطار ہی میں نہیں۔ صاحبانِ ''تذکرہ'' میں سے آزادؔ تو صاحب طرز ہے، لیکن علامہ مشرقی کو آج تک کسی نے صاحب طرز قرار نہیں دیا۔ اردو زبان میں اسلوب کی بحث ہوگی تو محمد حسین آزاد، قاضی عبدالغفار، فلک پیما، خواجہ حسن نظامی، رشید احمد صدیقی وغیرہ قسم کے لوگوں کا ذکر آئے گا۔ نظم کے میدان میں فانیؔ کا نام لے لیجئے، یا ظفر علی خاں کی بات کیجئے تو گویا عام تصور اسلوب کا یہ ہوا کہ اسلوب تحریر کا ایک زیور ہے۔ تحریر اس زیور کے بغیر بھی وجود میں آتی ہے۔ اسی باعث اکثر تصنع کو تو اسلوب سے خلط ملط کر لیا جاتا ہے، لیکن وہ فطری نامحسوس جوہر، توانائی اور دلچسپی نظر انداز ہو جاتی ہے جو ابلاغ و اظہار کی تمام شرائط کو پورا کرتی ہے۔

یہاں ہمیں پھر اپنے ابتدائی مباحث کی طرف لوٹنا پڑے گا۔ جہاں زبان اور لفظ کی اس حیثیت کا ذکر کیا گیا تھا کہ وہ زندہ اور فعال ہیں، مردہ اور مجبور نہیں ہیں، لیکن زبان اور لفظ کی یہ حیثیت متعین ہوتی ہے تو صرف ان مفاہیم کے اعتبار سے جنہیں وہ پیش کرتے ہیں، مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ پشتو میں ایک کرختگی ہے تو کیا پشتو مستقلاً نازک اور سبک مضامین کے اظہار کے لئے ناموزوں قرار پاتی ہے۔ لفظ اور زبان کی حیثیت پر زور دینے سے مراد یہ ہے کہ ان میں خود یہ صلاحیت موجود ہوتی ہے کہ وہ تاثر کا رُخ موڑ سکیں۔

ادب میں صرف منطقی دلیل سے کام نہیں چلتا بلکہ اس منطقی دلیل پر لفظ اور زبان مسلسل اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی حیثیت اس کل کے کھلونے کی سی نہیں ہے کہ جس میں کوک بھر دینے اور رُخ متعین کر دینے کے بعد چھوڑ دیں تو وہ ایک سیدھ چلا جائے گا۔ ان کی حیثیت اس گھوڑے کی سی ہے جو چاہے تو سیدھا چلا جائے اور چاہے تو اپنا رُخ پھیر دے، بلکہ اس منہ زور گھوڑے کی سی ہے جو باگ کے اشارہ کی پروا نہیں کرتا اور اکثر یوں ہوتا ہے کہ جب یہ گھوڑا کلیلیں کرنے پر آجاتا ہے تو سوار اپنی منزل کو بھول جاتا ہے اور گھوڑے کو اپنی مرضی پر چھوڑ دیتا ہے، کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ ناظرین گھوڑے کی اچھل کود سے خوش ہوتے ہیں۔ خطابت میں زبان کا انداز کچھ اسی قسم کا ہوتا ہے۔ آپ ایک بات کو سو طرح سے دہراتے ہیں اور سننے والے آپ کی قادرالکلامی کی داد دیتے ہیں۔

یا پھر یوں ہوتا ہے کہ کسی نے ایک بات کہی اور لوگوں نے داد دی تو اس نے یہ فرض کر لیا کہ میرے ہاتھ ایک ایسا جادو کا اسم آگیا ہے کہ اسے پھونکنے سے جو چاہو وہی ہو جائے، جو مانگو وہی مل جائے، ملا رموزی نے ایک دفعہ ''گلابی اردو'' لکھی اور پھر عمر بھر اسی کا ہو کر رہ گیا۔ نتیجہ سامنے ہے۔ اسی قسم کی ایک خامی یہ بھی ہے کہ مروجہ جذباتی اقدار کا سہارا ڈھونڈا جائے، عبرت کا تاثر پیدا کرنے کے لئے اخلاقیات یا مذہب کا سہارا اکثر تلاش کیا جاتا ہے۔ حسن نظامی کے ہاں اس کی مثال مل جاتی ہے۔ مغرب کے نقاد تو اس ضمن میں یہ بات کہنے کے لئے تیار ہو گئے ہیں کہ انجیل کے انگریزی ترجمے کی ادبی اقدار اور اس کی اثر انگیزی اسی جذباتی تاثر سے منسلک ہے۔ گویا کوئی جذباتی تاثر پیدا نہیں کیا جاتا، بلکہ ایک ایسے جذباتی تاثر سے جو بافعل فضا میں جاری و ساری ہے استمداد کی جاتی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص حماسہ سرائی کے اصول و ضوابط کے حوالے سے مرثیوں کا جائزہ لے اور یہ کہے کہ شاہنامہ انیسؔ کے مراثی سے ایک بہتر ادبی تصنیف ہے تو ہم میں سے اکثر اس ٹوہ میں لگ جائیں کہ کسی طرح ممکن ہو تو اس دلیل کا جواب تلاش کیا جائے۔ مثلاً یہی کہ یہ بات کہنے والا اسلام کے خلاف تعصب کا شکار ہے اور فردوسؔی کا شاہنامہ چوں کہ عرب کے خلاف عجمی بغاوت کا سنگ بنیاد ہے، اس لئے اس کی حمایت کرتا ہے۔

اب تک بحث جس نہج پر چلتی رہی ہے اسے سمیٹئے تو بات کچھ یوں بنتی ہے کہ اسلوب تحریر کی اس صفت کا نام ہے جو ابلاغ محض کی بجائے اظہار سے مختص ہے۔ ابلاغ حقائق کی پیش کش کا نام ہے۔ اظہار اس کے مقابلے میں حقائق کے شخصی، ذاتی یا انفرادی تاثر کو پیش کرنے کا نام ہے۔ ابلاغ موضوع کی منطق تک محدود رہتا ہے اور اظہار پوری شخصیت کو احاطہ کرتا ہے بہر حال اظہار چونکہ ابلاغ کو بھی اپنے دامن میں لئے ہوتا ہے اس لئے اسلوب ادب میں ان محرکات یا عوامل کی نسبت سے متعین ہوتا ہے جن کا تعلق شخصیت کے داخلی پہلو کی بہ نسبت معاشرتی پہلو سے ہے۔

شخصیت جب دوسری شخصیتوں کے سامنے آتی ہے تو اخفا، تفوق، تفنن وغیرہ کا لبادہ اوڑھ کر اپنی انفرادیت کو مقبول اور محمود بنانے کی کوشش کرتی ہے۔ بعض جگہ ان کے برعکس جب منفی محرکات کارفرما ہوتے ہیں تو اسلوب اپنی ذات کی حد تک کافی محسوس ہوتا ہے، لیکن اپنے ہم جنسوں میں مناسب ردعمل پیدا نہیں کر سکتا۔ داخلی محرک کی خامی سے قطع نظر زبان اپنی زندہ نامیاتی حیثیت کے پیش نظر اسلوب کی تشکیل میں ایک اہم قوت کا کام دیتی ہے، لیکن اس طرح اسلوب کا جو تصور قائم ہوتا ہے اس کی نوعیت عمومی ہے اور اس کی بہترین صورت وہ ہے جسے پرانے استاد ''سہل ممتنع'' کا نام دیتے ہیں۔

یہاں اسلوب اور موضوع میں ایک مکمل ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے، لیکن صاحب طرز اور اسلوب کا مروجہ تصور، اسلوب کی عمومی حیثیت کی بہ نسبت اس کی انفرادی حیثیت کو زیادہ پہچانتا ہے۔ اس انفرادی حیثیت کا تعین اوپری اور سطحی طور پر تو موضوع کے انتخاب میں ایک جانبداری سے ہو سکتا ہے۔ یہ جانبداری ذاتی نفسیاتی الجھنوں کی مرہون منت ہوتی ہے اور خارجی طور پر ذریعہ اظہار میں مخصوص پسندیدہ پیرایوں کے استعمال پر منحصر ہوتی ہے۔ مغربی نقاد اس کے لئے ایڈیوسن کریسی (Idiosyncracy) کا لفظ استعمال کرتے ہیں جو لہجے اور الفاظ کی تکرار کا روپ دھار کر ایک خاص حد کے بعد بوجھل اور مشینی سی ہو کر رہ جاتی ہے۔

ایڈیوسن کریسی کی تخلیقی اور تقلیدی حیثیت کا معیار صرف یہ ہے کہ وہ کہاں تک صحیح جمالیاتی اقدار کا ساتھ دیتی ہے اور ان کا پاس رکھتی ہے، چنانچہ ہر صاحب طرز مصنف کے ہاں تخلیقی جمالیات کا واضح اور بھرپور تاثر نظر آتا ہے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی بات کے انداز سے خود محظوظ اور متلذذ ہوا ہے۔ اس کی تصویر ذہن میں کچھ یوں ابھرتی ہے کہ وہ ہر مصرع اور ہر فقرہ پر ٹھہر کر خود اپنے آپ کو داد دیتا ہے کہ واہ کیا بات کہی ہے۔ اسلوب اس مقام پر پہنچ کر پکار پکار کر توجہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے کہیں اس میں طنطنہ، وقار اور مرعوب کن انداز جھلکتا ہے، کہیں اس میں ایک دلفریب لطافت اور سحر کارانہ رمزیت ہوتی ہے، کہیں اس میں کھلا کھلا دلچسپ صاف گوئی کا نکھار ابھر آتا ہے۔ جمالیاتی قدر کا یہ روپ زبان اور الفاظ کے خلاقانہ استعمال میں مضمر ہے۔ مڈلٹن مرے اسے خطیبانہ رنگ سے اس طرح ممیّز کرتا ہے کہ تحقیقی صلاحیت الفاظ کو مفہوم کے سانچے میں ڈھال لیتی ہے۔ مفہوم کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالنے پر اکتفا نہیں کرتی یعنی اسلوب زبان اور الفاظ کی خودسری کو رام کر لینے کا نام ہے۔ اس طرح الفاظ اور زبان کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ صرف ان کا صحیح مصرف متعین ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ جس گھوڑے پر سوار ہوں اسے یہ اجازت نہیں دیتے کہ وہ اپنی تیز رفتاری، قوت اور سبک روی کا مظاہرہ کرنے میں آپ کو جہاں چاہے ساتھ لے جائے۔ اگرچہ تیز لہریں بھی کشتی میں روانی پیدا کر سکتی ہیں، لیکن اسے ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا ناخدا کا شیوہ نہیں۔ ❁❁

اسالیب طرز ادا انداز بیان

عرصہ سے ہمارے ادب میں کچھ ایسے مترادف الفاظ رائج ہیں جن کی ہیئت ترکیبی پر کبھی غور نہیں کیا گیا۔ ہر لفظ اپنی جگہ پر ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے، یعنی طرز ادا، اسلوب اور تنوع معانی کی ہر عہد میں قدر کی گئی ہے۔ ایک دور میں زبان پر زور دیا گیا، اس دور میں اسلوب زبان کے معنوں میں استعمال کیا جانے لگا۔ جب بیت الحکمت علی گڑھ کے پیر حرم کی رہنمائی سے ملک میں احیائی تحریک پھیلی تو سادگی اور پرکاری پر زور دیا گیا اور اس عہد میں اسلوب افتاد طبع کے معنوں میں مستعمل ہوا۔ تحریر میں چونکہ لہجہ کی اعانت حاصل نہیں ہوتی اس لئے تاثر کے لئے اسالیب سے کام لیا جاتا ہے۔

(تجزیہ و تنقید، ناظر کاکوروی، سن ۱۹۵۸ء، ص ۸۷)

ڈاکٹر سلام سندیلوی

انکاریہ جملے میں امدادی فعل

''تجربہ و تجزیہ'' میرے آٹھ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ میں اس موقع پر اپنی زبان کی ایک خصوصیت کو واضح کرنا چاہتا ہوں۔ عام طور سے یوں لکھا جاتا ہے ''میں نہیں کہتا'' مگر میں اس کو یوں لکھتا ہوں ''میں نہیں کہتا ہوں'' لوگوں کا اعتراض ہے کہ جب اس جملے میں ''نہیں'' آ گیا تو آخر میں ''ہوں'' کیوں آیا یعنی ''نہیں'' اور ہوں کا اجتماع غلط ہے۔ میں اسی بات کو یہاں واضح کر رہا ہوں۔

ساخت کے اعتبار سے فعل کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک خاص فعل اور دوسرا امدادی فعل۔ اردو کا ایک جملہ لیجئے ''میں جاتا ہوں'' اس جملے میں ''جاتا'' خاص فعل ہے اور ''ہوں'' امدادی فعل ہے۔ یہ جملہ اقراریہ ہے۔ اب اگر ہم اس جملے کو انکاریہ بنائیں گے تو لکھیں گے ''میں نہیں جاتا ہوں'' یعنی ''نہیں'' کا لفظ بڑھا دیا۔ جس طرح انگریزی میں Not بڑھا دیں میری بات مندرجہ ذیل چارٹ سے اور واضح ہو جائے گی۔

	اقراریہ جملہ	انکاریہ جملہ
فعل حال	میں کہتا ہوں	میں نہیں کہتا ہوں
	ہم کہتے ہیں	ہم نہیں کہتے ہیں
	تو کہتا ہے	تو نہیں کہتا ہے
	تم کہتے ہو	تم نہیں کہتے ہو
	وہ کہتا ہے	وہ نہیں کہتا ہے
	وہ سب کہتے ہیں	وہ سب نہیں کہتے ہیں
فعل ماضی	اقراریہ جملہ	انکاریہ جملہ
	میں کہتا تھا	میں نہیں کہتا تھا
	ہم کہتے تھے	ہم نہیں کہتے تھے
	تو کہتا تھا	تو نہیں کہتا تھا
	تم کہتے تھے	تم نہیں کہتے تھے
	وہ کہتا تھا	وہ نہیں کہتا تھا
	وہ سب کہتے تھے	وہ سب نہیں کہتے تھے
فعل مستقبل	اقراریہ جملہ	انکاریہ جملہ
	میں کہوں گا	میں نہیں کہوں گا
	ہم کہیں گے	ہم نہیں کہیں گے
	تو کہے گا	تو نہیں کہے گا
	تم کہو گے	تم نہیں کہو گے
	وہ کہے گا	وہ نہیں کہے گا
	وہ سب کہیں گے	وہ سب نہیں کہیں گے

فعل ماضی اور فعل مستقبل میں انکاریہ جملے میں امدادی فعل ضرور استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے ''میں کہتا تھا'' اقراریہ فعل ماضی ہے ''میں نہیں کہا تھا'' انکاریہ فعل ماضی ہو گیا۔ اسی طرح ''میں کہوں گا'' اقراریہ فعل مستقبل ہے ''میں نہیں کہوں گا'' انکاریہ فعل مستقبل ہو گیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فعل حال ہی کے انکاریہ جملوں میں کیوں امدادی فعل غائب کر دیا جاتا ہے؟ اسی طرح میری نظر میں ''میں نہیں جا سکتا ہوں''، ''تم نہیں جا سکتے ہو'' اور ''وہ نہیں جا سکتا ہے'' جملے درست ہیں۔

اس سلسلے میں عالی جناب پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب سے جون ۱۹۷۰ء اور جون ۱۹۷۱ء کی موسم گرما کی تعطیل میں دو بار مجھ سے گفتگو ہوئی۔ انہوں نے فرمایا کہ ''جس طرح آپ لکھتے ہیں'' درست یہی ہے، مگر لوگ محض اختصار کے لئے زمانۂ حال کے انکاریہ جملے سے امدادی فعل کو غائب کر دیتے ہیں۔ بہر حال میں اس قسم کے اختصار کا قائل نہیں ہوں جس سے جملہ نامکمل رہے، اس لئے میں مستقل طور سے پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کی اجازت اور مشورے سے زمانہ حال کے انکاریہ جملے کے آخر میں امدادی فعل استعمال کرتا ہوں۔ کچھ لوگ کہیں گے کہ اس سے قبل کے ادیبوں نے میری طرح نہیں لکھا ہے۔ میں اس سلسلے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قدما کی تقلید یا دور حاضر کے ادیبوں کی پیروی کو میں ضروری نہیں سمجھتا ہوں بلکہ میں ہمیشہ اپنے ذوق کی روشنی میں ہر بات اور ہر خیال کو پیش کرتا ہوں۔ (تجربہ و تجزیہ مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۷۴ء کے پیش لفظ، ص ۹ تا ص ۱۲ سے اخذ و تلخیص)

❁❁❁

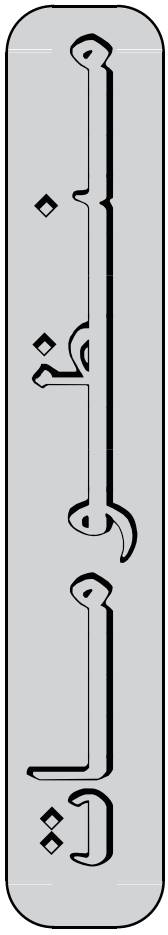

حمد و نعت	ابونصر فاروق صارمؔ عظیم آبادی	۸۶
رهائی/ ریگ صحرا	سلیم انصاری	۸۷
غزلیں	فراقؔ جلالپوری / راشدؔ جمال فاروقی	۸۸
غزلیں	احسان شامؔ	۸۹
غزلیں	بدرؔ محمدی	۹۰
غزلیں	مشتاق احزنؔ	۹۱
غزلیں	کلیمؔ حاذق	۹۲
غزلیں	یاسینؔ انصاری / نعمت اللہ رضاؔ	۹۳
غزلیں	آصفؔ احمد	۹۴
غزلیں	جی ڈی احمرؔ / مظہرؔ زاہدی	۹۵
غزلیں	احساسؔ گیاوی	۹۶
غزلیں	سرفرازاشہرؔ	۹۷

ابونصر فاروق صارمؔ عظیم آبادی

Khajur Banna, Pathar ki Masjid, Patna - 800008
(Mob. 7519848411)

حمد

پھول کو خوشبو ، چمن کو تازگی دیتا ہے کون
اس نئے سورج سے پوچھو ، روشنی دیتا ہے کون

زندگی کی مستیوں میں غوطہ زن لوگو ،کہو
آرزوؤں سے بھری یہ زندگی دیتا ہے کون

یاس کے سیلاب میں جب ڈوبنے لگتی ہے سانس
آس کے ساحل سے پیغامِ خوشی دیتا ہے کون

جب اندھیروں میں بھٹک جاتا ہے ذہن نارسا
فکر کو تب آگہی کی روشنی دیتا ہے کون

زندگی کو جس سے ملتا ہے زمانے میں وقار
قلب انساں کو وہ احساس خودی دیتا ہے کون

اشرف المخلوق بن جاتا ہے جس سے آدمی
ایسی حکمت اور شعور و آگہی دیتا ہے کون

کہئے صارمؔ آپ کے افکار و احساسات کو
زندگی ، تابندگی اور دلکشی ، دیتا ہے کون

❁❁❁

نعت

جہاں کو بزم محمدی سے شعور اور آگہی ملی ہے
تباہیوں کے بھنور سے نکلے ہیں ، کامراں زندگی ملی ہے

تمام دنیا میں ظلمتوں کے سیاہ سایے بھٹک رہے تھے
وہ آئے روشن چراغ بن کر تو اُن سے ہی روشنی ملی ہے

مقامِ انسانیت بتایا ، شعور کو اک وقار بخشا
زمانے بھر کو اُنہی کے دَر سے خدا ملا ہے ، خودی ملی ہے

جہاں جہاں بھی جہاں میں پہنچے تمام رنج و الم ہی پایا
مگر وہ دربار مصطفیٰ ہے جہاں سے سب کو خوشی ملی ہے

زمیں سے اٹھے ، فلک پہ پہنچے وہ انبیا کے امام بن کر
انہی کو اس دور میں امامت ، نبوت اور سروری ملی ہے

حیاتِ انساں کے فلسفے سب تمام بوسیدہ ہوچکے تھے
نظامِ رحمت سے اُن کے صارمؔ حیات کو تازگی ملی ہے

❁❁❁

اخلاقی اشعار

دنیا میں کہنے کو سبھی کہلاتے ہیں بھلے — پر ہے وہی بھلا جو کسی کا بھلا کرے (امینؔ)
اس کنج قناعت سے قدم رکھیو نہ باہر — جیوں نقش نگیں چاہے ہے گر نام کو اپنے (سلیمانؔ)
دشمن کے دل کو بھی نہ کریں پایمال ہم — آنکھوں پہ رکھ لیں خار اگر زیر پا ملے (حشرؔ)
پہچان لے جب اپنی حقیقت کو آدمی — لائے زباں پہ تب کوئی کلمہ غرور کا (نامعلوم)

سلیم انصاری

Anand Nagar, 3-HIG, Adhartal Jabalpur - 482004 (M.P.)

رہائی

میرے آزر مجھے دریافت بھی کر
قید پتھر میں ہوں جانے کب سے
اپنی پہچان کی امید میں روشن ہوں
بدن بھر، لیکن
میرے اطراف سیاہی کا گھنا جنگل ہے
منتظر ہوں میں ترا
اپنے خدوخال کے ساتھ
میرے آزر، مرے محسن، مرے دوست
یہ مرے جسم سے لپٹے ہیں
جو کچھ غیر ضروری پتھر
وہ ہٹا کر، اک دن
مجھ کو اس قید مسلسل کے عذابوں سے نکال
اور عطا کر مجھے، میرے خدوخال
ہو سکے تو مرے اظہار کی امید کو روشن کر دے
میرے آزر، مرے محسن، مرے دوست
منتظر ہوں میں ترے دست ہنر کا کب سے

❁❁❁

ریگِ صحرا

یہ کاغذ پر جو تم نے خوبصورت گھر بنایا ہے
وہ میرے ذہن میں تعمیر ہوتے گھر سے کتنا مختلف ہے
سبھی کمروں میں فرشِ مرمریں اور قیمتی سامانِ آرائش
تمہاری عیش کوشی کی علامت ہیں
یہ کاغذ پر جو تم نے خوبصورت گھر بنایا ہے
وہ ہر پہلو سے بہتر ہے، مگر اک گھر
جو میرے ذہن میں تعمیر کی منزل میں ہے اب تک
میں اس چھوٹے سے بیحد خوبصورت گھر میں
خود کو نئی نظموں کے تخلیقی عمل میں
بہت آسودگی محسوس کرتے دیکھتا ہوں
تمہیں کیا علم؟ تم تو اپنے ہی تجویز کردہ گھر میں
بے حس، بانجھ اور بوسیدہ جذبوں کی مدد سے
خوشی کے چند لمحوں کو پکڑ لینے کی
سعیٔ رائیگاں کرتے دکھائی دے رہے ہو
کہ سب آسائشیں اور سارا تعیش جمع کر کے
جھوٹے اسٹیٹس کے مایا جال میں الجھے ہوئے ہو
درونِ ذات گویا..... ریگ صحرا کی طرح بکھرے ہوئے ہو

❁❁❁

غزلیں

فراقؔ جلال پوری

Moh. Qazipura, P.o. Jalalpur,
Dist. Ambedkar Nagar - 224149 (Mob. 9758772746)

وہی بہار کا موسم ، وہی پکار کی دھوپ
بلا رہی ہے مجھے اُس کے انتظار کی دھوپ
یہ دل کا پھول تو سائے میں کھل نہیں سکتا
اسے تو چاہئے ہر دم کسی کے پیار کی دھوپ
یہ کون خوابوں میں آ آ کے مجھ سے ملتا ہے
تمام چہرے پہ مل کر گل انار کی دھوپ
ابھی نکلنا نہیں گھر سے رات کی رانی
رُتوں نے اوڑھی ہے شرمیلی ہرسنگار کی دھوپ
یہ کس نے دیکھ لیا مے فروش نظروں سے
لہو میں دوڑ گئی دور تک خمار کی دھوپ
کسی پہ اتنا بھروسہ بھی کرنا ٹھیک نہیں
کہ چاٹ جاتی ہے اکثر زمیں بہار کی دھوپ
مجھے فراقؔ جلاتی کبھی بجھاتی ہے
عجیب ہے یہ ''بسنتی ندی'' کے پار کی دھوپ

❁❁❁

راشدؔ جمال فاروقی

C-6, Thokan No. 8, Shaheen Bagh,
New Delhi - 110025 (Mob. 9456753096)

بہت دنوں کے بعد ذرا سرشار ہوئے
مرتے تھے ہم ، جینے کے آثار ہوئے
ایک غلط لمحے کے کہنے میں آکر
کیسے کیسے لوگ ذلیل و خوار ہوئے
دیواروں کو چھت پہنا کر اُترے تھے
چشم زدن میں آخر بے گھر بار ہوئے
حیرت ہے وہ زعم تمہارا ٹوٹ گیا
عبرت ہے آخر تم بھی لاچار ہوئے
بہتے دریا نے اک کروٹ لی اور بس
ریت گھروندے پل بھر میں مسمار ہوئے
رشتوں کے وہ گلشن راشدؔ کہاں گئے
گھر کے آنگن آخر کیوں بازار ہوئے

❁❁❁

مطالع زیبا

وہ زمانہ کیا ہوا جو مری گریہ میں اثر تھا	یہی چشم خوں فشاں تھی ، یہی دل ، یہی جگر تھا	(جوشؔ)
نالے ہی سدا بھر بھر دن عمر کے بھرتے ہیں	ہیں نزع میں ہم تجھ بن جیتے ہیں نہ مرتے ہیں	(دلؔ)
نہ ہو جس گل میں تیری بوٗ اُسے ہم خار کہتے ہیں	جہاں کو ہم سراسر جلوئے دلدار کہتے ہیں	(فریادؔ)
اس گھر میں تم رہو تو کوئی دوسرا نہ ہو	آنکھوں میں یوں سماؤ کہ سرمے کی جا نہ ہو	(حشرؔ آروی)

پروفیسر احسان شآم

3/331, Rahman Enclave, New Patliputra Colony, Patna - 800013
(Mob. 9334875071)

غزلیں

جھیل سی آنکھوں میں برسات لئے پھرتے ہیں
دل میں مدت سے کوئی بات لئے پھرتے ہیں
جن کو سننے کی کبھی آپ کو فرصت نہ ملی
لب پہ ہم اپنے وہ نغمات لئے پھرتے ہیں
جانے کس بات پہ وہ روٹھ گیا ہے ہم سے
دل پہ اک بوجھ سا دن رات لئے پھرتے ہیں
روتی آنکھوں کو بھی ہم اپنی ہنسا لیتے ہیں
لوگ کیوں شکوۂ حالات لئے پھرتے ہیں
شہر کی بھیڑ میں اک بھٹکے مسافر کی طرح
دل میں کچلے ہوئے جذبات لئے پھرتے ہیں
بھوک ، بیکاری ، اُداسی سے پگھلتے چہرے
روز سڑکوں پہ سوالات لئے پھرتے ہیں
وہ ہمیں بھول گیا ہوگا ، مگر آج بھی شآم
اس کی ہم یادوں کی بارات لئے پھرتے ہیں

❁❁❁

اپنے ہونٹوں پہ ہنسی ، روح میں غم رکھتے ہیں
کیسا جینے کا ہنر دیکھئے ، ہم رکھتے ہیں
آپ ہاتھوں میں لئے پھرتے ہیں تلوار تو کیا
ہم نہیں ڈرتے کہ ہاتھوں میں قلم رکھتے ہیں
اس طرح رکھا ہے اس دل میں تری یادوں کو
جس طرح جوڑ کے مزدور رقم رکھتے ہیں
زندہ رہتے ہیں وہی وقت کی تاریخوں میں
سب سے اونچا جو شہادت کا علم رکھتے ہیں
آپ کس ملک کے ، کس دور کے باشندہ ہیں
دھوپ کے شہر میں سایے کا بھرم رکھتے ہیں
پھول بن جاتے ہیں ان کے لئے انگارے بھی
بے خطر جو رہ الفت میں قدم رکھتے ہیں
کب گزر جائیں گی خوشیوں کی بہاریں اے شآم
ہم یہی سوچ کے ان آنکھوں کو نم رکھتے ہیں

❁❁❁

ابیاتِ چند

ہستی کے خرابے جو نظر آتے عدم میں — ہرگز کوئی اِس خواب سے بیدار نہ ہوتا (فغاںؔ)
کون پوچھے ہے دل و جاں کو اگر یار نہ ہو — جنس بے قدر ہے جس جا کہ خریدار نہ ہو (عشقؔ)
اُمیدیں جو میہماں ہیں میرے جگر میں — لہو پیتیاں ہیں ، جگر کھاتیاں ہیں (سجادؔ)
اوروں کی عیب جوئی اپنا ہنر نہیں ہے — اپنے ہی عیب جو ہیں ، یہ ہے ہنر ہمارا (عابدلؔ)

بدرؔ محمدی

At. Chandpur Fatah, P.o. Bariarpur, Dist- Vaishali - 843102 (Mob. 9939311612)

غزلیں

فصل خیال وصل ، سر رہ گزر نہ کاٹ
میری طرف بھی آ ، رہِ شوقِ سفر نہ کاٹ
اس طرح مجھ کو دیکھ نظر سے نظر ملے
پلکیں جھپک کے بیچ سے تارِ نظر نہ کاٹ
کر چشم التفات کہ مرجاؤں ، آن میں
شمشیر بے رخی سے مجھے عمر بھر نہ کاٹ
دو دو سزائیں دے نہ مجھے ایک وقت میں
گر قید کر قفس میں تو پھر بال و پر نہ کاٹ
رہ جائے ایک سا ترا پیکر مہہ تمام
یہ روز روز اپنا بدن تو اگر نہ کاٹ
کیا کیا ہے اسلحہ وہ لئے اپنے ہاتھ میں
لیکن ہمارے پاس ہے کوئی ہنر ، نہ کاٹ
یہ زندگی طویل ہے تو خوش دلی سے جی
کرکے گمان بدرؔ اسے مختصر نہ کاٹ

❁❁❁

خوبروئی میں اُسے یوسف کنعاں کر دے
پھر مجھے شوقِ زلیخا سا پریشاں کر دے
بے رُخی اس کی مجھے یوں نہ پشیماں کر دے
جیسے آباد حویلی کوئی ویراں کر دے
درد کی نذر ہے دل ، پلکوں پہ آنسو رقصاں
میرے ہونٹوں پہ تبسم بھی نمایاں کر دے
جاں بلب ہے یہ مرا جسم کسی جاں کے بغیر
زندہ رہنے کے لئے اِس میں وہی جاں کر دے
بے وفائی کی مجھے اس سے توقع ہے مگر
مجھ سے وہ کر کے وفا دنیا کو حیراں کر دے
دید حاصل ہو انہیں موسم گل کی صورت
اے خدا میری نگاہوں کو گلستاں کر دے
دیکھنا میرا اسے ، ٹھہرے شعارِ موزوں
اپنی وہ شوخ اداؤں کو غزل خواں کر دے

❁❁❁

ابیاتِ زیبا

لازم تھی بے خودی ترے دلدار کے لئے — پردہ جو بیچ میں تھا ، وہ میرا شعور تھا (مبارکؔ)
اُس فتنۂ دوراں سے عالم میں پڑی ہلچل — جائے تو کہاں کوئی ، نکلے تو کہاں کوئی (نسیمؔ)
بے جوہروں کا دعویٰ توقیر ہے عبث — دنیا میں قدر پاتے ہیں اہل ہنر کہ ہم؟ (اثرؔ)
مصیبت کے زمانے میں کیا جب امتحاں ہم نے — تو نکلے دوست دشمن ، آشنا ناآشنا نکلے (حشرؔ)
ظاہر میں شب وصل ہو یا عمر غزل کی — جتنی ہی ڈھلی ، اتنی ہی نوخیز ہوئی ہے (نامعلوم)

مشتاق احزؔن
12/1A Blochmann Street, Kolkata - 700013 (Mob. 8083219186)

غزلیں

سچ ہے وہ اگر چاہے تو حالات بدل دے
وعدے کا مگر کیا ہے ، جو وہ بات بدل دے

اس رنگ بدلتی ہوئی دنیا میں ، کبھی سوچ
ہے کس کو خبر کون خیالات بدل دے

کتوں کی وفا داری تو مشہور ہے ، لیکن
انساں کا بھروسہ نہیں، کب ذات بدل دے

رکھتا تو ہے وہ نرم سا گوشہ ابھی دل میں
ہے فکر مجھے ، دل کے نہ جذبات بدل دے

اک جہد مسلسل سے گھروندا بنا لیکن
نقشہ مرے گھر کا نہ یہ برسات بدل دے

ہے چار سو چھایا ہوا پت جھڑ کا یہ موسم
ایسا نہ ہو باغات کے باغات بدل دے

ذہنوں میں ہے یکسوئی، سبھی سلجھے ہوئے ہیں
ڈر ہے کہ وہ کرکے نہ خرافات بدل دے

نمرود کا ، شداد کا ، چیلا ہے وہ شاید
ایسا نہ ہو وہ طرزِ مساوات بدل دے

ہر لمحہ ستاتی ہے یہی سوچ کہ احزؔن
طوفان اُٹھا کے نہ وہ دن رات بدل دے

❁❁❁

جو عداوت پہ تلا تھا پہلے
ہاں وہی دوست بنا تھا پہلے

مجھ سے اکثر یہ کہا تھا اس نے
کوئی مجھ سا نہ ملا تھا پہلے

اس کی قربت نے سنبھالا مجھ کو
جب کبھی ٹوٹ رہا تھا پہلے

ہاں ، رقیبوں میں وہی جا بیٹھا
وہ جو پابند وفا تھا پہلے

بد گمانی نے اسے توڑ دیا
اک تعلق جو بنا تھا پہلے

مختلف اب ہے رویہ تیرا
اور کیا عہد وفا تھا پہلے

وقت نے توڑ دیا اس کا غرور
جو گرفتارِ اَنا تھا پہلے

یوں ہی پلکیں نہ ہوئیں نم احزؔن
خواب آنکھوں میں سجا تھا پہلے

❁❁❁

کلیمؔ حاذق

87 Pilkhana, 2nd Lane, Howrah - 711101 (Mob. 9038800464)

غزلیں

زمیں گرفتہ ، فلک رنگ ہو رہے ہیں ابھی
ملنگ ، شاہ کے ارژنگ ہو رہے ہیں ابھی

یہ خوش نصیبی ہماری ہے کہ پاؤں تلے ہم
جو خار خار ہی گل رنگ ہو رہے ہیں ابھی

ہوا کی سانس بھی گھٹ جائے تو گھٹن ایسی
کہ دھول و گرد سے ہی تنگ ہو رہے ہیں ابھی

اترنے والی پری روز و شب میں کھو سی گئی
خیال و خواب بھی بے رنگ ہو رہے ہیں ابھی

کچھ اور دور ملیں گے وہ کوہسارِ شفق
جمودِ ابر پہ ہی دنگ ہو رہے ہیں ابھی

ابھی تو مشق ستم ہونا اور بھی ہے ہمیں
تری وفا سے ہم آہنگ ہو رہے ہیں ابھی

کلیمؔ خواب کا بستر سمیٹ کیوں لینا
سفر کے چند ہی فرسنگ ہو رہے ہیں ابھی

❁❁❁

ماسوا اپنے بلندی پہ مگر ہے کوئی
برگِ خاشاک ہیں ہم ، برگ شجر ہے کوئی

تم کو رہ رہ کہ یہ جھنکار سنائی دے گی
پا بہ زنجیر سہی پا بہ سفر ہے کوئی

ایک سجدے کے لئے صورتیں کیا کیا نکلیں
ہے جبیں ساز کوئی آئینہ گر ہے کوئی

میری پرواز پہ مت جائیو سب دھوکا ہے
ایک جا پنکھ ہلانا بھی سفر ہے کوئی

کربلا ہوتے ہوئے کیسے بھلا زندہ ہیں
ہم حسینی کہ یزیدی ہیں خبر ہے کوئی؟

سب کے سب شوق کے پہلو سے لگے بیٹھے ہیں
کیسے کہہ دوں تری دیوار میں در ہے کوئی

❁❁❁

مقطع زیبا

بن ملے تو یہ ہال ہے فدویؔ — وہ ملے گا تو کیا غضب ہوگا (فدویؔ)
راسخؔ یہ کیا ہے عشق کو بد نام مت کرو — عاشق ہو اور مرتے ہو نام و نشان پر (راسخؔ)
سعیدؔ آگے دمِ تیغ قضا کے — سر تسلیم کس کا خم نہیں ہے (سعیدؔ)
اُن پہ افشا ہوگیا نادمؔ دروں خانہ کا حال — محو نظارہ ہوئے جو دل کے جلوہ گاہ میں (نادمؔ)

یاسینؔ انصاری

Karanpura, Bah Adda, Near Shorawal Girls Inter Colleg, Etawah - 206001
(Mob. 9690433139)

غزلیں

اپنی ہمت کو یوں آزماتا رہا
میں چراغ آندھیوں میں جلاتا رہا
بے وفا کہہ کے اُس نے نظر پھیر لی
زندگی بھر یہی غم رُلاتا رہا
میں چھپاتا رہا عیب اُس کے مگر
خامیوں کو وہ میری گناتا رہا
پاس کچھ دل کے رشتوں کا اُس کو نہ تھا
دل کے رشتوں کو میں تو بچاتا رہا
جانے کیسا تھا وہ چارہ گر دوستو
زخم دے کر مجھے مسکراتا رہا
زندگی مجھ سے یاسینؔ برہم رہی
ناز اس کے میں لیکن اُٹھاتا رہا

❁❁❁

کسی کا کب برا ہم سوچتے ہیں
کہ سب کا ہی بھلا ہم سوچتے ہیں
زمانے سے جدا ہے سوچ اپنی
زمانے سے جدا ہم سوچتے ہیں
جو گھر محفوظ تھا برق و شرر سے
وہ گھر کیسے جلا ہم سوچتے ہیں
ہمارے ذہن کو پڑھنا ہے مشکل
وہ کیا جانیں کہ کیا ہم سوچتے ہیں
زمانے سے ہمیں محنت کا اپنی
صلہ کچھ کم ملا ہم سوچتے ہیں
تعلق سب ضرورت کے ہیں یاسینؔ
یہ کیا دور آگیا ہم سوچتے ہیں

❁❁❁

غزل

نعمت اللہ رضاؔ
Darul Hoda Islamic University, Kerala
(Mob. 9199258187)

سہانی صبح کی رنگت شباب جیسی ہے
میرے حبیب کی صورت گلاب جیسی ہے
ہزاروں سال سے اس کی ہی مدح کرتا ہوں
کہ اس کے باغ کی الفت کتاب جیسی ہے
نہیں ہوں بھولتا میں اس رفیق کا چہرا
کہ اس کے پیار کی عادت سراب جیسی ہے
اسے ہوں دیکھتا جب بھی تو دل یہ کہتا ہے
کہ اس سے دور کی الفت عذاب جیسی ہے
جو اس کو دیکھا کبھی خواب نے تو بولا یہ
تمہارے زلف کی نکہت شراب جیسی ہے

❁❁❁

آصفؔ احمد

Tarni Prasad Lane, Patna City - 800008 (Mob. 9308029624)

غزلیں

جمالِ یار اگر بے حجاب ہو جاتا
یقین جانئے پتھر گلاب ہو جاتا

تڑپ اداؤں سے لینے کو بجلیاں آتیں
سرورِ چشم سے پانی شراب ہو جاتا

سیاہی رات کی کچھ اور زیادہ گہناتی
اندھیرا زلف سے یوں فیض یاب ہو جاتا

مچلتا باغ ، بہاریں بھی لیتیں انگڑائی
گلوں کو ہونٹ سے حاصل شباب ہو جاتا

جو بھنورا دیکھتا اس کی صبوحی سی گردن
چمن کا پھول بھی بس محو خواب ہو جاتا

رُخ صنم پہ ستارے لٹاتے جاں اپنی
مہہ دہم کا بھی وہ انتخاب ہو جاتا

جمالِ یار پہ خود کہکشاں فدا ہوتی
شفق کو اور بھی کچھ رنگ و تاب ہو جاتا

بسا کے ذہن میں رکھتا میں اس کی وہ باتیں
محبتوں میں جو آصفؔ خطاب ہو جاتا

❁❁❁

حاصل ہوا وفا کا سبق جس کے باب سے
بڑھ کر کوئی کتاب نہیں اُس کتاب سے

کہہ دو نہ نکلے وہ کبھی باہر حجاب سے
ٹکڑا نہ جائے چاند کہیں آفتاب سے

رُخسارِ یار کے ہیں یوں دیوانے ہر جگہ
بلبل کا جیسے ہوتا ہے رشتہ گلاب سے

سمجھے کوئی تو عشق کا بھی اِس میں دخل ہے
روشن ہے کائنات جو حسن شباب سے

عالم کی سب بہارِ مسرت ہے ترے پاس
میری خزاں بھی کم نہیں جامِ شراب سے

دو دن کی زندگی پہ نہ اِتنا کرے غرور
انساں کو چاہئے کہ سبق لے حباب سے

حاصل ہے یہ مقام فرشتوں کو بھی نہیں
انساں کو جو ملا ہے خدا کی جناب سے

پا کے تجھے ہوں سرخرو دونوں جہان میں
آصفؔ یہ کہہ رہا ہے بڑے آب و تاب سے

❁❁❁

غزلیں

جی ڈی احمر
H.No. 245, Road No. 1, Millat Nagar, Sraikela Khrsaawaan - 831012 (Mob. 7209306836)

جو ، نہیں ، کہتا تھا ، ہاں کیوں کر ہوا
حالِ دل مجھ پر عیاں کیوں کر ہوا
ہوں ابھی پیچیدگی کے جال میں
دشمن جاں ، جانِ جاں کیوں کر ہوا؟
جو بدکتا تھا مرے سائے سے ، وہ
ہم سفر ہم کارواں کیوں کر ہوا؟
جس نے کانٹے راہ میں ڈالے مری
مجھ پہ یوں وہ مہرباں کیوں کر ہوا
گر گیا آنکھوں سے آنسو ، ٹھیک ہے
ہاں! وہ بحر بیکراں کیوں کر ہوا؟
بات جس کے پیٹ میں پچتی نہ تھی
ہے تعجب رازداں کیوں کر ہوا؟
اپنی محنت پر بھروسہ تھا مگر
وقت میرا رائگاں کیوں کر ہوا
ہر قدم پر اس نے روڑے رکھ دیئے
راہ رَو پھر کامراں کیوں کر ہوا؟
جان دی ہے ہم نے اکثر ملک پر
شاہ احمر بدگماں کیوں کر ہوا

❀❀❀

مظہر زاہدی
Loharwa Ghat Lane, Alamganj, Patna - 800007
(Mob. 9934410620)

سینے پہ اپنے داغِ محبت لئے ہیں ہم
جینا بہت کٹھن ہے مگر جی رہے ہیں ہم
ہم نے وطن کے باغ کو سینچا ہے خون سے
صد حیف سب کی آنکھوں میں پھر بھی برے ہیں ہم
آنکھیں دکھائیں ہم کو نہ بزدل یہ آندھیاں
روشن ہے جن سے مہر وہ روشن دیئے ہیں ہم
پی کر لہو ہمارا ، وفا سرخرو ہوئی
ظلمت کی آندھیوں میں بھی جلتے رہے ہیں ہم
جب بڑھ گئی ہے پیاس تو پانی کو پھینک کر
راہِ وفا میں آگ کے دریا پیئے ہیں ہم
کانٹے عدو بچھائے محبت کی راہ میں
کیا کیا نہ لفظ یاروں کے منھ سے سنے ہیں ہم
غیروں کی دشمنی کا گلہ کیا کریں بھلا
دشمن تو اپنی ذات کے خود ہی بنے ہیں ہم
دنیا کے لوگ کیوں نہ کریں دل سے احترام
مظہر کسی کی آنکھوں کے پیارے رہے ہیں ہم

❀❀❀

احساؔس گیاوی

C/o Jawed General Store, Near Anjan Shaheed, Abgila, Gaya - 823003
(Mob. 7632077060)

غزلیں

عیش و عشرت میں ہوا جس کا بسر کیا جانے
رنج و غم ، آہ و فغاں ، دردِ جگر کیا جانے

یوں تو کرتے ہیں سبھی حسن خیالی میں سفر
زندگی لے کے کسے جائے کدھر کیا جانے

مشورہ ہے میرا نفرت کو ہوا مت دینا
شعلہ بن جائے نہ اک روز شرر کیا جانے

ہے ضرورت بھی مگر اُس پہ بھروسہ بھی نہیں
کب چلا جائے ادھر سے وہ ادھر کیا جانے

شام رنگیں ہے چلو اس پہ قناعت کر لیں
ہو نہ ہو اپنے مقدر میں سحر کیا جانے

❁❁❁

کوئی غالبؔ کوئی اقبالؔ کوئی میرؔ بنے
اک الگ رنگ کے ہم صاحب تحریر بنے

ظرف والے جو ہیں غیرت سے ہی مر جاتے ہیں
تلخ الفاظ ہی ان کے لئے شمشیر بنے

ہم نشانے پہ سدا اہل سیاست کے رہے
ہم ہی مدا بنے ، ہم سرخیٔ تقریر بنے

عزم پیہم سے ہوا کا بھی رُخ بدل جائے
آدمی چاہے تو بگڑی ہوئی تقدیر بنے

میری رفتار بھی دریا کی روانی سی تھی
مرے حالات میرے پاؤں کی زنجیر بنے

وہ تو احساؔس چمکتے رہے سورج کی طرح
ہم تو دیوار پہ لٹکی ہوئی تصویر بنے

❁❁❁

اشعارِ دردؔ

میں نہیں کہتا کہیں تم اور مت جایا کرو
بندہ پرور اس طرف کو بھی کبھو آیا کرو

کبھو رونا ، کبھو ہنسنا ، کبھو حیران ہو جانا
محبت کیا بھلے چنگے کو دیوانہ بناتی ہے

کیا کام مجھے خوف و رجا سے کہ مرے پاس
ہے جان سو بے جان ہے ، دل ہے جو غنی ہے

دونوں جہاں کی نہ رہی پھر خبر اُسے
دو پیالے تیری آنکھوں نے جس کو پلا دیئے

وصف خاموشی کے کچھ کہنے میں آسکتے نہیں
جس نے اس لذت کو پایا ہے ، سدا خاموش ہے

مت موت کی تمنا اے دردؔ ہر گھڑی کر
دنیا کو دیکھ تو بھی ، تو تو ابھی جواں ہے

سرفراز اشہر
Milki Mohalla, Ahmad Kada Deputy Samuel Street "Near Madina Cottage" .
Arrah - 802301(Mob.8969023273)

غزلیں

مرے ذہن میں جو برائی ہے، مرے ذہن سے تو نکال دے
تو قبول کر لے مری دعا ، مری زندگی میں اُجال دے

مجھے اتنی عقل ضرور دے نہ ہو واسطہ بھی غرور سے
جو محبتوں کا ہی رنگ ہے اُسی رنگ میں مجھے ڈھال دے

تری راہ میں رہوں گامزن ، یہی التجا ہے مری خدا
مرے عشق میں وہ سرور دے مرے شوق کو تو اُبال دے

جو روا نہیں ہے شریعتاً وہ روا نہیں ہے مرے لئے
تو بچالے رزقِ حرام سے مجھے دے تو رزقِ حلال دے

یہی سوچتا رہا عمر بھر مرے بس کی بات ہے یہ کہاں
ترے ہاتھ میں ہے مرے خدا تو عروج دے یا زوال دے

تری جستجو میں سدا سے ہوں اسی دامن کوہسار میں
تجھے سرفرازؔ کو دینا ہے تو حسین خواب و خیال دے

❁❁❁

اتنی توفیق تو الٰہی دے
حق کی بے خوف وہ گواہی دے

کچھ دکھائی نہ دے سوا اپنے
مجھ کو ایسی نہ بادشاہی دے

اس کی جانب قدم بڑھانا تم
جب بھی آواز کوئی راہی دے

ریت پر ہر طرف تڑپتی ہوئی
کیوں دکھائی ہر ایک ماہی دے

بد دعا ہی دعا ہے میرے لئے
اس سے کہہ دو کے بد دعا ہی دے

دیکھ کر میرا کارنامہ کبھی
تو بھی تو مجھ کو واہ واہی دے

اس کی مرضی ہے سرفراز اشہر
جس کے ہاتھوں میں سربراہی دے

❁❁❁

اشعارِ زیبا

روشن ہے میرے سینۂ سوزاں میں داغ ایک — تاریک گھر میں جلتا ہو جیسے چراغ ایک (حضورؔ)
گو کہ محتاج ہیں ، گدا ہیں ہم — بے نیازی کے بادشاہ ہیں ہم (دلؔ)
اپنی کملی میں ہی مگن ہے طپاںؔ — کام کیا شال سے دوشالے سے (طپاںؔ)
کس زیست پہ تعمیر کرے کوئی عمارت — اس عالم ہستی کو بھروسہ نہیں دم کا (شورشؔ)

نام کتاب	:	نیرنگ تمنا
مصنف	:	رضی احمد فیضی
ناشر	:	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
اشاعت	:	۲۰۲۴ء صفحات : ۱۶۰
قیمت	:	۳۰۰روپے
مبصر	:	ڈاکٹر ارشاد احمد

دبستان بہار سے تعلق رکھنے والے جن جواں سال غزل گو شعرا نے اپنی شناخت مضبوط کی ہے ان میں رضی احمد فیضی کا نام بھی شامل ہے۔ نیرنگ تمنا جناب رضی احمد فیضی کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ اس میں ڈاکٹر مشتاق صدف، اظہر عنایتی، ڈاکٹر افروز عالم اور جاوید اقبال کے تنقیدی وتجزیاتی مضامین کے علاوہ رضی احمد فیضی کا مبسوط پیش لفظ بھی شامل ہے۔ فاضل مقالہ نگاروں نے فیضی کی شاعری پر مفصل گفتگو کرتے ہوئے ان کے انفراد واتمیازات کی نشاندہی کی ہے۔ رضی احمد فیضی نے پیش لفظ میں اپنے وطن مالوف کی معلوماتی تاریخ رقم کی ہے اور اپنی تعلیمی، ذہنی وفکری سفر کا ذکر کیا ہے۔

''نیرنگ تمنا'' میں جناب رضی احمد فیضی کی ۳۷ غزلیں، آٹھ نظمیں، ایک رخصتی، ایک گیت اور ایک مرثیہ شامل ہے۔ تعداد کی بنا پر ہم اسے غزلوں کا مجموعہ کہہ سکتے ہیں۔ رضی احمد فیضی کی غزلوں کا موضوعاتی دائرہ کافی وسیع ہے، کیونکہ انہوں نے اپنی غزلوں کو روایتی حسن وعشق کے موضوع تک محدود رکھنے کے بجائے داخلی وخارجی و اردات ومشاہدات کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی، قومی، مذہبی اور معاشی و معاشرتی مسائل کا عکاس بنا دیا ہے۔ اپنے اس اول شعری مجموعے میں فیضی اگرچہ ایک روایتی عاشق کی طرح متعارف ہوئے ہیں اور ان کے مشمولہ موضوعات میں عشق کچھ زیادہ ہی نمایاں ہے، لیکن ان کا حسن و لطف یوں اور بڑھ جاتا ہے کہ ان میں فطرت نگاری کے نادر نمونے جلوہ گر ہیں۔ فیضی کے عشقیہ اشعار میں جذبات کی پاکیزگی، احساسات کی نزاکت، تجربات میں صداقت اور مشاہدات میں گہرائی ہے جن سے اشعار دلفریب اور جاذب نظر بن گئے ہیں ۔

اسی سے عشق کی توقیر بھی ہے
غم دل کو چھپا لو آشنا سے

اشک میں تیرتی تصویر کہاں لے جاؤں
تجھ کو آنکھوں میں چھپاتے ہوئے تھک جاتا ہوں

محبت آگ کا دریا ہے جس میں
بلا کی موج ہے ، ساحل نہیں ہے

کسی لمحہ بھی یہ فرقت زدہ دل
تمہاری یاد سے غافل نہیں ہے

اردو کے بیشتر روایتی غزل گو شعرا نے محبوب کے حسن و جمال، ناز وادا، رعنائی، زیبائی وکج ادائی کے بیان میں غلو سے کام لیا ہے۔ کبھی کبھی یہ غلو اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ ان میں بھونڈا پن آجاتا ہے، لیکن رضی احمد فیضی نے اس ضمن میں قدرے احتیاط سے کام لیا ہے جس سے ان کے اشعار میں حقیقت کا رنگ پیدا ہوگیا ہے۔ یہ فیضی کا کمال ہے کہ انہوں نے اپنے کلام میں رکاکت اور ابتذال سے دامن کشاں ہوکر اپنے محبوب کے اوصاف کا بیان حقیقت پسندانہ انداز میں کیا ہے۔ ازیں علاوہ معاشرتی مسائل سے تعلق رکھنے والے ان کے اشعار بھی اسی زمرے میں شامل کئے جاسکتے ہیں۔ ایسے اشعار کی سب سے بڑی

خصوصیت یہ ہے کہ ان کی زبان سادہ، رواں اور پر اثر ہے ۔

ان کی ترچھی نظر سے ہوتا ہے
ہم کو تیر و کمان کا دھوکا
ایسا رہزن ہمیں ملا جس پر
ہوگیا پاسبان کا دھوکا

تیری جانب جو جاتا ہے
کیوں ترا وہ ہو جاتا ہے

آنکھیں ہیں اس کی تیر تو ابرو کمان ہیں
ہے جسم چاندنی کا تو چہرہ گلاب ہے

اس نے دنیا بہت گنوائی ہے
تب کہیں آخرت کمائی ہے

فیضؔی کے اس شعری مجموعے میں آٹھ نظمیں شامل ہیں۔ پہلی نظم ''انتظار'' ہے۔ یہ ایک علامتی نظم ہے۔ قرأت سے لگتا ہے کہ شاعر کو اپنے محبوب (جس کا اعلانیہ ذکر نہیں ہے) کا انتظار ہے۔ شاعر کا انداز تکلم دیکھئے ۔

ایک مدھم سی سرسراہٹ پر
ٹک گئی ہے نگاہ چوکھٹ پر
وہم کہتا ہے اب یقیں ہارا
عشق کہتا ہے میں نہیں ہارا
دل کے صحرا میں روح پیاسی ہے
حد امکان تک اداسی ہے
بن ترے کائنات کچھ بھی نہیں
تو نہیں تو حیات کچھ بھی نہیں
دل کو بس انتظار تیرا ہے

فیضؔی نے ''نیرنگ تمنا'' کی دوسری نظموں میں قدرتی مناظر کی عکاسی، گردوپیش کے واقعات کی ترجمانی، سیلاب کی تباہ کاری کا بیان اور پیاری زبان اردو کی تعلیم ترغیب اور تحریک کا ذکر پر لطف طریقے سے کیا ہے۔ فیضؔی چونکہ ایک حساس، ذہین اور تخلیقی فنکار ہیں، اس لئے ان کے قلم سے اس طرح کی متاثر کرنے والی نظمیں معرض وجود میں آئی ہیں۔

روشن علی حلیمی کی وفات پر رضی احمد فیضؔی نے جو المناک مرثیہ لکھا ہے اس کے چند اشعار ملاحظہ کریں ۔

روشنؔ کو بخش دے خدا ، یاروں کا یار تھا
روشن علی فرشتہ صفت غم گسار تھا
روشن امام ، بندۂ پروردگار تھا
روشن کو فیضؔی سے ہی نہیں سب سے پیار تھا
روشن کو اپنا پیر مغاں جانتا ہوں میں
اک جائے بے اماں ہے جہاں، جانتا ہوں میں

الغرض ''نیرنگ تمنا'' کو نیرنگ خواب وخیال بھی کہہ سکتے ہیں۔ رضی احمد فیضؔی نے فن شاعری کے جملہ لوازمات کا خیال رکھتے ہوئے اپنی تخلیقات کو فنی اور جمالیاتی عناصر سے ممیّز کیا ہے جس سے ان کی شاعری میں بلا کی کشش اور لفریبی پیدا ہوگئی ہے۔ یہ اندازہ رکھنا یقیناً حسن ظن نہیں کہ ''نیرنگ تمنا'' کی وساطت سے فیضؔی کا فیضان سخن اپنے قاری تک مسرت اور بصیرت کی سوغات پہنچانے میں زیادہ سے زیادہ کامیاب رہے گا۔

نام کتاب	:	آبنائے خیال
مصنف	:	اکرام آزرؔ
ناشر	:	آبدار پبلی کیشنز، کولکاتا
صفحات	: ۱۵۲	قیمت : ۳۰۰ روپے
مبصر	:	اشفاق عادل

''آبنائے خیال'' کا مطالعہ کرتے وقت جس چیز نے مجھے ذہنی طور پر اس کے قریب کیا، وہ ہے اس کے خالق اکرام آزرؔ کی روداد حیات۔ ان کے اور میرے درمیان کئی معاملات مشترک نظر آئے، جیسے اسکول کے دنوں میں شاعری کا روگ لگنا، لمبے لمبے عرصے پر غزل کہنا، ادب پڑھنا لکھنا، لیکن تعلیم ایک خشک موضوع یعنی کامرس کی حاصل کرنا جس کا کوئی علاقہ ادب سے نہیں اور یہ بھی کہ مجموعہ کلام کی اشاعت میں اتنی تاخیر کرنا کہ نئی صدی کا چوتھائی حصہ ختم ہونے کو آجائے۔ ''آبنائے خیال'' کی ورق گردانی کرتے وقت جس خیال نے سر اُٹھایا وہ یہ کہ انہوں نے شعر کہنے میں جلد بازی نہیں دکھائی ہے اور سنبھل سنبھل کر،

ٹھہر ٹھہر کر سوچا ہے اور ان کی شاعری کی جاذبیت اسی میں مضمر ہے۔

پیش نظر مجموعہ کلام ''آبنائے خیال'' اکرام آزر کا نقش اول ہے جو ان کی غزلوں پر مشتمل ہے۔ غزل اردو شاعری کی آبرو ہے کہ ایک نیم وحشی صنف سخن، اس پر بہت ساری گفتگو ہو چکی ہے۔ کچھ اِس خیمے میں رہے تو کچھ اُس خیمے کے علم بردار بنے، اس قضیئے پر اب بہت گرد پڑ چکی ہے اور اب یہ ماضی کا قصہ ہے، لیکن اس حقیقت سے مفر ممکن نہیں کہ اگر کسی نے میخانۂ غزل سے ایک قطرہ مئے پی لی تو پھر وہ عمر بھر ساقی میخانہ کی چوکھٹ سے بندھا رہتا ہے۔ ''آبنائے خیال'' کے شاعر کا بھی یہی حال ہے۔ ۱۹۸۰ء کے بعد یعنی مابعد جدیدیت والی نسل نے غزل گوئی سے اپنا مضبوط رشتہ بنا رکھا ہے۔ ''آبنائے خیال'' اس خیال کی تائید کرتا دکھائی دیتا ہے۔

اکرام آزاد نے اپنے دیباچہ میں اپنی زندگی کے نشیب و فراز نیز شعری ذوق وشوق کا تعارف کرایا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اصل وطن بہار ہے چونکہ والدین نے وہیں سکونت اختیار کر لی تھی، لہٰذا بچپن سے وہ وہیں کے ہو رہے۔ اسکولی اور دور میں بیت بازی کے طفیل شاعری کی سرخ پری نے انہیں اپنی زلفوں کے جال میں کچھ اس طرح جکڑا کہ اس وقت کا آزار اب لذتِ آزار بن چکا ہے اور اب حال یہ ہے کہ ''چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی'' وہ بنگال میں رہتے ہیں اور یوں بھی مثل مشہور ہے کہ بنگال کے کالے جادو سے بچنا محال ہے۔

اکرام آزر کی شاعری نے مابعد جدید کے نقطہ آغاز کے وقت سے زور پکڑا۔ سالک لکھنوی، ابراہیم ہوش، اعزاز افضل، علقمہ شبلی، حرمت الاکرام، وکیل اختر، نصر غزالی، قیصر شمیم، مضطر حیدری، حامی گورکھپوری وغیرہ جیسے پیش رو فن کاروں کے نقوش قدم ان کے پیش نظر تھے۔ ترقی پسندی کا قلعہ کب کا ڈھ چکا تھا، جدیدیت کی شاہراہ پر چلنے والے بھی ٹھہر کر سانس لینے لگے تھے۔ اسی وقت اکرام آزر کی شاعری منزل کی تلاش میں اپنے بازوؤں کو پھلائے محو پرواز تھی۔

بہر حال زیر تبصرہ ''آبنائے خیال'' میں ۱۰۵ غزلیں ہیں اور روایت کے مطابق شاعر نے پہلے حمد الٰہی اور نعت پاک سے اس کی ابتدا کی ہے۔ شاعر نے پیش لفظ ''سچ کہہ دوں'' میں اپنی زندگی کے نشیب و فراز کے ساتھ ساتھ اپنے ذوق سخن کے بارے میں بھی اختصار سے عرض کیا ہے۔ اس سے قبل کتاب میں معروف افسانہ نگار ظہیر انور اور خوش فکر شاعر بدر محمدی کے علاوہ ڈاکٹر عقیل احمد عقیل اور عنبر صدیقی کی تقاریظ تقریظیں ہیں۔ ڈاکٹر بدر محمدی نے اکرام آزر کی شاعری پر مفصل اظہار خیال کیا ہے اور ان کی غزلیہ شاعری کے نقوش واضح کرتے ہوئے ان کے شعری پیکر کے ممکنات و مضمرات اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ فلیپ پر ڈاکٹر افتخار احمد اور پس ورق پر منظور عادل کی رائے ہے۔ سبھی نے یہ باور کرانے کی سعی کی ہے کہ اگر چہ ''آبنائے خیال'' نقش اول ہے، لیکن اس پر نقش دوم وسوم کا گمان ہوتا ہے اور اس صاف ستھری شاعری

میں جذبہ فکر کی نفاست ہے، سادگی اور شگفتگی ہے، تازگی و تمازت ہے۔ ان اوصاف کے پیش نظر جب ہم اکرام آزر کی غزلوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ہمیں ان کے کلام میں ایسے کئی اشعار مل جاتے ہیں جو ان کو نہ صرف اعتبار بخشتے نظر آتے ہیں، بلکہ ان کے لہجے کی تازگی کی غمازی بھی کرتے ہیں ؎

منھ دیکھتی ہی رہ گئیں زخموں کی سرحدیں
موجِ خیال پھاند گئی درد کے حصار

شام ڈھلتے ہی جگمگاتے ہیں
زینۂ شب پہ نقش ہائے خیال

چلو اب ڈوب جائیں اپنے اندر
غموں کی رات گہری ہو چکی ہے

آزر ایک حساس دل رکھتے ہیں۔ زندگی کے پرخار راستوں پر چلتے ہوئے انہیں ہزار زخم سہنے پڑے ہیں، لیکن وہ حرکت و عمل کے راستے پر گامزن ہیں اور زندگی کی تہہ داریوں سے گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے اشعار میں حزن کی کیفیت تو ہے، لیکن ایک حوصلہ مندی بھی ہے ؎

زندگی کیسی ہے یہ وادی تری
گل بھی شاکی ، بو بھی فریادی تری

دنیا کے مظالم پہ ہنستا ہے وہی ظالم
غم تیری جدائی کے جس شخص نے جھیلے ہیں

مفلسی جسم کو تاراج کرے گی پھر بھی
سرنگوں کردے محبت کو ہوس ناممکن

دل میں ترا خیال جو آیا تو تھوڑی دیر
اس شہر بے چراغ میں کچھ روشنی رہی

غزل کے وہ سبھی علائم جو جدیدیت پسندوں کے محبوب موضوعات تھے یعنی مشینی زندگی، صارفیت زدہ معاشرہ، گھٹن، بے یقینی، تنہائی، روحانی انتشار، اخلاقی گراوٹ کی نوحہ گری، نسل آدم کا زوال وغیرہ، ان کے نقوش ابھی بھی ایک فرق کے ساتھ ہمارے ذہنوں پر مرتسم ہیں۔ نئی غزل میں یہی احساسات قدرے دلربانہ انداز میں نظر آتے ہیں۔ اکرام آزر کی غزلیں ان سے اچھوتی نہیں۔ چند اشعار پیش ہیں ؎

اے کاش کبھی جھانک بھی لیتا مرے اندر
اک شخص جو کہنے کو مرے ساتھ رہا بھی

کوئی بھی راہ گزر لے گئی نہ منزل تک
ہر ایک راہ میں اُڑتا رہا غبار مرا

شام کی کچلی لاش کے ملتے ہی آزر
ننگے شہر پہ رات نے کوڑے برسائے

دائرے کا ہے سفر زندگی ، حیرت کیسی
جس جگہ سے کیا آغاز وہیں تک پہنچے

اب یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی شاعری میں ان باطنی سوز و گداز کا فقدان ہے جن کے مدوجزر سے ہم اندر ہی اندر چھٹپٹاتے رہتے ہیں۔ ان کے اندر کا شاعر جذب دروں کو عصری شعور سے جب ہم آہنگ کرتا ہے تو یہ اشعار ہماری سماعتوں سے ٹکراتے ہیں جن میں لہجے کا نیا پن ہے، روایتی فرسودگی نہیں ؎

کسی کو ڈھونڈنے کی کوششوں میں
میں اپنے آپ کو ہی کھو چکا ہوں

آزر غموں کی بھیڑ میں یہ سوچتے ہیں ہم
دل کے معاملات میں کیوں بے جھجک پڑے

میں زخم زخم سہی حوصلہ ہے تازہ دم
کہ حد شوق سے آگے ہے میرا کاشانہ

کیا ہی بہتر ہوتا کہ غزلوں کے انتخاب کے دوران اس قبیل کے اشعار مجموعے میں جگہ نہ پاتے ؎

چلتی ٹرین سے ہم اترے ہوئے مسافر
کیا جان پائیں گے کب منزل کا راستہ پھر

زہراب غم دنیا ہونٹوں پہ سمٹ آیا
بوسوں کے نشاں تیرے رخسار پہ ٹیلے ہیں

ملتجی خوف زدہ ہر فریاد
با اثر ، با رسوخ ، فتنہ و فن

المختصر اکرام آزر کی شاعری ماضی کی صحت مند روایت سے وابستگی کا اشاریہ تو ہے، لیکن ان کے اشعار اس بات کی بھی غمازی کرتے ہیں کہ وہ جدید حسیت اور طرز نو کے اظہار کی انگلی پکڑ کر چلنا چاہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ رجائیت پسند شاعر ہیں، قنوطی تو ہرگز نہیں۔ ان کا لہجہ رسمی نہیں جدید ہے اور وہ شعر میں خوشگوار آہنگ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ امید ہے کہ یہ مجموعہ قارئین کی توجہ مبذول کرانے میں کامیاب ہوگا۔

نام کتاب	:	زندگی میں پہلی بار
مصنف	:	نیاز احمد آسی
ناشر	:	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
اشاعت	:	۲۰۲۴ء صفحات : ۱۱۲
قیمت	:	۲۰۰ روپے
مبصر	:	ڈاکٹر ریحان احمدقادری

''زندگی میں پہلی بار'' نیاز احمد آسی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جو ۱۳۲ افسانوں پر مشتمل ہے۔ ان کا پہلا افسانہ ''ایک معصوم یادگار'' کے عنوان سے ہے جو ماہنامہ ''آنگن'' سہارنپور میں اپریل ۱۹۷۷ء میں

شائع ہوا تھا۔ نیاز احمد آسی اپنے افسانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میرے افسانے اس (فنی) کسوٹی پر کھڑے اترتے ہیں یا نہیں مجھے نہیں معلوم۔ میں کہانیاں کیوں لکھتا ہوں مجھے نہیں معلوم، مجھ سے کہانیاں خود لکھواتی ہیں یہ بھی نہیں کہہ سکتا ہوں کہ کہانیاں خدا نے بھی بیان کی ہیں۔ سچی کہانیاں، حقیقی کہانیاں، سورۂ یوسف، سورۂ مریم، سورۂ کہف اس کی مثالیں ہیں۔ کہانیاں فوراً انقلاب پیدا نہیں کرتیں، یہ انقلاب کے لئے افراد کی ذہن سازی کرتی ہیں۔ یہ انقلاب ایک دن میں نہیں آتا ہے۔ اس میں برسہا برس لگ جاتے ہیں.....'' (زندگی میں پہلی بار، ص ۱۱)

زیرِ نظر کتاب کا پہلا افسانہ ''وہ'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں افسانہ نگار نے سماجی اور سیاسی حالات کی عکاسی کی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''اب ہم دونوں ایک ندی کے کنارے کھڑے تھے.....
'یہ ندی دیکھ رہے ہو نا.....' اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا.....'ہاں دیکھ رہا ہوں۔' میرا مارے دہشت کے برا حال تھا۔ ندی میں انسانوں کا سر اور پانی کی جگہ خون بہہ رہا تھا .....'یہ نیل کی ندی ہے ..... یہاں ہزاروں انسانوں کا خون بہایا گیا.....ان ہی مظلوموں کے خون سے یہ ندی سرخ ہو چکی ہے..... میں نے دیکھا وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے۔ پتا نہیں میں بھی کیوں رونے لگا۔''

افسانہ اُردو ادب کی ایک نثری صنف ہے جو مختصر کہانی پر مشتمل ہوتی ہے جس میں کسی ایک واقعے یا زندگی کے کسی خاص پہلو کو دلچسپ اور مختصر انداز میں بیان کیا جاتا ہے، اس میں زندگی کے ایک رخ یا پہلو کی عکاسی کی جاتی ہے اور اُسے ایک ہی نشست میں پڑھا جا سکتا ہے۔ ''زندگی میں پہلی بار'' ایسے ہی افسانوں کا مجموعہ ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ ''زندگی میں پہلی بار'' کے افسانے ہندوستان کے مختلف اخبارات، رسائل و جرائد میں گاہِ بگاہے شائع ہوئے تھے۔ کتاب میں شامل افسانوں میں ''وہ''، ''دمِ واپسی''، ''مسلمان کی تلاش''،

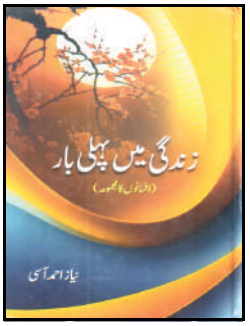

''نیم باز آنکھیں''، ''انتقال پر ملال''، ''طوفان آنے والا ہے''، ''ایک ادھوری کہانی''، ''پاگل''، ''ایک چھوٹی سی کتاب''، ''تلاش جاری ہے''، ''آخری قرض'' اور ''زندگی میں پہلی بار'' نہایت عمدہ افسانے ہیں جن کو پڑھنے کے بعد زندگی کے مختلف پہلو موثر انداز میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ افسانہ ''مٹی ہی مٹی'' بھی ایک متاثر کرنے والا افسانہ ہے۔ موجودہ دور کی حقیقت کو بیان کرتا ہوا نظر آتا ہے جہاں سارے رشتے صرف اور صرف پیسے کی بنا پر ختم اور نئے رشتے پیسے ہی کی نسبت سے وجود میں آتے ہیں۔ عصری تناظر میں یہاں رشتوں کا المیہ سامنے لانے کی کوشش اچھی ہے۔

ایک فکریہ افسانہ ''جاگتے رہو'' بھی موجودہ دور کے مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے یوں اہم ہے کہ ''کب تک ہم کو دوسرے لوگ بیدار کرتے رہیں گے چاہے وہ شیر کا ڈر ہو یا کسی اور سیاسی جماعتوں کا ڈر'' اس افسانے میں ایک چوکی دار کے گاؤں میں نہیں رہنے پر لوگ جنگلی شیر کی خبر اور اس کے ڈر سے بیدار رہتے ہیں مگر خود کو سیاسی جماعتوں کے فتنے سے بچنے کے لیے بیدار نہیں ہوتے ہیں۔ مصنف کا یہ بہترین مقصدی افسانہ ہے، دیگر افسانوں میں ''سارے جہاں سے اچھا''، ''گھر واپسی''، ''ایشوراللہ تیرو نام''، ''بکس''، ''ایک نوبل انعام یافتہ''، ''ماں''، ''چندن کا ٹیکہ'' وغیرہ بھی کافی عمدہ اور سبق آموز افسانے ہیں۔

نیاز احمد آسی کا ایک اہم افسانہ ''تلاش جاری ہے'' اس میں بھی سیاسی حالات اور عصر حاضر کے لیڈران پر تنقید کی گئی ہے اور مکالموں کے ذریعہ یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آج کوئی بھی اپنی اصلاح کے لئے تیار نہیں اور دوسروں پر طنز کرنے سے گریز نہیں کرتا، لہٰذا ہمیں آج کے حالات میں خود میں سدھار لانے کی ضرورت ہے۔ نیاز احمد آسی کے بیشتر افسانوں کا ماحول سہل اور پیامی انداز کی کہانیوں کا ہے۔ ان کی تحریر میں وہ سچائی نظر آتی ہے جو عام طور پر معاشرہ کے افراد کو نظر نہیں آتی۔ امید ہے کہ یہ مجموعہ یکسر بے التفاتی کی نذر نہیں ہوگا۔ ❁❁

وفیات

آہ! شکیلؔ سہسرامی

پٹنہ:۔ گزشتہ دنوں معروف ومقبول کہنہ مشق اور صالح فکر شاعر شکیلؔ سہسرامی اِس دارِفانی سے رخصت ہوگئے۔ تقریباً ایک ماہ ہسپتال میں زیرعلاج رہنے کے بعد ۱۲جولائی ۲۰۲۵ء بروز شنبہ، پٹنہ میں واقع اپنی رہائش گاہ پر انہوں نے آخری سانس لی۔ انا للہ وہ کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا تھے اورشاعری کی زبان میں بڑی ہی بلاغت ونزاکت سے اپنے مداحوں کو یہ اشارہ دے چکے تھے کہ۔

شاعری سے مت سمجھنا ٹھیک ہوں
سچ تو یہ ہے موت کے نزدیک ہوں

اور رہے نام اللہ کا، یہ سچائی سامنے آہی گئی۔ انتقال کے بعد اُن کا جیدِ خاکی، اُن کے آبائی وطن سہسرام لے جایا گیا اور وہیں وہ آسودۂ لحد ہوئے۔

شکیلؔ سہسرامی کا اصل نام محمد شکیل خاں تھا، لیکن ادب وشاعری کی دنیا میں وہ اپنے قلمی نام وتخلص سے ہی جانے جاتے تھے۔ وہ ۵/جولائی

۱۹۶۲ء کو سہسرام میں پیدا ہوئے، لیکن تعلیم سے فراغت کے بعد سرکاری ملازمت میں آجانے کی وجہ سے انہوں نے پٹنہ کو اپنا وطن ثانی بنالیا تھا اور اپنے ذاتی مکان واقع سمن پورہ، راجہ بازار میں قیام پذیر تھے۔ جناب شکیلؔ سہسرامی کو علم وادب اور شاعری کا ذوق اپنے خاندان وماحول سے ورثہ میں ملا تھا۔ ان کے والد مولوی عبدالوحید خاں غازی شمسی اپنے وقت کے بڑے عالم اور نامور خطیب گزرے ہیں ان کے نام پر سہسرام کے محلّہ کرن سرائے میں ''مولوی عبدالوحید منزل'' آج بھی موجود ہے۔ شکیلؔ سہسرامی کی والدہ کا نام صالحہ خاتون تھا اور اپنے نیک اطوار اور تقویٰ وطہارت کی سجہ سے وہ ''پاکباز صالحہ'' کہلاتی تھیں۔ شکیلؔ سہسرامی کے دوسرے بڑے بھائی مختار احمد خاں شگفتہؔ سہسرامی بھی اپنے وقت کے معروف ومقبول، خوش گلو قومی شاعر تھے۔

شکیلؔ سہسرامی صالح فکر رکھنے والے ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ ان کی غزلیہ ونظمیہ شاعری میں جہاں موضوعات کا تنوع ملتا ہے اور خاص لب ولہجہ کے ساتھ شاعرانہ صنعتوں کو آورد کے بغیر برتا گیا ہے، وہیں ان کی تقدیسی شاعری میں خدا ورسول سے محبت اور بزرگانِ دین سے عقیدت کا جذبہ، فراواں بھی موجود ہے۔ وہ نہایت فعال اور پُرشوق فنکار تھے۔ ان کی نظموں میں اگر فنی تعمیر کا وصف نمایاں ہے تو موقتی موضوعات پر ان کی قطعہ گوئی بھی

آوارجہ

اس لئے ہے ہم نواؤ ، باثر آوارجہ
ہے ہماری زندگی کا باثر آوارجہ

چشم دل سے عالم تنہائی میں دیدہ ورو
اپنا اپنا دیکھتا ہے ہر بشر آوارجہ

ہے کتابِ زندگی کی اصطلاحِ عام یہ
سب رقم کرتے ہیں اپنا عمر بھر آوارجہ

اس لئے باقی نہیں اب انگلیوں میں خوں ذرا
شام سے لکھا ہے میں نے تاسحر آوارجہ

صحن جاں میں ہلکی ہلکی ہے اسی کی روشنی
مثل شمع جل رہا ہے تاک پر آوارجہ

دیکھنا ممکن نہیں اس وقت میرا اور کچھ
لکھ رہا ہوں خونِ دل میں ڈوب کر آوارجہ

کیوں نہ احساسِ مسرت ہو میسر آپ کو
ترجمانِ آرزو ہے سربسر آوارجہ

کیا ضروری ہے ادا ہونا زبانِ حال سے
درد ہے تختیؔ پہ معتبر آوارجہ

(''ابرسخن'' ص۵۰)

یادگار رہے۔ شکیلؔ سہسرامی کا پہلا مجموعہ کلام ''آوارجہ'' کے نام سے ۲۰۱۷ء میں چھپا تھا۔ ۲۶۴ صفحات پر مشتمل اس مجموعہ غزل کا ''انتساب'' تمام متشاعروں کے نام ہے اور ''کلمات خویش'' کے تحت انہوں نے غزلیہ شاعری کے تعلق سے لکھا ہے کہ:

''غزل کی شاعری میں خصوصیت کے ساتھ لہجے کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور لہجہ کی شناخت کے لئے محنتوں کے دو راستے ہیں، ایک تو یہ کہ زیادہ سے زیادہ علمی زور آزمائی ہو اور فضیلت فروشی کے انداز میں یا جدت پسندی کے شوق میں خود کو غریق مئے لفظیات بنا دیا جائے، بیش از بیش کتابی زبان سے کام لیا جائے اور دور از کار علامات و استعارات، خودرو پودوں کی مانند یوں قدم قدم پر پھیلا دئے جائیں کہ ترسیل و ابلاغ نہیں بلکہ صرف اس کے المیے ہی المیے رہ جائیں اور کوئی کلمہ تعوذ قاری کو اس عفریت کے شکنجوں سے پناہ نہ دے سکے۔ اس کے برخلاف لہجے کی پہچان بنانے کے لئے مشق و ممارست کا دوسرا راستہ اور شاید سب سے کامیاب، فطری اور مفید راستہ یہ ہے کہ 'غزل گفتن' کے اُس بنیادی تقاضے سے کبھی سرمو انحراف کا تصور بھی نہ آنے دیا جائے جو 'طرز تکلم' سے عبارت ہے۔ بول چال کی زبان میں بہر حال سادگی ہوتی ہے اور وہ فطری طور پر شخصی لہجے کو ابھرنے اور انفرادیت پا لینے کی ڈگر پر جلد سے جلد لے آتی ہے۔ مشکل پسندی کے ممکن ہے، متنوع فوائد بھی ہوں، مگر مقبولیت اس کے حصے کی چیز کبھی نہیں رہی ہے۔ فنی اصولیات اور لسانیاتی مزیات کا احترام اپنی جگہ، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے، مصنوعی زبان اور سخت عروضی بندشیں، افکار و نظریات کی کماحقہ اور مقصدی پیشکش میں یک گونہ سدراہ ضرور بنتی ہیں اور پھر کچھ ذوق زمانہ کے اپنے تقاضے بھی ہوتے ہیں۔ خالص تکنیکی اور سائنسی عہد میں بہت ساری روایتی فنی موشگافیوں سے دامن بچا لینا ہی قرین عقل و خرد ہے اور میں نے بھی غزل کی شاعری سے واسطہ رکھتے ہوئے کچھ ایسا ہی طریق کار اپنایا ہے، جہاں تک اسلوب بیان کی بات ہے، میں نے واضح شعور کے ساتھ، روش عام سے ذرا ہٹ کر سہی، مگر ٹھکرائے ہوئے لفظوں کو دانستہ طور پر گلے لگایا ہے۔''

''آوارجہ'' کی اشاعت کے دو سال بعد ۲۰۱۹ء میں شکیلؔ سہسرامی کے دوسرے مجموعہ ''نظافت سخن'' کی اشاعت ہوئی جس کا انتساب انہوں نے ''عزت مآب والدین کے نام'' کیا ہے۔ ۱۶۰ صفحات پر محتوی یہ مجموعہ اَصلاً تقدیسی کلام کا مجموعہ ہے جس میں ''حمد و مناجات'' اور نعوت پاک کے بعد ایک منقبت اور ایک نظم کی شمولیت ہوئی ہے۔ منقبت حضرت احمد رضا بریلوی کی شان میں ہے اور نظم کا عنوان ہے۔ ''ماہ صیام'' شکیلؔ سہسرامی اصلاً غزل گوئی کے ساتھ ساتھ متنوع اصنافِ نظم سے شغف رکھتے تھے اور موقتی کلام بھی خوب کہتے تھے۔ اگر ایک طرف ''آوارجہ'' کی غزلیں روایتی اور جدید موضوعات کی حامل ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ دوسری طرف ''نظافت سخن'' کی شاعری بھی یہ بتانے میں کامیاب ہے کہ حمد و نعت اور منقبت کو دیگر اصنافِ سخن کے مقابلے میں وہ نظافت سخن کا درجہ دیتے تھے۔ شکیل سہسرامی نے اپنے اس دوسرے مجموعہ کے ''عرض احوال'' میں مذہبی و تقدیسی شاعری کے متعلق وضاحت و صراحت سے لکھا ہے کہ:

''مذہبی شاعری کا معاملہ، خصوصاً نعت گوئی کا معاملہ تو کسی بھی شاعر کے حوالے سے بس اتنا ہی ہوتا ہے کہ جس کی پرواز

حمدیہ اشعار

یہ آب و گل ہے اُسی کے، یہ خاک داں اُسی کا — زمیں ہے قدموں میں اور سر پر آسماں
وہی ہے قادرِ مطلق، ہر ایک شئے اُس کی — مکیں اُسی کے، مکاں اُس کا لامکاں اُس کا
بحر و بر کی بیکرانی ہے خدائے پاک کی — یہ بلندی آسمانی ہے خدائے پاک کی
مجھے یقیں ہے کسی فکر میں نہ ڈالے گا — خدا خدا ہے کوئی راستہ نکالے گا

جہاں تک تھی وہاں تک پہنچا۔ یہاں اس لحاظ سے کوئی چھوٹا یا بڑا کہاں ہوتا ہے کہ حمد ونعت لکھتے اور پڑھتے ہوئے سبھی اللہ ورسول کے دربار میں، اس کی نگاہِ کرم کے متمنی بن کر دست بستہ کھڑے رہتے ہیں اور منقبت لکھتے ہوئے گویا صاحب منقبت کے حضور میں ان کی پیشی ہوتی ہے۔ دنیا کے نظام کی ظاہری صورتیں الگ ٹھہریں، ورنہ حمد ونعت اور بزرگوں کی منقبت کے نیک شغل وعمل کا صلہ نہ تو دنیا سے مانگا جاسکتا ہے اور نہ ہی دنیا کی کوئی طاقت اس کا صلہ دے سکتی ہے۔ اس کارِ سخن کی توفیق مل جانا ہی بہت ہے اور اس کے آگے بس دعا پر آمین ثم آمین کہنے کی منزل آتی ہے کہ خصوصیت سے آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں اسے قبولیت مل جائے۔ جہاں تک نعتیہ شاعری کا معاملہ ہے، بیشک یہ دودھاری تلواری تلوار پر چلنے کے مصداق ہے۔ یہاں شریعت اور شعریت، عقیدت اور عقدیت نیز عروضیات ولسانیات کے اپنے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور انسان کے لئے بس اتنا ہی ہے کہ وہ طاقت بشری کی حد تک ان تقاضوں کی تکمیل کے لئے کوشش کرتا رہے اور ہر لحہ آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد مانگتا رہے۔''

''نظافت سخن'' کے بعد شکیل سہسرامی کا تیسرا مجموعہ ''ابر سخن'' کے نام سے ۲۰۲۴ء میں شائع ہوا۔ ۱۷۶ صفحات کے اس مجموعہ کا انتساب انہوں نے ''تمام لوگوں کے شوق شاعری کے نام'' کیا ہے اس مجموعہ میں حمد ومناجات اور نعت ومنقبت کے بعد ۲۲ غزلیں دی گئی ہیں۔ ان میں پہلی غزل ''آوارجہ'' کی ردیف میں ہے جو اُن کے پہلے مجموعہ کلام کے نام سے اپنی نسبت دکھاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس مجموعہ کی اس پہلی غزل سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غزل مسلسل کے فنکار کی حیثیت سے بھی کم مرتبہ نہ تھے۔ ''آوارجہ'' جیسے نسبتاً کم معروف اور انتہائی حد تک کم مستعمل لفظ کو ردیف کی جگہ دیتے ہوئے گویا اس غزل کے پردے میں انہوں نے بہ قلم خویش، اپنی ذات کے احتساب کا مضمون آئینہ کر دیا ہے جو یقیناً ان کے مزاج اور ان کی شخصیت کو شاعرانہ زبان میں سمجھنے کے فائدے دیتا ہے۔ بقول شاعر تنہائی میں اپنا احتساب حیات وعمل، دانشوری کا تقاضا بھی ہے اور اصل دانشوروں کا معمول بھی۔ اس غزل کے بعض اشعار کلمہ ردیف کے حوالے سے جہاں مبالغہ وتضاد، حسن ترکیب وتکرار اور ازیں قبیل دیگر صناعات سخن کے حامل ہیں، وہیں ان میں خوبصورت استعاراتی زبان کے ساتھ بالواسطہ یہ پیغام بھی ہے کہ انہماک ویکسوئی کے ساتھ احتساب نفس میں لگے رہنا اور اس کے نتائج یاد رکھنا بہر حال باعث مسرت وبصیرت ہے اور اس کے لئے زبان قال تو کیا، زبان حال بھی لازمی نہیں بلکہ یہاں دل سے دل کا اعتبار ہی کافی ہے۔ ''غزلیات'' کے بعد ''ابر سخن'' میں ''نظمیات'' کے تحت ۱۷ نظمیں ہیں جن میں پہلی نظم ''شیر شاہ'' کے عنوان سے ہے۔ ''نظمیات'' کے بعد اس مجموعہ میں ''مرحومیات'' کے ذیل میں متعدد تعزیتی نظموں نے جگہ پائی، ہے، جسے انہوں نے ''کرونائی شاعری کا حصہ'' اور ''ابر سخن کے آنسو'' کہا ہے اور تا ثیر سخن کے تعلق سے ''گفتنی'' کے تحت لکھا ہے کہ:

''شاعری کی تاثیر اور قوت کا ایک زمانہ معترف ہے۔ بیشک شاعری رعد وبرق بھی ہے اور ابر وباراں بھی ہے۔ یہ ہمیشہ اپنی زمین وزبان اور اپنے زمان ومکان سے جڑی ہوتی ہے اور بصد لطافت ونزاکت انفس وآفاق سے عہد وماحول کے مطابق اپنا

نعتیہ اشعار

یا محمد مصطفیٰ خیرالبشر صل اعلیٰ — کوئی بھی ثانی نہیں ہے آپ کے کردار کا
زمانے کو برا کہنا بری عادت ہے لوگوں کی — خدا کا باغ ہے دنیا نبی کی باغبانی ہے
نہیں ذرہ برابر بھی رعونت ان کی سیرت میں — معیشت میں بھی آقا کی نبوت جگمگاتی ہے
سیرت صل علیٰ میں کامیابی ہے شکیلؔ — پاک رہنا ہے ہمیں بد کام سارا چھوڑ کر

تازہ بہ تازہ رشتہ محکم بناتی چلی جاتی ہے۔ یہ رعدو برق ہے کہ جب گرجتی ہے تو یوانِ ستم کے بام ودَر ہلنے لگتے ہیں، جب چمکتی ہے تو عقل وخرد کی آنکھیں خیرہ ہوجاتی ہیں اور جب برروئے زمیں آتی ہے تو خرمن ستم چشم زدن میں خاکستر ہوجاتا ہے۔ یہ ابروباراں ہے کہ جب آندھی بن کر اُٹھتی ہے تو منفی افکار کے تناور درخت اس کی زد میں آکر اپنی جڑوں سے ہمیشہ کے لئے اکھڑ جاتے ہیں اور جب ہلکی ہلکی خنک ہواؤں کا روپ لیتی ہے تو ہر طرف انس ومحبت کی پھواریں پڑنے لگتی ہیں اور پوری حیات و کائنات سرشاری وسرمستی کی فضاؤں میں ڈوب جاتی ہے۔ یہ وہ ابرنیساں ہے کہ برستا ہے تو کشت پژمردہ لہلہا اُٹھتی ہے، یہ وہ کیف باراں ہے کہ سیلاب بن جائے تو نہ جانے کتنے باطل اور خود ساختہ افکار ونظریات اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے اور اگر ابرآزری اور ساون کی رُت بن کر آئے تو علم وفن کی نہ جانے کتنی ہی کھیتیاں سیراب کرجاتا اور انہیں سرسبز وشاداب بنا جاتا ہے۔ ابرسخن جب کشت تقدس کی طرف آتا ہے تو حمد ومناجات، نعت ومنقبت اور توصیف وتحسین کے گلزار دمکنے لگتے ہیں، جب تعشق کی کھیتی پر برستا ہے تو گلہائے غزل کھل اُٹھتے ہیں، تصوف وعرفان کی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں، فلسفہ کی ٹہنیاں جھوم جھوم اُٹھتی ہیں اور ماحول ومعاشرے کا انگ انگ کبھی دمکنے لگتا، کبھی دُکھنے لگتا اور کبھی دہکنے لگتا ہے۔ حیات وکائنات کے حوالے سے یہ ابرسخن جب کشف تفکر پر برستا ہے تو نظم کے گل بوٹے یوں کھلتے ہیں کہ دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جائیں۔ ابرسخن کا وصف حیطہ تحریر میں آئے بھی تو بھلا کیوں کر کہ یہ بادل بولتا ہے تو حرف وصوت کی نت نئی دنیا آباد ہونے لگتی ہے۔ احساسات وجذبات بول اُٹھتے ہیں اور تجربات، مشاہدات اور مطالعات کو زبان ملنے لگتی ہے۔ اس کی آواز بچوں کو خوشنما چہکار کی طرف بلاتی ہے، نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز کردیتی ہے اور بوڑھوں کو نئے حوصلے دے جاتی ہے۔ مسرتوں کے نغمے ہر طرف بکھر جاتے ہیں اور غمزدہ دلوں کے لئے تسکین وطمانیت اور آس واُمید کی راہیں وا ہونے لگتی ہیں، ذہن کے بند دریچے کھل جاتے ہیں اور دلوں کی فسردگی شگفتگی میں بدلنے لگتی ہے، تاریخ وتعلیم کے اسباق عام ہونے لگتے ہیں اور بلاغت ومعانی اور اوزان وقوافی کے غنچے اپنی طرف موجہ کرلیتے ہیں۔ امکانات، ترجیحات، تحفظات اور خدشات وخواہشات کو گویائی میسر آجاتی ہے۔ زندوں کا ذکر کیا ابرسخن جب برستا ہے تو مردوں کے لئے بھی بصورت دعا راحت ومغفرت کا وسیلہ بن جاتا ہے۔''

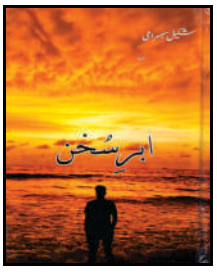

شکیل سہسرامی کی مذکورہ تینوں کتابوں خصوصاً اُن کی تیسری کتاب سے ماخوذ، درج بالا اقتباس یقیناً یہ احساس دلاتا ہے کہ وہ شاعری کے ساتھ ساتھ مرصع نثر

مطالعۂ شکیل

اس شہر سیہ کار میں مے نوش بہت ہیں — دولت کے نشہ میں یہاں مدہوش بہت ہیں
زندگی کھونے کو ہے اور موت پانے کے لئے — آدمی پیدا ہوا ہے لوٹ جانے کے لئے
ضبط گریہ سے گزر گاہِ نفس جلتی ہے — ہجر کے قہر سے دیوارِ قفس جلتی ہے
نہ تھک کے بیٹھ کہ تیرا سفر ادھورا ہے — زمین تنگ ہوئی ، آسمان پورا ہے
ختم سفر قریب ہے ساحل قریب ہے — آگے قدم بڑھایئے منزل قریب ہے
کیا بہترین ہائے مرے دل کا حال تھا — جب خوشبوؤں میں غرق تمہارا خیال تھا
کھو چکا ہے اپنا یارا یہ کہانی پھر سہی — اک سکندر ، ایک دارا یہ کہانی پھر سہی

لکھنے کی بھی بے پناہ صلاحیت رکھتے تھے۔ایک طرف انہوں نے ہیئتی اور موضوعاتی شاعری کی، بڑوں کے لئے ہی نہیں، بچوں کے لئے بھی لکھا اور سنجیدہ کلام کے علاوہ طنزیہ ومزاحیہ کلام سے بھی نوازتے رہے اور اپنی ارتجال گوئی اور بدیہہ گوئی کی صلاحیتوں کا زمانے کو معترف بناتے رہے تو دوسری طرف انہوں نے متعدد کتابوں پر تجزیاتی تبصرے بھی قلم بند کئے۔قریبی اطلاع کے مطابق اُن کے تبصروں کا مجموعہ بھی اشاعت کے لئے پریس کے حوالے ہوا چاہتا تھا،مگر افسوس کہ زندگی نے انہیں مہلت نہیں دیا۔شکیلؔ سہسرامی اکادمی مجلّہ ''زبان وادب'' کے دیرینہ قلمی محسنین میں تھے۔ان کا حمدیہ کلام اکادمی مجلّہ مارچ ۲۰۲۵ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

وہی سکون وہی تو قرار دیتا ہے — خزاں گزار کے فصل بہار دیتا ہے
چمکتے چاند کی اور تابناک سورج کی — زمیں پہ روشنی وہ ہی اُتار دیتا ہے
وہی تو بندۂ مجبور کو جہاں والو! — جو چاہتا ہے یہاں اختیار دیتا ہے
اُسی کے فضل پہ موقوف ساری راحت ہے — گناہگار کو وہ ہی نکھار دیتا ہے
اُسی کا کام ہے کرنا ذلیل گندوں کو — وہی ہر ایک کو عز و وقار دیتا ہے
وہی امیر کو دیتا ہے مرغ و ماہی بھی — وہی غریب کو چٹنی اچار دیتا ہے
بگاڑتا ہے وہی دن بھی بادشاہوں کے — وہی فقیر کی قسمت سنوار دیتا ہے

حقیقت یہ ہے کہ شکیلؔ سہسرامی کا یہ حمدیہ کلام ہی نہیں، بلکہ ان کی شاعری کے بیشتر تحائف ان کے فکری وفنی مرتبہ کی شہادت دیتے ہیں۔اس تعزیتی شذرہ کے ساتھ صفحہ بہ صفحہ اُن کے چند اشعار بھی شامل ہیں۔ان میں ''حمدیہ اشعار'' کی طرف دیکھا جائے تو جہاں موضوع ومضمون کے دوش بدوش ان میں شاعرانہ صنعتوں کا حسن استعمال ملتا ہے، وہیں خدائے پاک کی مہربانی پر یقین کامل کے راسخ عقیدے کا اظہار بھی ہے،اسی طرح یہاں مشمولہ ''نعتیہ اشعار'' سے بھی شکیلؔ سہسرامی کے وہ عقیدے آشکار ہوجاتے ہیں جن میں ''ندائے رسول'' کا اقرار ہے،ان پر درود وسلام ہے اور رسول رحمت کی سیرت اپنانے کا پیغام ہے۔اتنا ہی نہیں بلکہ ان کے خوبصورت ''مطالع'' غزل کی طرف دیکھیں تو ان میں بھی ''شہر سیہ کار'' کی عکاسی، موت وحیات کا فلسفہ، حوصلوں کو سنبھالے رکھنے کا پیغام اور رومانی دور کی یادوں کا حوالہ موجود ہے اور ان کے مشمولہ ''مقاطع'' غزل پر نظر ڈالیں تو ان میں بھی سفاک عصری حقائق، طنز لطیف اور مستند حوالہ کے ساتھ اخلاقی مضامین کی کوئی کمی نہیں۔شکیلؔ سہسرامی رخصت ہوئے، انہوں نے در پردہ زمانے کی شخصیت فراموشی دکھانے کے لئے ''مرگیا ہوں تو.....'' کے ٹکڑے سے جو غذا لی ہے وہ اپنی جگہ، بیشک وہ ''دفنادئے گئے'' مگر ان کی شاعری کے حوالے سے ان کی یادوں کو دفنانا تادیر ممکن نہیں۔ ❁❁

مقاطع شکیلؔ

فکر ہوتی ہے سیاحت کی تو نگر کو شکیلؔ — ہم غریبوں کی کمانے پہ نظر رہتی ہے
منھ اپنا بے وفائی چھپانے لگی شکیلؔ — ہم نے وفا کی رسم نبھائی کچھ اس طرح
یہ امتحان بھی کتنا عجیب سا ہے شکیلؔ — دوائے دل بھی ہمیں درد ہی سے ملتا ہے
شیخ سعدیؔ نے کہا ہے اے شکیلؔ — علم مت دینا کسی کم ظرف کو
فرق آیا نہ ذرا دل کی سیاہی پہ شکیلؔ — اُس نے زم زم بھی پیا گنگا میں اسنان کیا
خاموشی ہے واقعی بہتر شکیلؔ — بات بڑھ جاتی ہے اکثر بات پر
مر گیا ہوں تو گوارا نہیں شکیلؔ — کتنی جلدی ہے ذرا دیکھئے دفنانے کی

☆ ''زبان وادب'' بابت جولائی ۲۰۲۵ء کافی انتظار کے بعد ملا۔ یہ شکایت اپنی جگہ، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ جب ملا تو دل باغ باغ ہوگیا، اس شمارے کا سرورق حضرت نوحؔ ناروی کی صندلی نشین تصویر اور ''سفینۂ نوحؔ'' و ''طوفان نوحؔ'' کے عکوس سے مزین ہے تو پس ورق پر اُن کے نواسے مشہور جاسوسی ناول نگار ابن صفی کی تصویر ''دلیر مجرم''، ''ڈیڑھ متوالے''، ''خطرناک جواری'' اور ''چیختی روحیں'' کے عکس سمیت اپنی بہاریں دکھارہی ہے۔ واقعی اس شمارے میں یوں نانا اور نواسے کے تذکرے کی یکجائی بہت خوب ہے۔ پہلے اندرونی سرورق پر اسرارؔ جامعی کی تصویر، مختصر سوانح اور ان کی نظموں کے اقتباس سے آپ نے ہماری ضیافت کی ہے اور دوسرے اندرونی سرورق پر یہی ضیافت حیرتؔ فرخ آبادی کی تصویر، سوانح اور اشعار کے ساتھ ہوئی ہے اور یہ سب بس آپ کی صحافتی محنتوں ہی کا ثمرہ وصدقہ ہے۔ اداریہ ''حرف آغاز'' ہمیشہ کی طرح اس بار بھی شمارے کے مشمولات کا کامیاب و جامع شناس نامہ بن کر آیا ہے۔ ''مقالات'' کے حصہ میں پروفیسر فاروق احمد صدیقی کے قلم سے حضرت صباؔ نقوی کے حمدیہ و نعتیہ کلام کا مدلل مطالعہ بہت ہی مبسوط اور جامع ہے۔ البتہ اس حصہ میں ذاتی طور پر مجھے جس مقالے نے ہمہ صورت متوجہ رکھا اور متاثر کیا، وہ آغا حشر کاشمیری کے ڈرامہ ''سلور کنگ'' پر ڈاکٹر نظیر حسین خاں کا مقالہ ہے۔ اس میں واقعی موضوع ومواد کی ندرت ہے، کہنا چاہئے کہ یہاں خاں صاحب نے صرف سرخی ہی نہیں جمائی ہے بلکہ ''سلور کنگ'' کو سرتاپا تکنیکی خامیوں کے ساتھ سامنے لادیا ہے۔ اس نوعیت کے مقالے بس کبھی کبھی ہی، کہیں کہیں پڑھنے کو ملتے ہیں۔ پروفیسر قمر جہاں کے مجموعہ ''حرف آگہی'' پر ڈاکٹر یاسمین اختر کا مضمون بھی اچھا ہے اور ڈاکٹر ندیم احمد بھی ''اردو ادب میں ہندوستانی علم و اساطیر کا سحر'' دکھانے میں کامیاب نظر آئے بس یہ کہ تکرار بیان سے ذرا اور بچنے کی ضرورت تھی اور رہی بات ''نوحؔ ناروی اور ان کی شاعری'' پر نجم الزماں کے مقالے کی تو دیگر خوبیوں کے ساتھ اس میں خصوصی حوالے کی شمولیت کا التزام انہیں مبارکباد دینے پر مجھے بار بار رغبت دلا رہا ہے۔ اب آئیں ''ابن صفی'' کی طرف! یہاں محترمہ درخشاں جبیں کا مقالہ کیا، یہ تو ''ابن صفی اور ان کے جاسوسی ناول'' پر ایک منی مونوگراف یا مختصر ترین فرد نامہ کہلانے کا حقدار ہے۔ ایک دور میں، میں نے ابن صفی کے جاسوسی ناول بہت پڑھا ہے۔ کبھی خوب دل لگتا تھا اور کبھی ایسا ہوتا کہ پڑھتے پڑھتے اچانک طبیعت اُچاٹ ہوجاتی اور دلچسپی اکتاہٹ میں بدلنے لگتی، مگر اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی اور بس خود کو ہی ذمہ دار ٹھہرا کر رہ جانا پڑتا تھا۔ برسہابرس کے بعد اب اس مضمون کے مطالعہ سے یہ راز کھلا کہ فنی طور پر اس کے ذمہ دار ''جاسوسی دنیا میں کام آنے والے خاص خاص ٹولس'' ہیں۔ جناب منیرؔ سیفی کے قلم سے ''قطعات تاریخ وفات ابن صفی'' بھی ایک فنی تحفہ محسوس ہوا اور اسی کے طفیل یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ابن صفی کی وفات ہجری تقویم کے بموجب ۱۳ رمضان ۱۴۰۰ھ کو ہوئی تھی۔ اس حصہ میں یادگار دستاویزی تصویروں اور ناولوں کے عکسی سرورق کی جو شمولیت ہے، وہ تو اپنی جگہ، اسی کے ساتھ ساتھ ''ایک یادگار مشاعرہ'' اور ''غزل'' یعنی طغرل فرغان کے نام سے ابن صفی کے مضمون اور پھر اُن کی شاعری کا نمونہ شامل ہوجانے سے مجموعی طور پر اس حصہ کی جامعیت اور بھی بڑھ گئی۔ اس شمارے کے ''افسانے'' اور ''انشائیہ'' کا حصہ بھی خاصا پر بہار ہے۔ یہ بڑی اچھی بات ہے کہ رسالہ میں ایسی کہانیاں عام طور سے جگہ پاتی ہیں جن میں کہانی کاری کا ہنر ہی نہیں، فکر و پیام بھی پنہاں ہوتا ہے۔ عشرت ظہیر کی کہانی ''احساس کے ویرانے میں'' یوں بہت پسند آئی کہ اس میں ایک سیماب صفت آدمی کی اپنی نفسیات بڑی ہی ادا کے ساتھ برہنہ ہوگئی ہے اور اسے خاموشی سے برہنہ کردینے کا سہرا، اس کی بیوی کے ایک سوالیہ جملہ کے سر ہے اور پھر ڈاکٹر محمد نہال افروز کی کہانی ''کھوئی

ہوئی شناخت'' کا کیا کہنا، یہ تو تانیثی رجحان کی سنجیدہ وعملی نمائندہ کہانی کہلانے کی حقدار ہے۔ اس میں نہ صرف بہو بننے کے بعد بلکہ ایک بیٹی کی ماں ہو جانے کے بعد بھی ایک گریجویٹ لڑکی کا جذبہ، اس کی سوچ اور اس کی ہمت سچ مچ ایک نمونہ کے مصداق کہی جاسکتی ہے۔ کہانی میں ذرا سی طوالت تو ہے، لیکن اس کی بافت بہت ہی عمدہ ہے۔ ایس معشوق احمد کے انشائیہ ''آؤ چائے پیو'' میں گلگشت خیال کے ساتھ ساتھ جیسا کہ آپ نے لکھا ہے، واقعی ''اخلاق کے پیچھے چھپے احوال متوجہ'' کر لیتے ہیں۔ ''گاہے گاہے باز خواں'' کی دونوں تحریریں نایاب ادبی تبرک کہلانے کی حقدار ہیں اور بہت ہی چشم کشا۔ سہیل عظیم آبادی کی کہانی ''الاؤ'' اور اس پر لکھے گئے تنقیدی مضامین تو عام ہیں، البتہ اس شمارے میں سہیل عظیم آبادی کی ''کہانیوں کی کہانی'' پڑھ کر اس کا تخلیقی پس منظر معلوم ہوا اور یہ بھی کہ کہانی کے ''قطرے'' کو ''گہر'' ہونے تک تخلیق کار پر کیا کیا گزرتی ہے اور وہ کیسے کیسے کرب کا سامنا کرتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب خطوط پر مشتمل افسانے لکھے جاتے تھے، مگر اس کی مقبولیت کو لمبی عمر نہیں ملی۔ اس کی وجہ جو بھی ہو، مگر اس میں دورائے نہیں کہ اس نوعیت کے جو افسانے لکھے گئے ہیں، ان میں بہار کے قلم کاروں کا کامیاب تحفہ بھی شامل ہے۔ وہاب اشرفی اگرچہ افسانہ نگاری کی طرف سے جلد ہی لوٹ گئے، مگر ان کی کہانی ''گرگٹ کے خطوط'' پڑھتے ہوئے جسے آپ نے تقریباً ۶۲ سال بعد چھاپا ہے، کئی دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی احساس ہوتا رہا کہ کسی دور میں ہمارے کیسے کیسے حقیقت نگار ادیب موجود تھے جنہیں وقت نے ہمیشہ کے لئے ہماری دنیا سے اُٹھا دیا اور اب ان کے بدل کیا، قریب البدل کی تلاش بھی جوئے شیر کی تلاش ہی لگ رہی ہے۔ اس شمارے کا منظوماتی حصہ بھی حسب روایت بہت پسندیدہ ہے، ڈاکٹر محمد مظاہر الحق کی کتاب ''ہمارے تبصرے'' پر پروفیسر ڈاکٹر توقیر عالم کا تبصرہ بھی متوازن ہے اور ڈاکٹر بانو سرتاج کی کتاب ''چھوٹی سی گڑیا کی چھوٹی کہانی'' پر جناب محمد غفران کا تبصرہ بھی بہت عمدہ، کامیاب اور معلوماتی ہے۔ شاید تکنیکی سبب سے ایسا نہ ہو سکے، ورنہ بچوں کی کتابوں پر ''بچوں کا زبان وادب'' میں تبصرے چھپتے تو زیادہ فائدہ دیتے، بچوں میں مزید شوق جاگتا اور ان کی جانکاری بڑھتی۔ اس شمارے میں بچوں کے لئے جو چیزیں شامل ہیں ان میں آثر لکھنوی کی ''پیامی غزل'' کے ساتھ ساتھ جناب محمد ریحان کا مضمون ''وقت کا احساس پرندوں اور پودوں میں'' خاص طور سے متوجہ کر گیا۔

خط کی طوالت کے لئے معذرت چاہتے ہوئے خدا حافظ

(ڈاکٹر) طاہر الدین، مظفر پور

☆ جولائی ۲۰۲۵ء کا ''زبان وادب'' نظر نواز ہوا۔ ''مقالات'' کے تحت ڈاکٹر نظیر حسین خاں کا مقالہ ''سلورکنگ تخلیقی خامیوں کے ساتھ'' حاصل شمارہ ہے اور پھر جناب نجم الزماں کا مقالہ ''نوح ناروی اور ان کی شاعری''۔ ژرف نگاہی سے متن کے سطر بہ سطر راست مطالعہ کے حوصلے نے اوّل الذکر مقالے کو اور جامعیت کا خیال رکھتے ہوئے کچھ نئے اور کمیاب حوالوں کی تلاش وپیش کش نے ثانی الذکر مقالے کو علمی تازہ کاری کے لحاظ سے کافی وقیع بنا دیا ہے۔ ''ابن صفی'' کے تحت جو کچھ ہے دستاویزی ہے۔ حق یہی ہے کہ محترمہ درخشاں جبیں نے ''ابن صفی اور ان کے جاسوسی ناول'' پر لکھنے کا گویا حق ادا کر دیا ہے اس میں جو معلوماتی وسعت اور تنقیدی وتجزیاتی مطالعہ کی جو رونق ورمق مل رہی ہے اس کے لئے اُن کا بار بار شکریہ! یہ فنی نقطہ نظر سے ابن صفی کے ناولوں کو براہ راست پڑھ کر لکھا ہوا مقالہ ہے اور اسی لئے بہت کامیاب ہے۔ جناب منیر سیفی فن تاریخ گوئی کے معاصر ماہرین میں ہیں اور ''قطعات تاریخ وفات ابن صفی'' میں اُن کی ممارست کے جوہر کھل کر سامنے آرہے ہیں۔ اس حصہ میں منتخبات کے طور پر طغرل فرغان یعنی ابن صفی کا مزاحیہ مضمون ''ایک یادگار مشاعرہ'' نہ صرف بہت خوب ومرغوب ہے بلکہ اس دور میں باعث عبرت بھی ہے اور باعث حسرت بھی۔ ابن صفی کی غزل کا آخری شعر ؎

کتنی ہی زہر میں ڈوبی ہوئی رکھتی ہو زباں
پھر بھی نازش گل ، غنچہ دہن ہوتی ہے

پڑھ کر غالبؔ کا ''کتنے شیریں ہیں ترے لب کہ رقیب'' والا شعر یاد آنے لگا اور یہ بھی خیال آیا کہ وہاں ''گالیاں'' تھیں اور یہاں گویا کوسنے ہی کوسنے اور طعنے ہی طعنے ہیں۔ ''افسانے'' کے تحت ''کھوئی ہوئی شناخت'' (ڈاکٹر محمد نہال افروز) میں شناخت گم گشتہ کو پانے کا جذبہ اور ہنر خصوصیت سے باعث کشش بنتا رہا۔ ''گاہے گاہے باز خواں'' کے تحت ''کہانیوں کی کہانی'' ہو یا ''گرگٹ کے خطوط'' بس پڑھنے سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں جو بہت کچھ سوچنے، سمجھنے، جاننے اور سیکھنے کا موقع ہی نہیں دے رہی ہیں بلکہ آپ کے حسن انتخاب کا بھی معترف بنا رہی ہیں۔ ''منظومات'' میں پروفیسر علیم اللہ حالیؔ کا ''صبا کو ایک مشورہ'' اور علی شاہد دلکشؔ کا ''آئینہ'' ہی نہیں، مدہوشؔ بلگرامی، سیفیؔ سرونجی، مصداقؔ اعظمی، عمرانؔ عظیم، سرورؔ نگینوی، مشتاقؔ سیوانی اور سید عمانؔ حسین کی غزلیں بھی متاثر کر گئیں۔ اس بار ''بچوں کا زبان وادب'' بھی بچوں کے ذوق کی رعایت کے ساتھ ''ریچھ کے بچے''، ''راز کی بات'' (سردار عرفان) ''چور پر مور'' (سراج فاروقی) اور ''چوہا اور چمگادڑ'' (فرزانہ اسد) جیسی کہانیوں سے خوب سجا سجایا ہے۔ اس حصہ کی ''پیامی غزل'' (اثرؔ لکھنوی) بھی بچوں کے لئے تحریکی ذہن اور فضا بنا رہی ہے اور محمد ریحان کا مضمون ''وقت کا احساس پرندوں اور پودوں میں'' بھی دلچسپ طریقے سے بہت کچھ سیکھنے، سمجھنے اور دھیان دینے کی طرف بلا رہا ہے۔

سیدہ حشمت آرا، بھوجپور

☆ ''زبان وادب'' جولائی ۲۰۲۵ء ملا۔ ''دیر آید'' کا شکوہ میرا حق ہے تو ''درست آید'' کا اعتراف بھی میرا فرض ہے۔ اپنے شکوے کو طول کیا دوں، البتہ اپنے تاثراتی اظہار کا فریضہ ادا کرتے ہوئے اور اس شمارے کے بارے میں یہ لکھنے سے خود کو روک نہیں پا رہا ہوں کہ ایسا جامع صفات شمارہ کم کم ہی مطالعہ کی میز پر آتا ہے۔ یہ لوح سے تمت تک صرف صوری حسن ہی نہیں رکھتا، بلکہ معنوی حسن و معیار سے بھی پوری طرح آراستہ ہے۔ یہ بڑی بات ہے کہ آپ تصاویر اور عکس دیتے ہیں تو نہ صرف ندرت کا خیال رکھتے ہیں بلکہ ماخذات کے حوالوں سے اُسے دستاویزی بھی بنا دیتے ہیں۔ اس شمارے میں نوحؔ ناروی کی تصویر ہو یا ابن صفی کی تصویر، بہر حال اس کا بین ثبوت ہے۔ اس طرح گویا انٹرنیٹ پر موجود مواد میں یوں کہیں کہ ایک طرح کا اضافہ ہو جاتا ہے اور مزید تحقیقی رونق بھی آجاتی ہے۔ ''مقالات'' کے حصہ میں دیگر مشمولات کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر نظیر حسین خاں کی کاوش بہت ہی خاص ہے۔ آغا حشر کاشمیری کے ڈرامہ ''سلور کنگ'' کی تکنیکی خامیاں ڈھونڈ نکالنا، کچھ آسان نہ تھا، مگر اپنی محنتوں سے انہوں نے اس موضوع کو محاورتاً نہیں حقیقتاً پانی کر دیا ہے، مگر ایک بات کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ کہیں کہیں خامیوں کی تلاش کا جذبہ خردہ گیری بننے لگا ہے۔ اس حصہ میں حضرت نوحؔ ناروی پر جناب نجم الزماں نے بھی اگر چہ مختصر مگر اچھا مقالہ لکھا ہے اور ''ابن صفی'' والا حصہ تو گویا اس شمارے کی جان ہے۔ محترمہ درخشاں جبیں نے ''ابن صفی اور ان کے جاسوسی ناول'' پر قلم کیا اُٹھایا ہے، کہنے دیجئے کہ اس موضوع پر ایک ایسا کتابچہ ہی لکھ دیا ہے جو سبھی پہلو کو محیط ہے اور اگر ایک رُخ یعنی تاریخ گوئی کے رُخ سے کچھ بات رہی جاتی تھی تو اس کی بھرپائی جناب منیرؔ سیفی کے قلم سے ہوگئی ہے۔ زیر نظر شمارے کا نثری و شعری تخلیقی مواد بھی بہت پسند آیا اور ان کے بارے میں بطور تعارف آپ کی ادارتی رائے بھی یقینی طور پر معتدل اور باوزن ہے۔ کتابوں پر تبصرے بھی انہیں آئینہ کر دینے میں ناکام نہیں۔ بچوں کا حصہ بھی تحریر و تصویر دونوں لحاظ سے معیاری اور مقصدی ہے۔

سلمان شاہد، لکھنؤ

☆ جولائی ۲۰۲۵ء کا ''زبان و ادب'' ملا۔ اس مرتبہ بچوں کے حصے کی تحریروں کا آغاز دو خوبصورت اور دلچسپ کہانیوں سے ہوا ہے جو سردار عرفان کے قلم کی سوغات ہیں۔ آدمی کی نیت خراب ہوتی ہے تو وہ لالچ اور بے ایمانی پر اُتر آتا ہے اور پھر سونے چاندی کی چمک اُسے کچھ ایسا اندھا بنا دیتی ہے کہ کیا دوستی اور کیا دھرم ایمان، اُسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا، پھر مفلسی بھی تو بری بلا ہے۔ ''ریچھ کے بچے'' کی کہانی سنار اور بڑھئی دو دوست کی کہانی ہے۔ دونوں نے مل کر مندر

سے سونے کی مورتی چرالیا، پھر کیا ہوا، سنار کی نیت میں فتور آ گیا اور وہ اپنے دوست سے ہی غداری کر بیٹھا، پھر آگے کیا ہوا؟ کہانی بتا رہی ہے کہ بڑھئی کی عقل اُس کا سہارا بنی اور قصہ مختصر آخر کار قاضی کی عدالت سے سنار کو سزا ملی اور بڑھئی کو اس کا حصہ۔ انسان کے بچے ''ریچ کے بچے'' کبھی نہیں بن سکتے تو بے ایمانی بھی کبھی ایمانداری میں نہیں بدل سکتی، بلکہ ذلت اور شکست ہی اس کا مقدر ہوا کرتا ہے۔

کہانی ''راز کی بات'' میں قاضی نے جو ترکیب اپنایا ہے، وہ گویا وہی ہے جو آج کے زمانے میں ''سی سی کیمرہ'' لگانے کی ترکیب کہلاتی ہے کہ اس کی مدد سے مجرم پکڑا جاتا ہے بلکہ قاضی کا صندوق تو اس کہانی میں صرف دیکھنے والا کیمرہ ہی نہیں، زندہ بولتا کیمرہ بن گیا ہے کہ اس کی گواہی پر، روپے کی چھپائی ہوئی تھیلی بھی مل گئی اور سنار اور اس کی بیوی کو سزا بھی۔ مطلب یہی ٹھہرا کہ بری نیت اور برے کام کا برا نجام۔ سراج فاورقی کی کہانی ''چور پر مور'' بھی کچھ کم مزیدار اور عبرت ناک نہیں ہے۔ ''چور پر مور پڑنا'' ایک محاورہ ہے یعنی ٹھگوں کو ٹھگنا۔ یہاں کہانی کار نے اسی محاورے سے کہانی کا عنوان لیا ہے۔ دیکھنے اور سوچنے کا معاملہ ہے کہ اپنے وعدے سے مکرنے والے روہن کی فاتحانہ مسکراہٹ، کیسے لمحے بھر میں بدل گئی اور وہ روتا سسکتا بھاگا۔ جس آم کو لئے وہ ساتھیوں کے بیچ اکڑ رہا تھا اور انہیں للچا رہا تھا، بس پل بھر میں وہ کیسے اس کے ہاتھ سے چھن گیا۔ گویا بات یہی ٹھہری کہ سیر پر کوئی سوا سیر ضرور ہوتا ہے اور وعدہ خلافی اور اکڑ کا نتیجہ برا ہی نکلتا ہے۔ اس بار کے شمارے میں آثر لکھنوی کی ''پیامی غزل'' بھی بہت پسندیدہ ہے۔ شاعر نے آخری شعر میں سچ مچ بہت بڑی بات بتا دی ہے کہ چراغ ہی سے چراغ جلتا ہے ؎

بجھتے ہوئے چراغ بھی ہیں کام کے اثرؔ
شمعیں نئی انہیں سے جلاتے چلے چلو

''وقت کا احساس پرندوں اور پودوں میں'' کے عنوان سے محمد ریحان کا مضمون بھی بہت اچھا لگا۔ یہ خاصا معلوماتی بھی ہے اور ہمیں وقت کی اہمیت محسوس کرنے اور اس کی قدر کرنے پر بھی دھیان دلا رہا ہے، پھر اس مضمون کی تصویروں سے جیسی محنت کے ساتھ سجاوٹ کی گئی ہے، اس سے تو گویا اس میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ فرزانہ اسد ''چوہا اور چمگادڑ'' کے عنوان سے نائجیریا کی لوک کہانی کا ترجمہ لے کر آئی ہیں۔ لوک

کہانیوں میں عام طور سے ایک بار کے کسی قصہ کو، کسی بات کی وجہ بتایا جاتا ہے جس کا سائنس سے کچھ لینا دینا نہیں ہوتا، یہاں بھی ایسا ہی ہے، مگر ایک بات ضرور ہے کہ لوک کہانیوں میں کسی نہ کسی طرح زندگی کو سنوارنے والی کوئی بات ضرور چھپی رہتی ہے اور ایسا ہی کچھ یہاں بھی ہے کہ جھوٹ بول کر دھوکہ دینے والے کو زندگی بھر، بلکہ نسل در نسل، سماج سے منھ چھپائے ہی رہنا پڑتا ہے اور وہ اُجالے میں جینے سے ''چمگادڑ'' کی طرح ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاتا ہے۔

''بچوں کا زبان وادب'' اس باریوں بھی کچھ خاص لگا کہ کہانیوں اور مضمون کے بیچ بیچ میں نہایت برجستہ انداز سے مختلف تصویریں ڈال دی گئی ہے، جس سے اس میں نئی جان آ گئی ہے۔

تحریم فاطمہ، مظفر پور

☆ ''زبان وادب'' کا حالیہ شمارہ جون ۲۰۲۵ء دستیاب ہوا، غزلوں کی اشاعت کے لئے ممنون ہوں۔ رسالہ کی اشاعت حالانکہ تاخیر سے ہو رہی ہے، مگر اس کا احساس بالکل ہی نہیں ہوتا، ہر شمارہ پچھلے شمارے سے بڑھ کر ہوا کرتا ہے۔ دیدہ زیب، دلکش اور دلنشیں، مضامین عمدہ، غزلیں معیاری اور افسانے پسندیدہ ہوا کرتے ہیں۔ آپ کے قلم سے ''حرف آغاز'' ہر شمارے میں پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ''بچوں کا زبان وادب'' میں شامل نثری وشعری چیزیں بھی متاثر کرتی ہیں۔

محسن عاعشن حسرت، کلکتہ

☆ ''زبان وادب'' جون ۲۰۲۵ء کا شمارہ ملا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس شمارے میں علاقائی سطح کے دو گمنام قلم کاروں پر تفصیلی مضمون شامل ہے۔ پروفیسر رئیس انور نے پروفیسر اعزاز افضل پر نہایت معلوماتی اور دلچسپ مقالہ تحریر کیا ہے۔ اس مضمون سے اعزاز افضل کی شخصیت

کے مختلف پہلوؤں پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ پروفیسر رئیس انور کے منفرد لب ولہجہ اور طرز نگارش نے اس مضمون کو اور بھی دلکش بنادیا ہے۔واقعی وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔دوسرا لائق تحسین مقالہ ڈاکٹر محمد ولی اللہ قادری کا ہے۔عنایت الرحمٰن عنایتؔ کو اہل چمپارن نے ہی فراموش کردیا۔ یہ صرف چمپارن کا ہی المیہ نہیں ہے بلکہ باہر کے دیگر اضلاع میں بھی کم وبیش یہی صورت حال ہے۔ بہار کے مختلف خطے میں اس طرح کے شاعر اور ادیب مل جائیں گے جو قعر گمنامی میں زندگی گزار کر راہی ملک عدم ہوئے۔عنایت الرحمٰن کا تعلق اس اعلیٰ خاندان سے ہے جس میں شکیل الرحمٰن جیسی نابغہ زمانہ شخصیت پیدا ہوتی ہے۔شکیل الرحمٰن صاحب نے اپنی خودنوشت ''آشرم'' میں اپنے دو بڑے بھائیوں عنایت الرحمٰن اور جمیل الرحمٰن کے لئے باضابطہ ایک باب (گیارہ) قائم کیا ہے اور اس باب میں عنایت الرحمٰن کی شخصیت اور کارناموں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔شکیل الرحمٰن نے ''آشرم'' میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ بڑے بھائی عنایت الرحمٰن صاحب کی دلفریب اور دلکش شخصیت سے ہم دونوں بھائی (جمیل الرحمٰن بھی) کافی متاثر تھے۔عنایت الرحمٰن نے ہی جمیل الرحمٰن کو شاعری کی ترغیب دی اور ابتدائی دور میں اصلاح بھی کی، لیکن حیرت کا مقام ہے کہ ظفر مجیبی صاحب نے اپنی کتاب ''گلہائے چمپا'' میں جمیل الرحمٰن کا تذکرہ کیا ہے، لیکن عنایت الرحمٰن کا ذکر نہیں کیا۔ اب کچھ اس خاندان کے بارے میں جان لیں، جس کا تذکرہ محمد ولی اللہ قادری صاحب نے بہت کم کیا ہے۔''مہندر شتابدی ابھی نندن گرنتھ'' کے مطابق لالہ روپ دون پرشاد سہائے (کائستھ) کا خاندان موضع ہرپور (بنیاپور ضلع چھپرہ) میں آباد تھا۔ کنج بہاری سہائے اور برج بہاری سہائے ان کے دو بیٹے تھے۔ برج بہاری سہائے سے لیلا دھر پرشاد اور شری کانت پرشاد تولد ہوئے۔ لیلا دھر پرشاد اپنا مذہب تبدیل کر کے مسلمان ہوگئے اور اپنے پیرومرشد کے مشورے سے اپنا نام عبدالرحمٰن رکھ لیا۔ان کے مسلمان ہونے سے قبل ان کے بیٹے بابو تارا پرشاد کی پیدائش ہوچکی تھی۔ بابو تارا پرشاد ہی محمد جان ہوئے اور چھپرہ سے ہجرت کر کے موتیہاری میں سکونت اختیار کی۔ بعد میں سرکاری وکیل بنے اور خان بہادر کے لقب سے نوازے گئے۔ان کی دوسری شادی سیوان کے رئیس راجا اسمٰعیل علی خاں کے خاندان سے تعلق رکھنے والے جناب ہادی خاں کی صاحبزادی امت الفاطمہ سے ہوئی۔ جناب شکیل الرحمٰن انہیں کے بطن سے پیدا ہوئے۔شکیل الرحمٰن صاحب نے غبار کارواں کے تحت اپنے خاندان علی الخصوص خان بہادر محمد جان کے بارے میں تفصیلی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔تفصیل کے لئے ''آج کل'' (اردو) مارچ ۲۰۱۱ء کا شمارہ ملاحظہ کریں۔ لیلا دھر پرشاد کے چھوٹے بھائی شری کانت پرشاد کی بیٹی کی شادی ڈاکٹر راجندر پرشاد (۱۸۸۴-۱۹۶۳ء) کے بڑے بھائی مہندر پرشاد (۱۸۷۶ء-۱۹۳۴ء) سے ۱۸۸۶ء میں ہوئی تھی۔ڈاکٹر راجندر پرشاد کے صاحب زادے شری مرتنجے پرشاد (۱۹۰۶ء-۱۹۸۴ء) نے اپنی آپ بیتی ''پتیا اسمرن'' میں بھی اس رشتے کا تفصیلی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ خان بہادر محمد جان کو ماما کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ یہ دونوں کتابیں میری ذاتی لائبریری میں موجود ہیں۔

(ڈاکٹر) ارشاد احمد، سیوان

یومِ آزادی کے موقع پر
اکادمی میں پرچم کشائی

پٹنہ: حسب روایت یومِ آزادی کے پرمسرت موقع پر بہار اردو اکادمی کے احاطہ میں، سکریٹری بہار اردو اکادمی کے دست مبارک سے پرچم کشائی کی رسم ادا ہوئی۔اس مبارک موقع پر اکادمی کے عملے اور دیگر حضرات نے شرکت کی۔

بچوں کا
زبان وادب

☆	حمد باری تعالیٰ	معاذ اقبال	۱۱۴
☆	بچپن	حیدرؔ بیابانی	۱۱۴
☆	شان ترنگا ہے	مجیر احمد آزاد	۱۱۵
☆	آزاد تھے، آزاد ہیں، آزاد رہیں گے	یاور راشد یاورؔ	۱۱۶
☆	کارٹوگرافی کیا ہے؟	شرف الہدیٰ	۱۱۷
☆	آزادی کا سبق	قاضیہ تضمین	۱۱۸
☆	اردو زبان	اسرائیل علی سفیرؔ مانچوی	۱۱۹
☆	فضول خرچی	پرویز اختر	۱۲۰

معاذ اقبال
Ali, Zohra Begam Waqf State, 151, Patna, Nauzar Katra,
Diwan Mohalla, Patna - 800008

حمد باری تعالیٰ

دربارِ خدا میں کبھی ایسا نہیں دیکھا
اس در کے گدا کو کبھی رسوا نہیں دیکھا

آئی جو مصیبت کی گھڑی مجھ پہ کسی دَم
اس در کے سا کوئی ٹھکانہ نہیں دیکھا

میں راکھ گنہ کر کے بھی لوٹا تو یہیں پر
آیا تو کبھی خود کو اکیلا نہیں دیکھا

ہمت کو مری باندھ کے رکھے ہوئے ہے وہ
مضبوط کوئی ایسا سہارا نہیں دیکھا

مانگا بھی اِسی دَر سے ہے، پایا بھی یہیں سے
میں نے کوئی تجھ سا مرے مولا نہیں دیکھا

نعمت ہے تو اتنی کہ نہ دامن میں سمائے
رحمت کے سمندر کا کنارہ نہیں دیکھا

اُمید ہے تجھ سے مرے مولا کہ یہاں سے
مایوس کسی کو کبھی جاتا نہیں دیکھا

❁❁❁

حیدر بیابانی

بچپن

ممتا ہے ماں کی ، باپ کی چاہت ہے دوستو
بچپن خدا کی دی ہوئی نعمت ہے دوستو

ابو کما رہے ہیں ، ہم سب ہی کھا رہے ہیں
فکر معاش سے ہمیں فرصت ہے دوستو

ٹافی ملے ، مٹھائی ملے ، رَس بھری ملے
بھیا کی ہم پہ خوب عنایت ہے دوستو

بش شرٹ ہے دُھلا ہوا، نیکر بھی صاف صاف
باجی کے ہاتھ کی یہ کرامت ہے دوستو

ہر ایک خطا معاف ہو ، بچے ہیں جان کر
اپنوں کی یہ ادائے محبت ہے دوستو

(ماخوذ از ماھنامہ "کھلونا" نئی دھلی، فروری ۱۹۷۹ء، ص۵)

مجیر احمد آزاد

Moh. Faizullah Khan, Hamid Colony, Darbhanga - 846004 (Mob. 9430898766)

.....شان ترنگا ہے

ٹن ٹن.....ٹن ٹن.....ٹن ٹن.....چھٹی کی گھنٹی بجی۔ پرائمری اسکول رتن پورا کے بچے اپنے گھروں کی جانب روانہ ہوئے۔ فرید الدین بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسکول احاطے سے باہر آیا۔ کچھ دور منٹی کمار اس کے ساتھ چلا، پھر وہ ایک گلی میں مڑ گیا۔ اب فرید الدین کو مین روڈ کے اُس پار جانا تھا اور اسی طرف سے گھر تک پہنچنے میں تقریباً دس منٹ پیدل چلنا ہوتا تھا۔ اس کے کندھے پہ اسکول بیگ اور ہاتھ میں پانی کی بوتل تھی، جسے وہ جھولاتا ہوا چل رہا تھا۔

مین روڈ پہ آکر وہ رک گیا۔ ایک جلوس سڑک سے گزر رہا تھا۔ بڑے بڑے ٹرک پر پوسٹر لگائے، رنگ برنگے جھنڈے سجائے لوگوں کا ہجوم جلوس کی شکل میں چلا جا رہا تھا۔ کئی لوگوں نے چھوٹے بڑے ترنگے جھنڈے تھام رکھے تھے اور نعرے بھی لگا رہے تھے۔

وہ سڑک کے کنارے کھڑا جلوس کے گزرنے کا انتظار کرتا رہا۔ جب جلوس آگے نکل گیا تو اس نے پہلے دائیں طرف دیکھا۔ سڑک خالی تھی، پھر بائیں دیکھتے ہوئے سڑک پار کر گیا۔ اسے اسکول میں سڑک پار کرنے کا یہی طریقہ سکھایا گیا تھا۔ وہ اب سڑک کے کنارے چلنے لگا۔ اچانک اس کی نگاہ سڑک پر گرے ہوئے قومی جھنڈے پر پڑی۔ اس نے دوڑ کر اسے اٹھایا۔ جھنڈا گرد سے اٹا تھا۔ اس نے ترنگے کو اپنے کندھے پر رکھا۔ دو چار قدم اور بڑھا تھا کہ ایک اور ترنگا جھنڈا وہیں گرا تھا، اسے اُٹھا ہی رہا تھا کہ ہارن بجاتی ایک کار سست رفتار سے گزری۔ اس نے کنارے ہو کر اسے جانے دیا۔ کچھ دور آگے چل کر وہ ڈھلان سے نیچے اتر گیا اپنے گھر کی طرف۔

گھر جا کر اس نے دونوں ترنگے جھنڈوں کو سلیقے سے تہہ کیا اور سنبھال کر اپنے بستے میں رکھ لیا۔ اس نے سوچا کل ایک فلیگ منٹی کو دے دوں گا اور ایک میں ڈنڈی لگا کر ہیڈ سر کی ٹیبل پر سجا دوں گا۔

اسمبلی کی شروعات ہوئی۔ آج ہیڈ سر اسمبلی میں موجود تھے۔ سبھی طلبہ جانتے تھے کہ جب کچھ خاص اعلان کرنا ہوتا ہے تو وہ اسمبلی میں پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ بچوں نے روز کی طرح جھوم جھوم کر ترانہ گایا۔ آئین کا تعارف اور اقوال زریں پیش کیا گیا۔ اس کے بعد اسکول کے ہیڈ ماسٹر کرشن دیو سر نے مائک سنبھالا:

''پیارے بچو! آج میں ایک آنکھوں دیکھا سبق آموز واقعہ سنانا چاہتا ہوں، لیکن اس سے پہلے تیسری کلاس کے اسٹوڈنٹ فرید الدین کو آواز دے رہا ہوں وہ سامنے آجائے۔''

فرید الدین اپنا نام سن کر پہلے تو ڈر گیا، پھر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ہیڈ سر کے روبرو سر جھکائے کھڑا ہو گیا۔

''تم کل اسکول کی چھٹی کے بعد سڑک پر کیا کر رہے تھے۔''

''سر! میں تو سیدھا گھر چلا گیا تھا۔''

''نہیں تم سڑک سے کچھ اٹھا رہے تھے۔''

''جی سر! دو ترنگا جھنڈا گرا ہوا تھا، اسی کو اٹھایا تھا۔'' اس نے ہچکچاتے ہوئے کچھ حیرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''پھر ان دونوں ترنگے جھنڈوں کا تم نے کیا کیا؟''

''سر! میں نے سوچا ہے کہ ایک میں اپنے دوست منٹی کمار کو دوں گا اور دوسرا سر جی آپ کے آفس میں ٹیبل پر لگا دوں گا۔''

ہیڈ سر مسکرائے پھر مخاطب ہوئے:

میں کل اسکول کی چھٹی کے بعد اپنی کار سے شہر جا رہا تھا۔ میں تھوڑی دیر سے نکلا تھا کہ سڑک پہ جلوس نکلنے کی خبر تھی مجھے۔ میں ابھی مین روڈ سے گزر ہی رہا تھا کہ پیپل کے درخت کے پاس ایک لڑکے کو سڑک پر سے کچھ اٹھاتے ہوئے دیکھا۔ میں نے ہارن بجایا اور گاڑی آہستہ کر دی تا کہ وہ کنارے ہو جائے۔ نزدیک آنے پر مجھے حیرت کی

یاور راشد یاورؔ
Kazmi Begam Colony, Sales Tax Office, Patna - 800008 (Mob. 7903519335)

آزاد تھے، آزاد ھیں، آزاد رھیں گے

غیروں کے کرم پہ نہ پلے ہیں ، نہ پلیں گے ہم لوگ کسی سے نہ دبے ہیں ، نہ دبیں گے
آزاد تھے ، آزاد ھیں ، آزاد رھیں گے

کتنے ہی شہیدوں نے لہو اپنا دیا ہے امرت کی طرح جامِ شہادت کو پیا ہے
آزادی ملی کب تھی؟ یہ تو ہم نے لیا ہے اب ہم نہ کسی ظالم و جابر سے ڈریں گے
آزاد تھے ، آزاد ھیں ، آزاد رھیں گے

اس دھرتی ، اس امبر کی تو ہے شان ''ترنگا'' بھارت کے ہر اک شخص کی ہے جان ''ترنگا''
کافی ہے یہی ، اپنی ہے پہچان ''ترنگا'' اس پر ہی فدا اپنا دل و جان کریں گے
آزاد تھے ، آزاد ھیں ، آزاد رھیں گے

ہے ہند کا ہر ذرہ ہمیں جان سے پیارا بانٹو نہ اسے مسلم و ہندو میں خدارا
ہم سب ہیں اسی سے یہی سب کچھ ہے ہمارا سو بار غلامی ہو تو سو بار لڑیں گے
آزاد تھے ، آزاد ھیں ، آزاد رھیں گے

یاورؔ یہ تری نظم بہت خوب ہے پیارے ہر ذرہ وطن کا تجھے محبوب ہے پیارے
خوش رنگ بداماں ترا اسلوب ہے پیارے آزاد کا یہ نعرہ ہر اک دل پہ لکھیں گے
آزاد تھے ، آزاد ھیں ، آزاد رھیں گے

❁❁❁

انتہا نہ رہی کہ وہ تو اپنا فرید تھا۔ میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔''

سبھی بچے غور سے سن رہے تھے۔

''پیارے بچو! جو ترنگا فرید الدین کو سڑک پہ ملا ہے، اسے جلوس میں جا رہے لوگوں نے پھینکا ہے۔ کیا یہ ٹھیک تھا؟''

''نو سر'' بچوں کی آواز بلند ہوئی۔

ہمیں اپنے نیشنل فلیگ کی عزت کرنی چاہیئے نا!

''یس سر!.....''

کرشن دیو سر کچھ دیر کے لئے خاموش ہوئے۔ اسمبلی میں کھڑے طلبہ بھی خاموش، سر کو ایک ٹک دیکھتے رہے۔ طویل خاموشی کے بعد ہیڈ سر پھر مخاطب ہوئے:

''پیارے بچو! ہمارا نیشنل فلیگ ترنگا ہماری شان ہے، آن بان ہے، ہماری جان ہے۔ اسے ہم کبھی بھی جھکنے نہیں دیں گے۔ اس کا سمان کریں گے، جیسا کہ فرید الدین کیا۔ اس کے لئے زوردار تالیاں۔''

تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے پورا کیمپس گونج اٹھا۔ ہر کسی کی نگاہ میں آج فرید الدین ہی تھا جس نے اپنی سوجھ بوجھ سے اپنے پیارے وطن کے ترنگے کا مان رکھا تھا۔ ❁❁

شرف الہدیٰ
Sultanganj, Patna - 800006 (Mob. 8227937574)

کارٹوگرافی کیا ہے؟

بچو! آج میں آپ لوگوں کو ایسے فن اور سائنس سے واقف کرانا چاہوں گا جس سے آپ لوگوں کی معلومات اور علم میں یقیناً اضافہ ہوگا۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ سبھی بچوں کو ڈرائنگ اور تصویر بنانے میں بڑی دلچسپی رہتی ہے۔ آپ سبھی بچے بڑے شوق اور پوری لگن اور توجہ کے ساتھ کورے کاغذ پہ تصویریں بناتے، لکیریں کھینچتے اور پھر اُن خاکوں یا تصویروں میں رنگ بھرتے ہیں جس سے ایک خوبصورت اور خوشنما تصویر بن کر سامنے آتی ہے۔ امتحانات میں بھی اکثر بچوں سے تصویریں بنانے کو کہا جاتا ہے، بچے خوشی خوشی تصویریں (Picture) بناتے ہیں اور انہیں اساتذہ مارکس یا گریڈ دیتے ہیں۔

آیئے! ہم یہ جانیں کہ ''کارٹوگرافی'' (Cartography) کیا ہے؟ کارٹوگرافی نقشہ بنانے کے ایک فن اور سائنس کا نام ہے۔ اس کی مثالیں قدیم زمانے میں بھی ملتی ہیں، یعنی:

"Cartography' is the art and science of map-making and its origins in the ancient times. Maps are an important means of communicating information concerning angles, distances, areas and directions."

یہاں جو باتیں انگریزی میں کہی گئی ہیں، ان کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح خیالات کے اظہار کے لئے زبان کا سہارا ضروری ہے، اسی طرح ہم اطلاعات، دوریاں، علاقے، سمت اور صحیح لوکیشن یا نشانات جاننے اور پہچاننے کے لئے نقشوں کو بناتے، سمجھتے اور ان سے مدد لیتے ہیں، اتنا ہی نہیں بلکہ یہ نقشے اور بھی کئی مقاصد کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں، مثلاً سمندری چیزوں کو دیکھنے اور سمجھنے کے لئے نقشوں کی مدد لی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ علاقائی منصوبے اور اس کی ترقی، نیز سیر وسیاحت کے فروغ میں بھی کارٹوگرافی کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ نقشے بالکل صاف، واضح اور پڑھے جانے کے لائق ہوں۔ رنگوں کا استعمال یہاں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ''کارٹوگرافک'' (Cartographic) ڈیزائن کا موجودہ طریقہ اور ماڈل جدید نقشوں کو اعلیٰ ترین شفافیت اور خوبصورتی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

اپنے اپنے پیشے (کام) کے اعتبار سے نقشہ بنانے کے لئے کئی ماہر لوگ ہوتے ہیں جو الگ الگ نام سے جانے جاتے ہیں جیسے Engineer, Draughtsman, Architeture اور Cartographer وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کارٹوگرافی ہی کے فن کار ہیں۔ ❁❁

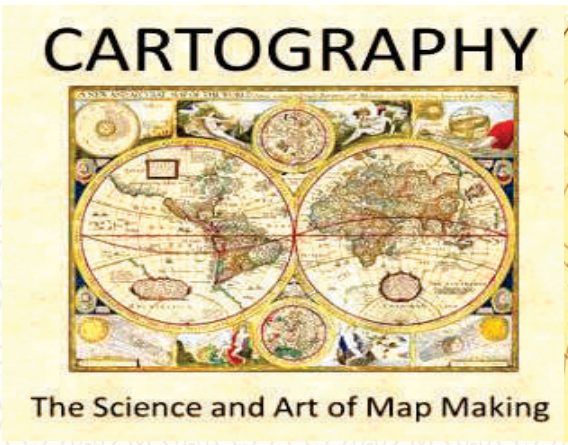

قاضیہ تضمین

Garden Reach, kolkata, West Bengal - 700024 (7031188598)

آزادی کا سبق

رونق اسکول سے نکلا تو گہری سوچ میں غرق تھا۔ دو دن بعد یوم آزادی تھا اس دن اسکول میں آزادی کے تعلق سے ایک ڈرامہ پیش کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس ڈرامے میں رونق کو گاندھی جی کا کردار ادا کرنے کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ وہ آزادی اور گاندھی جی کے بارے میں ہی سوچتا ہوا گھر کی طرف جا رہا تھا۔ ڈرامے کے ڈائرکٹر نے گاندھی جی کے کردار کی اچھی خاصی جانکاری دی تھی پھر بھی اسے ان کی عظیم شخصیت کو پوری طرح اپنے اندر جذب کرنے میں مشکل ہو رہی تھی، اچانک اس کی نگاہ راستے میں لگے ایک بورڈ پر گئی جس پر جلی حرفوں میں لکھا تھا:

''عہد ماضی کی سیر کریں۔''

بورڈ کے نیچے ایک بوڑھا شخص سیمنٹ سے بنے ہوئے چبوترے پر بیٹھا تھا جس کو گھیرے ہوئے چند لوگ کھڑے تھے رونق نے حیرت سے اسے دیکھا اور وہ بھی اس کے قریب ٹھہر گیا۔ بوڑھے شخص کی نظر اس پر پڑی تو اس نے شفقت سے پوچھا:

''کیا بات ہے بچے!''

''کیا آپ ماضی کے دور کی سیر کرا سکتے ہیں؟''

اس نے تجسس سے پوچھا تو بوڑھے نے مسکراتے ہوئے کہا:

''ہاں بیٹے! تم ماضی کے کون سے عہد کی سیر کرنا چاہتے ہو؟''

''میں اپنے وطن کی آزادی کی جدوجہد اور اس کے اہم کردار گاندھی جی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے بیٹھ جاؤ۔''

رونق بیٹھ گیا تو اس نے ایک کتاب نکالی جس پر ''آزادی کی جدوجہد اور مہاتما گاندھی'' تحریر تھا۔ اس نے اس پر ہاتھ رکھنے کو کہا۔

رونق نے ہاتھ رکھا ہی تھا کہ سارے منظر بدل گئے۔ اب وہ ایک ایسی سڑک پر کھڑا تھا جہاں پرانے تاریخی لباسوں میں لوگ موجود تھے۔ پرانی گاڑیاں، گھوڑا گاڑیاں دوڑ رہی تھیں دیواروں پر ''انقلاب زندہ باد'' کے نعرے لکھے تھے، سامنے سے ایک بزرگ سفید دھوتی پہنے ہاتھ میں لاٹھی تھامے آ رہے تھے رونق حیرت سے بولا:

''گاندھی جی! آپ.....!''

''ہاں بیٹا.....! آؤ تمہیں آزادی کی جدوجہد اور قربانیاں دکھاتے ہیں۔''

گاندھی جی نے اس کا ہاتھ پکڑا تو یکا یک وہ ایک میدان میں پہنچ گیا جہاں بہت سے لوگ بوڑھے، جوان، عورتیں اور بچے سبھی پرسکون بیٹھے تھے۔ اچانک چاروں طرف سے گولیاں چلنے لگیں لوگ چیختے ہوئے بھاگنے لگے، لیکن سارے راستے بند تھے سبھی لوگ گولیوں کے شکار ہو گئے۔

رونق کانپ گیا: ''یہ کیا ہو رہا ہے؟''

گاندھی جی نے غمگین لہجے میں کہا:

''یہ جلیاں والا باغ ہے، جہاں انگریزوں نے نہتے ہندوستانیوں پر گولیاں چلائی تھیں اور سینکڑوں لوگ ملک کی آزادی پر قربان ہو گئے تھے۔''

کچھ ہی لمحوں کے بعد وہ سمندر کے کنارے تھا

بہت سے لوگ لمبی قطار میں چل رہے تھے ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں اور آنکھوں میں عزم تھا۔ گاندھی جی بولے:

''یہ ڈانڈی مارچ ہے۔ ہم نے انگریزوں کے ذریعہ نمک پر ٹیکس لگانے کے خلاف پرزور احتجاج کیا تھا۔ یہ ہمارا حق تھا۔ نمک جیسی عام، لیکن ضروری چیز بھی، آزادی کی لڑائی کی علامت بنی تھی۔''

رونق نے زمین سے نمک اٹھایا اور زبان پر رکھا وہ نمک اسے آنسوؤں جیسا لگا، کڑوا مگر سچا۔

اس کے بعد وہ ایک گاؤں کے اسکول کے سامنے کھڑا تھا۔

چندنو جوان لڑکیاں بینر لیے کھڑی تھیں جن پر لکھا تھا:

''ہمیں تعلیم چاہیے!''

رونق نے تعجب سے پوچھا:

''یہ بھی آزادی کی لڑائی تھی؟''

گاندھی جی بولے: ''ہاں بیٹا! یہ لڑائی صرف انگریزوں سے نہیں، جہالت اور ظلم سے بھی تھی۔ ان لڑکیوں نے اپنے حق کے لیے آواز اٹھائی تھی اور یہی اصل آزادی تھی۔''

پھر ایک منظر میں اس نے دیکھا کہ ایک اونچے ٹاور پر کچھ لوگ قومی پرچم لہرا رہے تھے...... ترنگا!

رونق نے حیرت سے پوچھا:

''ہمارے جھنڈے کے تین رنگوں کا کیا مطلب ہے؟''

گاندھی جی نے محبت سے سمجھایا:

''کیسر رنگ بہادری اور قربانی کی علامت ہے۔ سفید رنگ امن اور سچائی کو ظاہر کرتا ہے جب کہ سبز رنگ زمین، امید اور خوشحالی کی نشانی ہے اور درمیان میں نیلا چکر دیکھ رہے ہو، وہ اشوک چکر ہے جو ہمیں مسلسل کام کرتے رہنے اور سچ کی راہ پر چلنے کا سبق دیتا ہے۔''

رونق کے دل میں ایک اجلی سی روشنی اتر گئی۔

اب وہ ایک جیل کے سامنے کھڑا تھا۔ سلاخوں کے پیچھے ایک نوجوان مسکرا رہا تھا۔ بھگت سنگھ!...... اس نے پہچان لیا:

''ہم نے اپنی جان کی قربانی دی تاکہ تم سب آزاد رہ سکو۔ آزادی سے اپنے ملک کی ترقی اور بھلائی کے لیے کام کرسکو۔ یاد رکھو! آزادی صرف جھنڈا لہرانے کا نام نہیں، ذمہ داری کے احساس کا بھی نام ہے۔'' بھگت سنگھ نے نرمی اور محبت سے کہا تو رونق کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

پہلی بار وہ آزادی کا اصلی مطلب جان گیا تھا۔

اچانک روشنی کا ایک تیز جھماکا ہوا اور اس کی آنکھوں سے سارے مناظر غائب ہوگئے اس نے خود کو اسی بوڑھے شخص کے پاس بیٹھے ہوئے پایا۔ بوڑھے نے سنجیدگی سے پوچھا:

''آزادی کی جدوجہد کی تاریخ دیکھ لی؟''

''ہاں! میں نے دیکھ لی۔''

اس نے قدرے آبدیدہ ہوکر کہا:

''تاریخ صرف دیکھنے یا پڑھنے کی چیز نہیں اس سے سبق حاصل کیا جاتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم بھی اس سے اپنی زندگی میں تبدیلی پیدا کروگے۔''

رونق وہاں سے اٹھ کر گھر کی طرف چلا تو سچ مچ وہ اندر سے بدل چکا تھا اب اس نے گاندھی جی کا کردار صرف ڈرامے میں نہیں بلکہ عملی زندگی میں بھی نبھانے کا پکا ارادہ کرلیا تھا۔ ❁❁❁

کتنی شیریں زبان ہے اردو / ہندو مسلم کی شان ہے اردو
طے کرے گی بلندیوں کا سفر / ایسی رکھتی اُڑان ہے اردو
رونق بزم جو بھی ہوتا ہے / ایسے لیڈر کی جان ہے اردو
یہ ہے شاعر ادیب کی چاہت / اک مفکر کا گیان ہے اردو
نثر اردو لکھو یا پیاری نظم / صاف ستھرا بیان ہے اردو
اس کو حاسد گرا نہ پائیں گے / ایسا پختہ مکان ہے اردو
اس میں الفاظ ہر زبان کے ہیں / سارا ہندوستان ہے اردو

جس کو ہم نے سفیرؔ سینچا ہے
گھر میں وہ گلستان ہے اردو

❁❁❁

اسرائیل علی سفیرؔ مانچوی
Vill. Manch, P.o. Kamhariya,
Tehsil, Maudaha
Dist. Hamirpur - 210507
(Mob. 9793522959)

اردو
زبان

پرویز اختر
Paththar ki Masjid, Patna

فضول خرچی

احمد نویں کلاس کا طالب علم تھا۔ وہ پڑھنے لکھنے میں تیز تھا، لیکن ایک عادت اُس میں بہت خراب تھی۔ وہ جب بھی اسکول سے لوٹتا تو کچھ نہ کچھ فاسٹ فوڈ جیسے چاؤمن، برگر، بریانی، مومو، وغیرہ خرید کر لے آتا تھا اور اسی سے پیٹ بھر لیتا تھا اور گھر کا بنا کھانا..... وہ بس ویسے ہی پڑا رہ جاتا تھا۔

چوں کہ وہ گھر کا اکلوتا بچہ تھا اس لئے ماں باپ لاڈ پیار اُس سے بہت کرتے تھے اور روزانہ اُسے جیب خرچ ملتے تھے۔ وہ اسی رقم سے بازاری کھانا یا فاسٹ فوڈ خرید لاتا تھا اور مزے لے لے کر کھاتا تھا۔ احمد کو سبزیاں بالکل پسند نہیں تھیں۔ وہ گھر میں امی سے گوشت بریانی، پلاؤ، انڈے وغیرہ کی فرمائش کرتا رہتا تھا۔

ایک روز احمد اسکول سے لوٹ رہا تھا تو اس نے ایک دکان پر بہت خوبصورت بلا (بیٹ) دیکھا جس پر اُس کے پسندیدہ کرکیٹر کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے گھر آیا اور اپنا پرس کھولا .....مگر یہ کیا..... اس میں تو صرف پچاس روپے ہی پڑے تھے، جب کہ بلے کی قیمت ڈیڑھ سو روپے تھی۔ وہ خاموشی سے آکر بستر پر لیٹ گیا۔

جب امی نے احمد کو خاموشی سے اداس لیٹے دیکھا تو پوچھا:

''بیٹا کیا ہوا طبیعت خراب ہے کیا۔''

احمد نے اپنی امی کو ساری بات بتادی۔ امی نے احمد کو سمجھاتے ہوئے کہا:

''دیکھو بیٹا! میں نے تمہیں ہمیشہ فضول خرچی کرنے اور باہر کی چیزوں کو کھانے سے منع کیا۔ دیکھو اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ اگر تم کفایت شعاری سے کام لیتے پیسہ بچاتے تو آج تمہارے پاس اچھی خاصی رقم ہوتی اور تم اپنی پسندیدہ چیز خرید سکتے تھے، لیکن تم ہمیشہ جیب خرچ کی رقم کو باہر کے نقصان دہ کھانوں پر برباد کر دیتے ہو اور گھر کا صحت مند کھانا چھوڑ دیتے ہو، جب کہ گھر کا کھانا صاف ستھرا اور طاقت سے بھرپور ہوتا ہے..... تمہارے ابو بھی سمجھاتے ہیں، میں نے بھی لاکھ بار سمجھایا کہ شیطان کے بھائی مت بننا۔ شیطان تو آدمی کا کھلا دشمن ہے، وہ ہمیشہ برا راستہ دکھاتا ہے۔ اللہ نے فضول خرچی کرنے والے کو شیطان کا بھائی کہا ہے۔ ہمارے پیارے نبی نے ہمیں سکھایا ہے کہ انسان کی سمجھداری یہ ہے کہ وہ کفایت شعار ہو۔ بچت کیا ہوا پیسہ اور رکھی ہوئی چیز وقت پر کام آتی ہے۔ یاد ہے! ایک بار جوتے کا فیتہ چوہے نے کتر دیا تھا تو وقت پر وہی فیتہ کام آیا تھا، جس کو پرانا کہہ کے تم پھینکنے جا رہے تھے۔ تمہاری عادت سی ہے کہ جیب خرچ ملتے دیر نہیں اور خرچ ہوتے دیر نہیں۔ ذرا سو چو گلک بھرا رہتا تو تم ایک بلا کیا، آج دو بلا خرید لاتے اور اپنے کسی غریب دوست کو گفٹ بھی کرتے، مگر.....''

امی کی باتیں سن کر احمد کو بہت افسوس ہوا اور اس نے اپنی امی سے وعدہ کیا کہ آئندہ سے باہر کی چیز نہیں کھاؤں گا اور صرف گھر ہی کا کھانا کھاؤں گا۔ اس سے میرا جیب خرچ جمع ہوتا رہے گا اور بڑی رقم میرے پاس بچت ہوگی۔

ماں نے خوش ہو کر احمد کو ڈیڑھ سو روپے دیا اور کہا:

''جاؤ بازار سے اپنا پسندیدہ بلا (بیٹ) لے آؤ۔''

احمد بہت خوش ہوا اور جلدی سے بیٹ خریدنے بازار چلا گیا۔ ❁❁

بڑوں اور بچوں کو فضول خرچی سے بچنے کا پیغام دیتے ہوئے قومی بچت آرگنائزیشن کے اشتہار مطبوعہ، جنوری ۱۹۶۲ء سے لیا گیا ایک تراشہ

ارمانؔ نجمی

ارمانؔ نجمی کا اصل نام شمس الحق اور آبائی وطن شیخ پورہ، بہار شریف نالندہ تھا، لیکن عظیم آباد اُن کا وطن ثانی بنا اور اپنے قلمی نام و تخلص ارمانؔ نجمی سے ہی وہ ادبی و شعری دنیا میں جانے گئے۔ اُن کے پردادا مولوی لطافت حسین فارسی کے صاحب دیوان شاعر اور دادا ڈاکٹر جعفر حسین میڈیسین ڈاکٹر تھے جو ۱۹۱۴ء میں پٹنہ آ گئے تھے۔ ارمانؔ نجمی کی تاریخ ولادت ۹ راگست ۱۹۴۰ء اور اُن کے والد کا نام ڈاکٹر نجم الحسن ہے۔ ۱۹۵۵ء میں میٹرک کے بعد، دربھنگہ سے انٹر، ہزاری باغ سے بی ایس سی اور پٹنہ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس اور ایم ایس کی ڈگری لے کر ارمانؔ نجمی محکمہ صحت کی ملازمت میں آئے اور انہیں سعودی عرب کے ہسپتال میں بھی کام کرنے کے مواقع ملے۔ پیشہ کے اعتبار سے وہ اگر چہ ڈاکٹر تھے، لیکن ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت ان کے دادا اور خاندانی بزرگوں کی نگرانی میں ہوئی تھی اور انہیں عظیم آباد کی ادبی و شعری فضا ملی تھی، اسی کے زیر اثر اسکولی تعلیم کے دور سے ہی وہ بیت بازی میں حصہ لینے لگے اور شعر موزوں کرنے لگے تھے۔ ان کی پہلی غزل ''جمالستان'' دہلی میں ۱۹۵۷ء میں چھپی تھی۔ ارمانؔ نجمی کا پہلا مجموعہ ''مردہ خوشیوں کی تلاش'' (۱۹۸۴ء) ہے۔ اس کے علاوہ اُن کے مجموعہ غزل ''راستے کی بات''، مجموعہ نظم ''افتادگی کے بعد'' اور مجموعہ سخن ''شہر افسوس'' کی بھی اشاعت ہو چکی ہے اور ''بیاض شب و روز'' کے نام سے ۲۰۰۰ء میں ان کی ایک نثری کتاب بھی چھپ چکی ہے۔ انہیں ادبی صحافت کا بھی شغف تھا اور انہوں نے ''مباحثہ'' کی ادارتی اعانت بھی کی تھی۔ ارمانؔ نجمی کی وفات جمعرات ۳۰ جولائی ۲۰۲۰ء کی صبح پٹنہ میں ہوئی اور شاہ گنج قبرستان پٹنہ میں مدفون ہوئے۔

اشعارِ ارمانؔ

ماحول سے کس طرح کوئی آنکھ ملاتا
ہر شخص گئے وقت کے ملبے میں دبا تھا

عکس حیراں تھے آئینوں میں
ہائے یہ شخص کدھر سے نکلا

گم شدہ کی بازیابی ایسی مشکل تو نہیں
دُکھ تو اس کا ہے کہ احساسِ زیاں گم ہو گیا

کوئی اسرار سخن سمجھے ، یہ ارماں ہی رہا
ناشناسوں میں مرا حسن بیاں گم ہو گیا

وہ خوشبو جو ہوا کی ہم سفر ہے
اسے بانہوں میں بھرنا چاہتا ہوں

مرا دشمن بھی جس کو یاد رکھے
میں ایسی موت مرنا چاہتا ہوں

رگ و پے میں اذیت کی گھٹن محسوس کرتا ہوں
بہت بدلا ہوا رنگ چمن محسوس کرتا ہوں

اک کانپتی سسکتی صدا جسم و جاں میں ہے
یہ اور کون میرے سوا جسم و جاں میں ہے

سمجھنے والے سمجھ لیں گے خود بخود ارماںؔ
غزل کے پردے میں اظہار حال کرتا رہا